سہ ماہی

المنتہیٰ

جلد 6 | 2022ء | شمارہ 21،20

تحریکِ ختمِ نبوت 1953ء

بموقع 59واں سالانہ ... روحانی اجتماع دربار عالیہ مرشد آباد شریف پشاور

ادارہ المنتہیٰ پاکستان

مدیرِ اعلیٰ: خواجہ غلام دستگیر فاروقی

نقش اویس

[illegible]

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب : تحریک ختم نبوت **1953ء**

تحقیق وترتیب : محمد ثاقب رضا قادری (ایڈووکیٹ) محمد احمد ترازی (کراچی)

مدیر اعلیٰ : خواجہ غلام دستگیر فاروقی

کمپوزنگ : محمد فضیل قادری (+92307-8415818)

صفحات : 292

ناشر : ادارہ المنتہیٰ پاکستان

ایڈیشن : جولائی تا دسمبر 2022ء جلد ششم شمارہ 21،20

ملنے کے پتے:

- ٭ جامعہ رحمت قائداعظم ٹاؤن صادق چوک ٹاؤن شپ لاہور (0302-3911531)
- ٭ آستانہ چشتیہ خیریہ جلال پور درس (چک امرو روڈ) شکر گڑھ (0303-8517218)
- ٭ خانقاہ نقشبندیہ مجددیہ خیریہ G-7/2 اسلام آباد (0347-1551210)
- ٭ دربار عالیہ مرشد آباد شریف کوہاٹ روڈ پشاور شہر (0300-9843686)

انتباہ!

اس نمبر سے حوالہ دیے بغیر کوئی شخص کسی مضمون یا پیراگراف کو نقل کرنے کی جسارت نہ کرے۔ بصورت دیگر ادارہ کو قانونی چارہ جوئی کا حق ہے۔

فہرست

تحریک ختم نبوت 1953ء

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	حرف آغاز	11
2	تحریک تحفظ ختم نبوت 1953ء	13
3	ختم نبوت کا انکار اور خلاف اسلام نظریات کا پرچار	18
4	اسلامی اصطلاحات کا بے جا استعمال	18
5	وزارت خارجہ/سفارت خانوں و دیگر کلیدی عہدوں پر مرزائیوں کا تقرر	18
6	ربوہ کا متوازی نظام حکومت	19
7	مرزائیت کی سرعام تبلیغ/خلاف اسلام سرگرمیاں	19
8	بلوچستان کو مرزائی اسٹیٹ بنانے کی سازش	19
9	جہانگیر پارک میں مرزائیوں کا جلسہ	20
10	آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن	20
11	آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور	22
12	مسلم لیگ کی قراردادیں	24
13	وزیر اعلیٰ پنجاب میاں ممتاز دولتانہ کی تقریر	25
14	ارباب اقتدار سے علماء کی ملاقاتیں	29
15	آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن	31
16	راست اقدام بارے غور و خوض	32
17	ارباب اقتدار سے مزید ملاقاتیں	34
18	علامہ عبدالحامد بدایونی	36
19	علامہ ابوالحسنات سید احمد قادری	38
20	مولانا عبدالستار نیازی کا تاریخی انٹرویو	40

21	مولانا مودودی کی معذرت	44
22	مولانا نیازی مسجد وزیر خان میں	44
23	قادیانی فوج کی وردی میں	46
24	تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کی کہانی مولانا سید خلیل احمد قادری کی زبانی	49
25	مرزائیوں کی اشتعال انگیزی	50
26	مجلس عمل کی تشکیل	51
27	خواجہ ناظم الدین سے ملاقات	52
28	راست اقدام کا فیصلہ اور قائدین کی گرفتاری	53
29	مولانا مودودی سے ملاقات	54
30	مولانا احمد علی لاہوری سے ملاقات	54
31	مفتی محمد حسن سے ملاقات	55
32	مولانا غلام دین سے ملاقات	55
33	مسجد وزیر خان میں رضاکاروں کا اجتماع	56
34	فردوس شاہ ڈی ایس پی کا قتل	57
35	حکومت کی اشتعال انگیز کارروائی	57
36	رضاکاروں کی شہادتیں	59
37	مولانا عبد الستار خان نیازی پر ایک بہتان کی تردید	60
38	مولانا سید خلیل احمد قادری کی رضاکارانہ گرفتاری	63
39	مارشل لاء حکام کی تفتیش	64
40	"پورا ملک قادیانیوں کا ہے"	65
41	قید و بند کی صعوبتیں	67
42	خواب میں شیخ سید عبد القادر جیلانی کی زیارت	72
43	عدالت میں پیشی	73
44	جیل میں احباب سے ملاقات	74

45	جیل میں شارح بخاری مفتی سید محمود احمد رضوی سے ملاقات	75
46	مقدمہ قتل کی سماعت اور بریت	76
47	دوبارہ گرفتاری	77
48	سزائے موت کا فیصلہ	78
49	سزائے موت کے فیصلہ میں تبدیلی	79
50	مولانا عبدالستار خان نیازی اور مولانا مودودی سے ملاقاتیں	80
51	مولانا مودودی سے مباحثہ	81
52	قائدین تحریک کی سکھر جیل سے لاہور سنٹرل جیل منتقلی	82
53	جیل میں مذہبی معمولات	83
54	منیر انکوائری کمیشن کے روبرو مولانا مودودی کی قلابازی	84
55	مولانا ابوالحسنات قادری کے تاریخی جملے	85
56	جیل سے رہائی	86
57	جسٹس منیر انکوائری کمیشن تحقیقاتی رپورٹ برائے فسادات پنجاب 1953ء	88

تحریک ختم نبوت 1953ء میں علماء و مشائخ اہل سنت کا کردار

58	تحریک کے اسباب و محرکات	95
59	کراچی میں قادیانیوں کا احتجاجی جلسہ اور ظفر اللہ قادیانی کی شر انگیز تقریر	104
60	شرکاء آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس کراچی کا انعقاد و تحریک کا نقطہ آغاز	105
61	شرکاء کانفرنس کے حکومت سے متفقہ مطالبات	106
62	علماء بورڈ کا قیام	106
63	آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی کی تیاری	107
64	آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن اور مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کا قیام	108
65	منظم جدوجہد کے لیے مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کا قیام	109
66	کنونشن میں پیش کردہ قراردادیں	110
67	تحریک ختم نبوت اور علماء اہل سنت و جماعت	114

68	مساجد میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ اور حکومت کی بوکھلاہٹ	121
69	مشائخ اہل سنت کی حمایت تحریک کی کامیابی کا نیا موڑ	123
70	مشائخ اہل سنت کی تائید اور حمایت	124
71	شہداء تحفظ ختم نبوت ملتان	124
72	ہم یہاں ظفر اللہ کے بندے سے ملاقات کرنے نہیں آئے تھے	126
73	مسئلہ ختم نبوت پر اراکین مسلم لیگ کا موقف	132
74	تحریک ختم نبوت کا فیصلہ کن مرحلہ	138
75	آل پاکستان پارٹیز کا انعقاد اور آخری معرکے کی تیاری	139
76	ابوالحسنات سید احمد قادری تحریک کے پہلے قائد مقرر	140
77	مطالبات کی منظوری کے لیے حکومت کو ایک ماہ کا نوٹس	143
78	ہزاروں کروڑوں پاکستان نبی پاک ﷺ کی ناموس پر قربان	145
79	فدایانِ ختم نبوت رضاکاروں کی بھرتی	146
80	علماء اپنا اٹھایا ہوا قدم واپس ہرگز نہیں لیں گے	147
81	علامہ عبدالحامد بدایونی کی مومنانہ بصیرت	148
82	تحریک ختم نبوت کے مرکزی رہنماؤں کی گرفتاری	154
83	مولانا سید خلیل احمد قادری تحریک کے کنوینر نامزد	156
84	قائد تحریک ختم نبوت مولانا ابوالحسنات کا صبر و استقامت	157
85	ڈی ایس پی کا قتل اور قرآن مجید کی المناک شہادت	161
86	تحریک کے آخری قائد مولانا نیازی بھی گرفتار	163
87	مولانا عبدالستار خاں نیازی کو سزائے موت	166
88	آفتاب عالم مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی	170
89	تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کا ایک نوجوان مجاہد مولانا شاہ احمد نورانی	173
90	قادیانیت پچھلی صدی کا منحوس فتنہ	181
91	تحریک تحفظ ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں میری کوشش حقیر سا نذرانہ ہے	183

92	قادیانیت کے خلاف آہنی چٹان	184
93	تحریک ختم نبوت میں اکابرین اہل سنت کے لیے پھانسی کی سزا کا اعزاز	185
97	تحفظ کا دعوی اور ڈھنڈورا پیٹنے والوں سے ایک اہم سوال	186
95	تحریک میں سید مودودی اور جماعت اسلامی کا کردار	187
96	منیر انکوائری رپورٹ "تبصرہ" اور "محاسبہ" کے تناظر میں	200
97	مرزا محمود احمد قادیانی کا عبرت ناک انجام	230
98	تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے بعد حالات اور اثرات ونتائج	232
99	قادیانیوں کے خلاف عدلیہ کے چند تاریخ ساز فیصلے	238

منیر انکوائری رپورٹ کا محاسبہ

100	پیش لفظ	242
101	ایک ضخیم اور متنوع دستاویز	243
102	فسادات کی ذمہ داری	244
103	حکومت پنجاب اور میاں دولتانہ	244
104	مرکزی حکومت اور خواجہ ناظم الدین	245
105	مجلس عمل	245
106	جماعت اسلامی	245
107	مسلم لیگ	247
108	مجلس عمل کے مطالبات	247
109	مرزا غلام احمد کا دعویٰ نبوت	249
110	حضرت عیسیٰ کی حیات وممات	250
111	جہاد کے بارے میں عقائد	251
112	اسلامی اصطلاحات کا استعمال	252
113	پاکستان کی مخالفت	253
114	مسلمانوں سے علیحدگی	254

115	تکفیر مسلمین، اشتعال انگیزیاں	255
116	قادیانیوں کی ذمہ داری	257
117	علمی دینی اور نظریاتی حیثیت کے مسائل	259
118	مجلس عمل کے مطالبات	261
119	مسلم کی تعریف	263
120	ارتداد	265
121	مسئلہ جہاد اسلامی	265
122	مال غنیمت اور خمس	267
123	اسلامی ریاست	269
124	لہو ولعب اور آرٹ	270
125	جمہوریت، قیادت اور نمائندہ حکومت	270
126	مغرب زدہ فکر کی خوف زدگی	273
127	تجدید اسلام اور احیائے دین	275
128	ارباب سیاست وقیادت کی کوتاہیاں	277
129	علمائے دین	278
130	خاتمۂ کلام	279
131	عرض حال	280
132	سہ ماہی "المنتقیٰ" کا "تحفظ ختم نبوت اور بابو پیر بخش لاہوری نمبر" کی اشاعت ایک اہم کارنامہ	283
133	"سنی پیغام" (ردّ قادیانیت نمبر) پر ایک نظر	290

انتساب

تحریک ختم نبوت 1953ء میں اکابرین اہلسنت میں

پھانسی کی سزا کا اعزاز پانے والے

مجاہد ملت، مولانا عبدالستار خان نیازی رحمۃ اللہ علیہ

مجاہد تحریک سید خلیل احمد قادری اشرفی رحمۃ اللہ علیہ

صوفی نذیر احمد رحمۃ اللہ علیہ

اور

تمام فدائیان ختم نبوت کے نام

جن کی جہد مسلسل اور قربانیوں نے

فتنۂ قادیانیت

کی دھجیاں فضائے آسمانی پر بکھیر کر رکھ دیں۔

حرف آغاز

سہ ماہی ''اَلْمُنْتَهٰی'' کی خصوصی اشاعت ''تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء'' آپ کے ہاتھوں کے لمس سے سرشار ہے اور آپ کے ذوقِ دانی کی طلبگار۔ یہ ایک ایسی داستان ہے کہ جس کا حال ماضی ہو چکا اور ایسا ماضی کہ ہمارے حال میں واضح طور پر جھلک رہا ہے۔ ایک مجاہد کے مجاہدہ، غازی کی جانثاری، جیالے کی سرفروشی، دینی مبلغ کی یقین محکم اور عشاقان ختمی مرتبت ﷺ کا کٹھن اور مشکل حالات میں جرأت و بہادری، غیرت ایمانی اور عقیدۂ ختم نبوت سے لازوال وابستگی کی ایسی داستان ہے جہاں آپ مشاہداتی مطالعہ کے مناظر بھی پائیں گے اور مشاہداتی مظاہر بھی۔

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء تاریخ کا ایسا زریں باب ہے جو ایمان و ایقان، علم و عرفان، شعور و آگہی اور تدبر و فراست کا نور بکھیرتا ہے۔ نیز مسئلہ تحفظ ختم نبوت پر وطن عزیز پاکستان کی تاریخ وعہد ساز مگر معتوب و مظلوم تحریک اپنے اندر ایسا آہنگ لئے ہوئے جو کفر شکن نعروں، خون کے فواروں اور آنسوؤں کی پھلواروں نے باہم مل کر ترتیب دیا ہے۔

یہاں لہو، وہاں لہو، بہ صحنِ گلستاں لہو، بہ شاخِ آشیاں لہو

آج لوگ تحریک تحفظ ختم نبوت کی تاریخ سے ناواقف ہیں۔ نوجوان تاریخ کے اس باب دعوت و عزیمت سے بے خبر ہے۔ شمع نبوت کے جن پروانوں نے اس جہاد میں حصہ لیا تھا وہ آہستہ آہستہ اُٹھتے جا رہے بلکہ اُٹھ گئے ہیں۔ ؎

اُٹھ گئے ساقی جو تھے، میخانہ خالی رہ گیا
یادگار بزم دِلیؔ، ایک حالی رہ گیا

خدشہ تھا کہیں امتدادِ زمانہ کے فدائیانِ رسالت ﷺ کے وہ واقعات کہ جن سے انہوں نے یہ جنگ اس شان سے لڑی کہ فتنۂ مرزائیت کی دھجیاں فضائے آسمانی پر بکھیر کر رکھ دیں ناپید نہ ہو جائیں۔ خوش قسمتی سے اس تحریک کی آپ بیتی، جگ بیتی اور یادداشتوں کو کتابی صورت میں جمع کرنے کا شرف **"ادارۃ المنتہیٰ پاکستان"** کو نصیب ہوا۔ "ادارہ ہذا" تحفظ ختم نبوت کے لئے خاص ہے۔ ادارے سے جڑا ہر رکن بھی اپنی متاعِ زیست کو اسی مشن کے لئے وقف کئے ہوئے ہے۔ ادارہ کی یہ کاوش ایک عہد کی سرگزشت ہے۔

ہمارے محققین (محمد ثاقب رضا قادری (ایڈووکیٹ) لاہور، محمد احمد ترازی، کراچی) نے تحریک کی رُوداد کو سپردِ قلم اور بکھری ہوئی یادداشتوں کو جمع کرکے آنے والی نسلوں کو ایک مقدس ورثہ منتقل کر دیا۔ سرگزشت میں تصنع اور بناوٹ نام کو نہیں تمام جذبوں کو اصل رُوپ میں پیش کیا ہے اور اُن کی یہی پُرخلوص سچائی اس مستند دستاویز کو تاریخی اہمیت عطا کر رہی ہے۔ یقین ہے کہ ان کی یہ وقیع کوشش قبولیت عامہ وتامہ حاصل کرے گی اور عاشقانِ مصطفیٰ ﷺ اس کی روشنی میں آئندہ بھی عشقِ رسول ﷺ کے زریں باب رقم کرتے رہیں گے۔

مجاہدِ بے ریا مفتی محمد تصدق حسین زید اقبالہ کا بے حد شکریہ کہ انہوں نے تحریک کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ادارہ کے جملہ اراکین کی حوصلہ افزائی کی۔ ہمارے کرم فرما برادرم محمد ثاقب رضا قادری (ایڈووکیٹ) جو محرم الحرام کی مبارک گھڑیوں میں حرمین شریفین کی مبارک ہوائیں کھا رہے ہیں اور شہرِ محبوب ﷺ سے مکمل فکری رہنمائی کر رہے ہیں۔ **"ادارۃ المنتہیٰ پاکستان"** کے ہر ہر فرد کو سلام جو وقتی ومالی خدمت استقامت سے کر کے ہیں عقیدۂ ختم نبوت سے لازوال وابستگی اور رسول خاتم ﷺ سے بے پناہ محبت کا بھرپور اظہار فرما رہے ہیں۔

تحریک تحفظ ختم نبوت 1953ء

مفتی محمد تصدق حسین (ناظم اعلیٰ: المرکز الاسلامی، والٹن لاہور)

انگریز نے ہندوستان پر ظالمانہ تسلط کے بعد جب اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور یہاں اچھی طرح قدم جما لینے کے بعد اپنے جاسوسوں اور پادریوں کے ذریعے یہ کھوج لگانا شروع کیا مسلم امہ کی قوت و طاقت کو کس طرح پارہ پارہ کیا جا سکتا ہے تاکہ یہ دوبارہ اپنی قوت مجتمع کر کے ہم سے اقتدار واپس نہ لے لیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں افتراق و انتشار پیدا کرنے کے لئے برطانوی وفد نے یہاں کے حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد جو رپورٹ مرتب کی اس میں لکھا:

ہندوستان میں اکثریتی آبادی اپنے مذہبی رہنماؤں کی تقلید پر یقین رکھتی ہے۔ اگر اس مسئلہ میں ہم ایسا کوئی آدمی تلاش کر سکیں جو اپنے تئیں ظلی نبوت کا دعویٰ کر سکے تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس کے دام فریب میں آ سکتی ہے، اس مقصد کے لئے مسلمان عوام سے کسی شخص کو ترغیب دینا مشکل ترین امر ہے، اگر یہ الجھن حل ہو جائے تو ایسے شخص کی نبوت کو انگریزی حکومت کی سرپرستی میں پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ ہم نے اس سے پہلے بھی بعض مفید (غدار) لوگوں کی مدد سے ہندوستانی حکومت کو کمزور اور بے بس کیا لیکن وہ مختلف مرحلہ تھا، اس وقت فوجی نقطہ نظر سے فروختنی مال درکار تھا اب جبکہ ہم نے ملک کے کونے کونے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی ہے اور ہر طرف ہمارا حکم نافذ ہے، ہمیں ایسے اقدامات کرنے چاہئیں جن سے داخلی انتشار پیدا ہو سکے۔[1]

اپنے نمائندہ وفد کی رپورٹ کے تناظر میں انگریزی حکومت نے اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے مناسب اور موزوں شخص کی تلاش شروع کر دی اور اس سلسلہ میں کئی ایک لوگوں پر کام شروع کیا جو برطانوی مفادات کے لئے کشف و الہام کا ڈرامہ کر سکے۔ برطانوی حکومت کے نمائندوں کے خفیہ پیغام اس کے لئے وحی (حرف آخر) کا درجہ رکھتے ہوں تلاش بسیار کے بعد

---

[1] Extract from the Printed Report india office Lubrary London-5

انگریز کی نگاہ انتخاب سیالکوٹ کچہری کے ایک ملازم امرتسر کے ایک غیر معروف گاؤں 'قادیان' کے باسی مرزا غلام قادیانی پر ٹھہری، مرزا چونکہ بچپن سے اسی قماش کا آدمی تھا۔ مرزا بشیر کے مطابق اپنے دادا کی پنشن چوری کر کے آوارہ گردی میں مشغول رہنے والا مرزا قادیانی انگریزوں کے لئے انتہائی موزوں رہا۔

مرزا قادیانی 1868ء میں نوکری سے استعفیٰ دے کر واپس قادیان چلا گیا اور انگریزی مفادات کے لئے تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہو گیا۔ مرزا کی تمام تحریروں کا خلاصہ اور لب لباب، برطانوی سامراج کی خدمت گزاری، ملکہ برطانیہ کی وفاداری، جہاد کی مذمت، اسلامی اقتدار کی بیخ کنی، ہندوستان اور دیگر اسلامی دنیا کو سامراجی نظام کے زیر تسلط رکھنے کی خواہش، اپنے ماننے والوں کو انگریز حکومت کی غلامی کی پُر زور ترغیب اور ہندوستان انگریز کے ظالمانہ اور غاصبانہ قبضہ کے لئے خدمات سرانجام دینا شامل ہے۔ مرزا قادیانی کی تمام تحریروں میں یہ عنصر بھی نمایاں اور واضح ہے کہ مرزا نے اسلام، مسلمانوں، علماء اور اپنے مخالفین کے لئے انتہائی سخت، گندی اور غلیظ زبان استعمال کی لیکن جہاں کہیں کفر، یہود و نصاریٰ اور انگریزی سامراج کی بات آئی وہاں مرزا کی لجاجت، خوشامد اور چاپلوسی دیدنی ہے۔ مرزا قادیانی کی گھڑی ہوئی ایک بھی جھوٹی وحی، کشف یا الہام ایسا نہیں جو برطانوی حکومت کے مفادات کے خلاف جاتا ہو اگر کسی چھوٹے موٹے پادری کے خلاف بھی مرزا کے منہ سے کوئی بات نکلی تو برطانوی سامراج نے باقاعدہ اپنے پالتو کو ذلیل اور رسوا کر کے اس سے معافی منگوائی۔

ہندوستان میں مرزا قادیانی فتنہ برطانوی سامراج، یہودیوں کے خفیہ اثر و رسوخ اور برطانوی حکومت کے خفیہ کلیسائی نظام کی مالی معاونت سے پروان چڑھایا گیا۔ اسی بنیاد پر مرزا قادیانی نے زندگی کا ہر لمحہ اور ہر پل حکومت برطانیہ کی مدح سرائی میں صرف کیا و حکومت برطانیہ کو اپنے لئے سایہ رحمت سمجھتا تھا اور برطانوی ایماء پر مرزا نے اپنی جماعت اور متبعین کو اسلامی اقتدار سے بغاوت اور انگریزی حکومت سے وفاداری اور غلامی کا سبق پڑھایا۔

1908ء میں مرزا قادیانی کے جہنم مکانی ہونے کے بعد مرزا کی اولاد اور اس کے قریبی چیلوں نے استعماری و سامراجی مفادات کے لئے کام جاری رکھا۔ مرزا بشیر بن مرزا غلام قادیانی

نے ہر اس تحریک کی مخالفت کی جو انگریزی حکومت کے خلاف تھی۔

ہندوستان پر انگریزی گرفت کمزور ہوتی دیکھ کر قادیانی نے انگریزی آقاؤں کے ایماء پر ہندوؤں سے بھی گٹھ جوڑ کر لیا۔ ہندوستان سے واحد زمینی راستہ گورداسپور سے کشمیر کو جاتا ہے قادیانی ملی بھگت اور سازش کے ذریعہ سے ہی ضلع گورداسپور ہندوستان کا حصہ بنا کر کشمیر پر قبضہ کر لیا گیا، آج تک ہندوؤں نے کشمیر میں جتنے بھی بے گناہ افراد شہید کیے ان سب کا خون قادیانیت کے سر ہے۔

سہ ماہی ''اَلْمُنْتَھٰی'' کا تحریک ختم نبوت 1953ء نمبر:

وطن عزیز پاکستان کے معرض وجود میں آتے ہی اسکی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کے لئے "فتنہ قادیانیت" کے زہریلے ناگ یہاں چھوڑ دیئے گئے جنہوں نے مملکت خداداد پاکستان کا امن و سکون غارت کر کے رکھ دیا۔ ناقوس مرزائیت "الفضل" میں علماء اسلام کا نام لیکر انہیں نیست و نابود کرنے کی دھمکیاں دی گئیں عوام قادیانیت کی اس زہر افشانی سے بہت تنگ تھے کہ کراچی کے ایک جلسہ عام میں چودھری ظفر اللہ (جو اس وقت وزارت خارجہ کے قلمدان پر قابض تھا) کی تقریر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ علماء نے ملکی امن وامان کے لیے ظفر اللہ قادیانی کو عہدے سے ہٹانے کا مطالبہ کیا اور اس سلسلہ میں خواجہ ناظم الدین سے ملاقات رکھی۔ جب علماء وہاں ملاقات کے لیے گئے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

یوں حکومتی مرزائی نوازی سے تحریک تحفظ ختم نبوت شعلہ جوالہ بن گئی مجاہدین ختم نبوت ظلم و بربریت کے سامنے آہنی دیوار بن گئے، دس ہزار کے قریب مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا مجاہد ملت مولانا عبد الستار نیازی اور علامہ سید خلیل احمد قادری کو سزائے موت کا حکم دے دیا گیا یہ سارے حکومتی ہتھکنڈے بھی مجاہدین ختم نبوت کے حوصلے پست نہیں کر سکے، قادیانی ملک پاکستان پر قبضہ کا جو خواب دیکھ رہے تھے وہ چکنا چور ہو گیا یہ تحریک قادیانیت اور قادیانی نوازوں کے لیے نقطہ آغاز ثابت ہوئی اور بالآخر 7 ستمبر 1974 پاکستانی پارلیمنٹ میں آئینی و قانونی لحاظ سے یہ متفقہ فیصلہ سنایا گیا کہ "قادیانی غیر مسلم ہیں یہ اسلام اور پاکستان دونوں کے غدار ہیں۔"

یہ آئین بننے کے بعد بھی اسلام اور پاکستان کے خلاف قادیانیت کی ہرزہ سرائی جاری ہے پس پردہ رہ کر وہ سازشوں میں مصروف ہیں۔ امت مسلمہ کے خوش بخت افراد بھی "قادیانی فتنہ"

کے خلاف میدان عمل میں مصروف ہیں۔

ان چنیدہ افراد میں علم واخلاص کی دولت سے مالا مال حضرت مولانا خواجہ غلام دستگیر فاروقی کا نام انتہائی نمایاں ہے ایک عالم کے لئے بہت بڑی سعادت اورخوش بختی ہے کہ وہ خطیب ہو، مدرس ہو اور تصنیف وتالیف کے کام میں بھی مشغول ہو اللہ تعالیٰ نے حضرت فاروقی صاحب کو اس کمال واعزاز سے نوازا ہے کہ آپ بیک وقت تینوں شعبوں میں مصروف خدمت دین متین ہیں "اللھم زد فزد" خواجہ غلام دستگیر فاروقی کی زیرنگرانی **"ادارۃ المنتہٰی پاکستان"** اسلامی اقدار کے فروغ میں مصروف ہے اس ادارے کے تحت آپ کی زیرادارت سہ ماہی ''اَلْمُنْتَهٰی'' ختم نبوت کے حوالے سے شائع ہوتا ہے یہ ایک وقیع مجلہ ہے اس میں علمی و ادبی مضامین شامل ہوتے ہیں اس کے ذریعے نئے قلمکار تیار کیے جاتے ہیں۔ ''اَلْمُنْتَهٰی'' نوجوان علماء کے لیے تحقیق کے نئے زاویے مہیا کرتا ہے اس سے قبل ''اَلْمُنْتَهٰی'' "قادیانیت پر آخری ضرب نمبر" اور "تحفظ ختم نبوت اور بابو پیر بخش لاہوری" کے عنوان سے خصوصی نگارشات منظر عام پر لاچکا ہے۔ ''اَلْمُنْتَهٰی'' یہ چوتھی خصوصی کاوش "تحریک ختم نبوت 1953ء" کے نام سے شائع کر رہا ہے۔

''اَلْمُنْتَهٰی'' کی پوری ٹیم اور بالخصوص خواجہ غلام دستگیر فاروقی مبارک باد اور خراجِ تحسین کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کریم ﷺ کے طفیل فاروقی صاحب کی مساعی جمیلہ کو شرف قبولیت سے نوازے اور مسلمانوں کو ان سے فیضیاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین بجاہ خاتم النبیین ﷺ

تحریک ختم نبوت 1953ء

محمد ثاقب رضا قادری (ایڈووکیٹ)

تخلیق پاکستان کے بعد منکرین ختم نبوت (قادیانیوں/مرزائیوں) نے اپنا مرکز قادیان (بھارت) سے ربوہ (پاکستان) منتقل کرلیا۔ یوں نوزائیدہ مسلم ریاست ابتدا سے ہی ان کے دجل وفریب کے گرداب میں اُلجھ کر رہ گئی۔ اہل نظر نے اپنے نورِ فراست سے پیش آمدہ مسائل کا اِدراک کرتے ہوئے اربابِ اقتدار کو جھنجھوڑنے کی پوری کوشش کی لیکن یہ سب کوشش بے سُود ثابت ہوئی۔ معروف صحافی مرتضیٰ احمد میکش ایڈیٹر مغربی پاکستان نے ۱۹۵۰ء میں **"پاکستان میں مرزائیت کا مقام اور مستقبل"**[1] کے عنوان سے مسلسل دس اقساط میں اداریے لکھے جس میں حکمران طبقہ پر واضح کرنے کی کوشش کی کہ مرزائی مسلمانوں سے الگ ملت ہیں اور صرف اپنے مذموم سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے اسلام کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں نیز یہ طبقہ انگریز سامراج کی پیداوار، اکھنڈ ہندوستان کا حامی وطلبگار اور پاکستان کو مرزائی اسٹیٹ بنانے کا اُمیدوار ہے خواہ اس کے لیے ان کو کسی خطرناک حد تک ہی کیوں نہ جانا پڑے۔

قیام پاکستان سے لے کر ۱۹۵۳ء تک کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرزائیوں کے اشتعال انگیز رویے اور اقلیت میں ہوتے ہوئے اکثریت (مسلمانوں) کے حقوق پر غاصبانہ قبضے کے باوجود مسلمانوں نے قدرے صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے حق کے لیے آواز بلند کی لیکن جب کسی جانب شنوائی نہ ہوئی تو سینوں میں بیدار جذبے نے ایک ملک گیر تحریک کی صورت اختیار کرلی۔

---

[1] یہ مقالہ ہماری مرتبہ کتاب "ردِّ قادیانیت اور سُنّی صحافت" جلد سوم میں شامل ہے۔ قادری

یہ تحریک مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے کے لیے سب سے بڑی تحریک تھی لیکن اس قدر ہمہ گیریت کے باوجود یہ تحریک اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہوسکی جس کا واحد سبب کلیدی عہدوں خاص کر فوج اور وزارت خارجہ میں مرزائیوں کی تقرری اور انتہا پسند رویہ تھا۔ اس تحریک کو کچلنے کے لیے پنجاب کی مرزائی نواز حکومت اور فوج نے تحریک کے کارکنوں کا قتل عام کیا اور قائدین کو گرفتار کر لیا جس سے وقتی طور پر یہ تحریک دب گئی اور اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہوسکی۔

اس تحریک کے محرکات یہاں مختصراً بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ختم نبوت کا انکار اور خلاف اسلام نظریات کا پرچار

مرزائی گزشتہ 70 سالوں سے اسلام کے بنیادی عقیدہ ختم نبوت کا انکار کرتے ہوئے مرزا غلام قادیانی کی نبوت کے قائل ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود مسلمان کہلوانے پر اصرار کرتے۔ عامۃ المسلمین کے دل اس سبب سے پہلے ہی بے حد ملول تھے۔

۲۔اسلامی اصطلاحات کا بے جا استعمال

مرزائی حضرات مرزا قادیانی کی نبوت کے قائل ہو کر دین اسلام سے مرتد ہوئے لیکن اس کے باوجود وہ خود کو ''مسلمان'' کہتے، اپنی عبادت گاہوں کو ''مسجد'' کا درجہ دیتے، مرزا قادیانی کی بیویوں کو ''امہات المومنین''، اس کے ابتدائی پیروکاروں کو ''صحابہ'' اور اس کے گھر کے دیگر افراد کے لیے ''اہل بیت'' کی اصطلاح استعمال کرتے رہے ہیں۔

یہی صورتِ حال مسلمانوں کے لیے باعث اشتعال رہی ہے۔

۳۔وزارت خارجہ/سفارت خانوں و دیگر کلیدی عہدوں پر مرزائیوں کا تقرر

سر ظفر اللہ چودھری کو پاکستان کا پہلا وزیر خارجہ بنا دیا گیا جس نے وزارت خارجہ، سفارت خانوں و دیگر کلیدی عہدوں پر مرزائی افراد کی تقرری شروع کر دی۔ نیز فوج کے تینوں اداروں میں مرزائیوں نے اہم مناصب حاصل کر لیے اور یوں مرزائی چاہتے تھے کہ مستقبل میں

طاقت کے بل بوتے پر پاکستان کو ایک مرزائی اسٹیٹ بنا دیا جائے۔

چوہدری ظفر اللہ خان نے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے جنازہ میں شرکت نہ کی اور وجہ پوچھنے پر کہا کہ یوں سمجھ لیجیے کہ ایک کافر نے مسلمان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی یا ایک مسلمان نے کافر کا جنازہ نہیں پڑھا۔

فلسطین اسرائیل تنازعہ کے دوران چوہدری ظفر اللہ نے عرب ممالک کی مجلس متحدہ کبیر کو کہا کہ وہ اگر اقوام متحدہ کے اجلاس میں ان کی شمولیت و حمایت چاہتے ہیں تو مرزائیوں کے "امیر المومنین" کو درخواست بھیجیں کہ وہ ان کو اس کام کے لیے حکم دے۔

۴۔ ربوہ کا متوازی نظام حکومت

مرزائیوں نے ۱۹۴۸ء میں اپنا مرکز قادیان سے پاکستان منتقل کیا اور چنیوٹ کے قریب 1034 ایکڑ پر مشتمل ایک قطعۂ اراضی پنجاب کے انگریز گورنر سر موڈی فرانسس کی خصوصی عنایت سے لیز پر حاصل کر لیا۔ مرزائیوں نے یہاں متوازی نظام حکومت قائم کر لیا اور ایک خود ساختہ "امیر المومنین" مقرر کر لیا۔ مرزائیوں نے اپنی فوج فرقان بٹالین بنائی، جاسوسی کا محکمہ صیغۂ راز یا خفیہ اُمور، نظارت داخلہ، خارجہ، اُمور عامہ، عدلیہ وغیرہ کا مکمل نظام قائم کر لیا۔

۵۔ مرزائیوں کے عقائد باطلہ کی سرعام تبلیغ اور خلاف اسلام سرگرمیاں

مرزائیوں کا لٹریچر مسلمانوں کے لیے انتہائی دل آزار ہے، خود مرزا قادیانی کی کتب میں انبیاء، صحابہ، اولیاء، علماء جیسی معزز ہستیوں کی توہین کی گئی ہے، کہیں قرآن کریم میں لفظی و معنوی تحریف کی گئی تو کہیں مرزائی عقائد کے بیان میں تاویلات باطلہ تحریر ہیں۔ جہاد کو منسوخ قرار دیا گیا، امام مہدی و حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کی روایات کو باطل قرار دیا گیا ہے۔

۶۔ صوبہ بلوچستان کو مرزائی اسٹیٹ بنانے کا منصوبہ

بلوچستان پاکستان کا رقبہ کے اعتبار سے بڑا صوبہ ہے البتہ وہاں آبادی دیگر صوبوں کی

نسبت کم ہے۔ یہ صوبہ معدنی وسائل سے مالا مال ہے۔ قیام پاکستان کے بعد مرزائیوں نے فوج و دیگر اداروں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی کوشش کی، وہ دو منصوبوں پر کام کرتے رہے ہیں؛ پلان A پاکستان کی مکمل اسلامی ریاست کو مرزائی اسٹیٹ بنانا اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو پلان B یہ قرار پایا کہ کم از کم صوبہ بلوچستان کو پاکستان سے الگ کر کے مرزائی اسٹیٹ قائم کی جائے۔

۷۔ جہانگیر پارک کراچی میں مرزائیوں کا جلسہ

۱۷/۱۸ مئی کو جہانگیر پارک کراچی میں مرزائیوں نے بہت بڑا جلسہ منعقد کیا جس میں پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ قادیانی نے بھی تقریر کی۔ سرکاری مشینری کا بھرپور استعمال ہوا بلکہ جلسہ کے خلاف پُرامن احتجاج کرنے والے مسلمانوں پر لاٹھی چارج بھی کیا گیا۔ اس جلسہ کے بعد کراچی میں حالات کشیدہ ہوئے اور مسلم حلقوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی اور یہیں سے تحریک کی ابتدا ہوئی۔

آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن، کراچی

مولانا لال حسین اختر نے ۲؍جون ۱۹۵۲ء کو کراچی کے تھیوسوفیکل ہال میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کا اہتمام کیا، اس کانفرنس کے دعوت ناموں پر مولانا لال حسین اختر، مولانا احتشام الحق تھانوی (دیوبندی)، مولانا عبدالحامد بدایونی (اہل سنت)، مولوی محمد یوسف (اہل حدیث) اور جعفر حسین مجتہد نے دستخط کیے۔ اس کانفرنس میں درج ذیل مطالبات تشکیل دیے گئے:

۱۔ احمدی ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیے جائیں۔
۲۔ چوہدری ظفر اللہ وزیر خارجہ کو عہدے سے الگ کر دیا جائے۔
۳۔ تمام کلیدی اسامیوں سے مرزائیوں کو ہٹایا جائے اور
۴۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن طلب کیا جائے۔

اس کنونشن کی صدارت مولانا سید سلیمان ندوی نے کی اور ایک بورڈ بھی تشکیل دیا گیا جس

میں درج ذیل حضرات شامل تھے:

۱۔ سید سلیمان ندوی
۲۔ مفتی محمد شفیع
۳۔ علامہ عبدالحامد بدایونی
۴۔ علامہ محمد یوسف کلکتوی
۵۔ علامہ شاہ احمد نورانی
۶۔ مولانا لال حسین اختر
۷۔ مفتی صاحبداد خان
۸۔ علامہ سلطان احمد
۹۔ الحاج ہاشم گزدر
۱۰۔ جعفر حسین مجتہد
۱۱۔ مولانا احتشام الحق تھانوی

۱۳ر جولائی کو الحاج ہاشم گزدر کے مکان پر بورڈ کا اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ کنونشن کے لیے دعوت نامے مندرجہ ذیل جماعتوں کے نام جاری کیے جائیں:

۱۔ جمعیت علمائے پاکستان
۲۔ جمعیۃ العلمائے اسلام
۳۔ جماعت اسلامی
۴۔ تنظیم اہل السنت والجماعت
۵۔ جمعیۃ اہل سنت
۶۔ جمعیۃ اہل حدیث
۷۔ موتمر اہل حدیث، پنجاب
۸۔ ادارہ تحفظ حقوق شیعہ، پنجاب

۹۔ سفینۃ المسلمین

۱۰۔ حزب اللہ، مشرقی پاکستان

۱۱۔ مجلس تحفظ ختم نبوت

۱۲۔ مجلس احرار

۱۳۔ جمعیۃ الفلاح

۱۴۔ جمعیۃ العربیہ

کنونشن کی تاریخ ۱۶،۱۷ راگست مقرر کی گئی لیکن یہ کنونشن ۱۶ سے ۱۸ رجنوری ۱۹۵۳ء کو منعقد ہوا۔

آل مسلم پارٹیز کنونشن، لاہور

۱۳ رجولائی ۱۹۵۲ء کو لاہور کے برکت علی اسلامیہ ہال میں تمام مکاتب فکر کے نمائندہ علماء کا مرکزی کنونشن ہوا۔ اس کنونشن کے دعوت نامے پر حسب ذیل اشخاص کے دستخط تھے:

۱۔ مولانا غلام محمد ترنم (صدر جمعیت علماء پاکستان پنجاب)

۲۔ مفتی محمد حسن صدر جمعیۃ العلمائے اسلام لاہور

۳۔ مولوی احمد علی لاہوری، امیر انجمن خدام الدین، لاہور

۴۔ مولوی محمد علی جالندھری (ناظم اعلیٰ مجلس احرار پنجاب)

۵۔ مولوی سید داؤد غزنوی (صدر جمعیۃ اہل حدیث، لاہور)

۶۔ مولوی سید نور الحسن بخاری (ناظم اعلیٰ تنظیم اہل السنت والجماعت)

۷۔ سید مظفر علی شمسی (ایڈیٹر اخبار شہید)

یہ مرکزی کنونشن مسودہ آئین میں ''مسلمان'' کی تعریف نہ ہونے کی وجہ سے بلایا گیا تھا۔ اس مرکزی کنونشن میں درج ذیل تین مطالبات کیے گئے:

ا۔ سر ظفر اللہ کو وزارت خارجہ سے ہٹایا جائے کیوں کہ وہ اپنے اس مذہبی عقیدے کا خود

اقرار کر چکے ہیں کہ برطانوی حکومت سے وفاداری ان کے دین ایمان میں داخل ہے اور جو شخص کسی غیر مملکت سے شرعی وفاداری اپنے ایمان میں داخل سمجھتا ہے وہ پاکستان کی آزاد مملکت میں وزارت خارجہ جیسے اہم عہدے پر متمکن رہنے کا ہر گز اہل نہیں۔

۲۔کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک وہ ہر معاملہ میں جناب خاتم النبیین ﷺ کی تعلیمات کو آخری حجت تسلیم نہ کرے اور حضور سرور کائنات ﷺ کی تعلیمات میں سے کسی کی تفسیر یا تعبیر یا تاویل کا سوال پیدا ہو تو مسلمانوں کی کثرت رائے کے فیصلے کی پابندی کو اپنے لیے ضروری نہ سمجھے۔ پاکستان اس لیے حاصل کیا گیا ہے کہ یہاں اسلام کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی خاطر ایک وطن قائم کیا جائے لہذا جو لوگ پاکستان میں رہنا چاہیں لیکن خاتم النبیین ﷺ کی تعلیمات کو کسی مسئلہ میں آخری حجت تسلیم نہ کریں یا حضور ﷺ کی تعلیم کی تاویل میں مسلمانوں کی کثرت رائے کی پابندی نہ کریں- انہیں آئین پاکستان کے تحت غیر مسلم اقلیت قرار دینا چاہیے۔

۳۔ پاکستان بن جانے کے بعد یہاں سب سے بڑا مسئلہ حکومت کو اسلامی تعلیمات کے ماتحت لانے کا ہے۔حکومت صرف وزارت کا نام نہیں بل کہ اس میں سرکاری ملازمین کو بھی بڑا دخل حاصل ہے لہذا جب تک پاکستان میں سرکاری محکموں کی کلیدی اسامیوں پر صرف ان سرکاری ملازمین کو مقرر نہیں کیا جاتا جو ہر مسئلہ میں خاتم النبیین ﷺ کی تعلیمات کو آخری حجت تسلیم کریں اور حضور ﷺ کی تعلیم کی تاویل میں مسلمانوں کی کثرت رائے کی پابندی اپنا ایمانی اور منصبی فرض سمجھیں تب تک پاکستان کو اسلامی مملکت نہیں بنایا جاسکتا۔

اس کنونشن میں تمام مکاتب فکر کے مقتدر علماء پر مشتمل ایک مجلس عمل تشکیل دی گئی جن کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ مولانا ابوالحسنات سید احمد قادری (صدر)

۲۔ مولانا امین احسن اصلاحی (نائب صدر)

۳۔ مولانا عبدالحامد بدایونی

۴۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری

۵۔ پیر صاحب سرسینہ شریف (مشرقی پاکستان)

۶۔ حافظ کفایت حسین

۷۔ پیر غلام مجدد سرہندی

۸۔ ماسٹر تاج الدین انصاری

۹۔ مولوی محمد اسماعیل (گوجرانوالہ)

۱۰۔ حاجی محمد امین سرحدی

۱۱۔ مولوی محمد یوسف کلکتوی

۱۲۔ مولوی نورالحسن

۱۳۔ مولانا اختر علی خان (مدیر زمیندار اخبار، لاہور)

۱۴۔ سید مظفر علی شمسی

۱۵۔ مولانا احتشام الحق تھانوی

مولانا ابوالحسنات کو مجلس عمل کا صدر منتخب کیا گیا۔

مولانا غلام محمد ترنم، مولانا محمد بخش مسلم، مولانا غلام دین، مولانا عطاء اللہ حنیف، صاحب زادہ فیض الحسن، علامہ علاء الدین صدیقی، مولانا مرتضیٰ احمد میکش کو بھی رکن نامزد کیا گیا۔

مسلم لیگ کی قراردادیں

مسلم لیگ پنجاب کی کئی ضلعی کمیٹیوں نے بھی مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی قرارداد منظور کی چناں چہ سرگودھا، گوجرانوالہ، گجرات، جھنگ اور ملتان میں قراردادیں منظور ہوئیں۔ ضلع ملتان کی قرارداد کے محرک معروف عالم دین علامہ سید احمد سعید کاظمی تھے۔ آپ کی پیش کردہ قرارداد کا متن یہ ہے:

"چوں کہ قادیانی بالاتفاق خارج از اسلام سمجھے جاتے ہیں اس لیے ان کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور حکومت کو اس اعلان میں تاخیر نہ کرنی چاہیے۔

چوں کہ چودھری ظفر اللہ خاں قادیانی ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے نمائندہ نہیں ہیں اس لیے پنجاب صوبہ مسلم لیگ کی کونسل کو حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے عہدے سے برطرف کر دیے جائیں اور ان کی جگہ کوئی قابل اعتبار مسلمان مقرر کیا جائے۔"

وزیر اعلیٰ پنجاب میاں ممتاز دولتانہ کی تقریر

۳۰ / اگست ۱۹۵۲ء کو حضوری باغ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ ممتاز دولتانہ نے کہا:

"آج دنیا بھر میں پاکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جو اسلامی حکومت قائم کرنے کا دعویدار ہے۔ تمام دنیا ہمارے اس تجربے کو غور سے دیکھ رہی ہے اور اگر ہم اس ذمہ داری کی تکمیل میں ناکام رہ گئے تو دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ دنیا میں حکومت کی اسلامی ہیئت کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

ختم نبوت کے مسئلے میں میرا وہی عقیدہ ہے جو ایک مسلمان کا ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک وہ تمام لوگ خارج از اسلام ہیں جو رسول کریم (ﷺ) کو آخری نبی نہیں مانتے۔ میں اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ عقیدۂ ختم نبوت پر کوئی بحث اٹھانا خود کفر کے مترادف ہے کیوں کہ بحث کی گنجائش صرف اس مسئلے میں ممکن ہے جس میں کسی قسم کا شبہ وارد ہوتا ہو۔ عقیدۂ ختم نبوت ہمارے ایمان کا جزو ہے اس لیے ہر بحث اور ہر منطق سے بالاتر ہے۔ مرزائیوں کے خلاف جو نفرت پیدا کی گئی ہے اس کی ذمہ داری خود انہی پر ہے کیوں کہ ان کے رجحانات علاحدگی پسندانہ ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں ہم سے علاحدہ ہیں اور انہوں نے اپنی ذاتی سیاسی اور مجلسی سرگرمیوں کو صرف اپنی جماعت تک محدود کر رکھا ہے۔ قادیانی افسر اپنی جماعت کے آدمیوں کی

طرف داری کے مجرم ہیں کیوں کہ انہوں نے بہت سی الاٹمنٹس محض اس بنیاد پر کی ہیں کہ الاٹی مرزائی تھا گویا انہوں نے اپنی سرکاری حیثیت کا ناجائز استعمال کیا۔

اس صورت حال کا علاج جذباتی تقریروں اور عام جلسوں سے نہیں ہو سکتا جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے میں فرقہ وارو جوہ کی بنا پر جانب داری کے مجرموں کے خلاف شدید کارروائی کروں گا اور جہاں اس قسم کی شکایت کی جائے گی اس کی پوری تحقیقات کراؤں گا۔

میں آپ لوگوں سے احکام اسلام کا واسطہ دے کر اور ملت کی آبرو کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ ہر اس شخص کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت کیجیے جو اپنے آپ کو پاکستانی شہری کہتا ہے جب تک میں چیف منسٹر ہوں۔ میں اپنے صوبے میں بے گناہوں کا خون گرانا ہرگز برداشت نہ کروں گا۔ ہر شہری کی آبرو کے تحفظ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا اور ہر قیمت پر اپنا یہ دینی، اخلاقی اور سرکاری فرض بجالاؤں گا۔ مرزائیوں کو اقلیت قرار دینا ایک دستوری مسئلہ ہے۔ ہمارا دستور اب تک وضع نہیں کیا گیا اور دستور ساز اسمبلی نے اب تک اس امر کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ اکثریت اور اقلیتوں کے درمیان کیا فرق و امتیاز ملحوظ رکھا جائے گا لہٰذا اس مسئلے کو دستور ساز اسمبلی پر چھوڑ دینا چاہیے لیکن اگر بحث کی غرض سے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دے دیا گیا، اگر اس کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو "مرزائی" کہنا بند کر دیا تو پوزیشن کیا ہوگی؟

کسی قوم یا گروہ کو اقلیت قرار دینے کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف اس قوم یا گروہ کے حقوق معین کیے جائیں بل کہ ان حقوق کی حفاظت بھی کی جائے اور ان کو سرکاری ملازمتوں اور قانون ساز اسمبلیوں میں رعایات دی جائیں۔ اگر مرزائی اقلیت قرار دے دیے گئے تو ہم مجبور ہوں گے کہ ان کو وہ تمام رعایات و حقوق دیں جو بہ حالت موجودہ ہم انہیں نہیں دینا چاہتے۔ یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر گہرے اور

سنجیدہ غور و خوض کی ضرورت ہے۔ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کو عام جلسے منعقد کرنے، فساد مچانے، پتھر پھینکنے اور اسی قسم کی دوسری ناواجب حرکات سے حل کیا جاسکے۔ میں ان لوگوں سے جو ختم نبوت کی تحریک کے سلسلے میں جلسے منعقد کر رہے ہیں- یہ سوال کرتا ہوں کہ جس حالت میں ہم سب عقیدۂ ختم نبوت پر قائم ہیں، ان جلسوں کی کیا ضرورت ہے۔ ان غیر ضروری جلسوں کو دیکھ کر بعض اوقات میرے دل میں جلسے منعقد کرنے والوں کی نیت پر شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔"

۱۳ر ستمبر ۱۹۵۲ء کو راول پنڈی میں تقریر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ دولتانہ نے کہا:

"میں اس ملک کو صحیح اسلامی جمہوریہ بنانا چاہتا ہوں جس میں ہر شخص بلا امتیاز عقائد سیاسی مساوی حقوق رکھتا ہو جس میں ہر چیز کا فیصلہ بہترین عدل و انصاف سے کیا جائے جس میں لوگوں کی اقتصادی اور اخلاقی حالت بہت اچھی ہو اور جس کے لوگ ملک کی مشترکہ بہبود کے حصول کے لیے سنجیدگی، ہوشمندی اور خلوص سے کام کریں۔

..... میرا پختہ ایمان ہے کہ نبی کریم (ﷺ) آخری نبی ہیں جس شخص کا یہ عقیدہ نہیں وہ مسلمان نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو شخص یہ عقیدہ نہ رکھتا ہو اسے ملک میں رہنے کا حق نہیں۔

تمام وہ لوگ جو پاکستان میں رہتے ہیں اور پاکستان کے وفادار ہیں خواہ وہ ہندو ہوں، عیسائی ہوں یا کسی اور فرقے یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں- اس ملک کی حکومت اور اس ملک کے باشندوں کی حفاظت میں ہیں۔ اہل وطن میں سے ایک ایک فرد کی حفاظت مسلمان اور حکومت کا بھی اولین فریضہ ہے جب تک اُمور حکومت کی عنان میرے ہاتھ میں ہے، میں پورا انتظام کروں گا کہ کسی وفادار پاکستانی کو محض اس بنا پر کوئی ضرر نہ پہنچنے پائے کہ اس کا مذہب اس کی ذات پات یا اس کا مسلک ہم سے جداگانہ ہے۔

احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا مسئلہ کوئی دینی مسئلہ نہیں بل کہ ایک دستوری معاملہ ہے جس کو یہی حیثیت دینی چاہیے اور اس پر ٹھنڈے دل سے بحث کرنی چاہیے۔ میں احرار اور دوسری مذہبی انجمنوں سے اپیل کرتا ہوں کہ اس مسئلے پر غور وخوض کرنے کے لیے پُرسکون فضا پیدا کریں۔''

وزیر اعلیٰ کی مندرجہ بالا تقاریر سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ اس تحریک کو روکنا چاہتے تھے لیکن جسٹس منیر کی تحقیقاتی عدالت میں اخبار نوائے وقت کے بانی و مدیر حمید نظامی نے دولتانہ وزارت پر جو الزام لگایا اس کے مطابق دولتانہ چاہتے تھے کہ تحریک بڑھے چناں چہ اسی غرض سے مختلف اخباروں کو سرکاری طور پر مرزائیوں کے خلاف مضامین کی اشاعت کے لیے رقوم دی گئیں لیکن وہ اس تحریک کا رُخ وفاقی حکومت کی طرف کرنا چاہتے تھے۔ حمید نظامی نے میر نور احمد ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کو اس سازش میں شریک ہونے کا الزام لگایا۔ مولانا مرتضیٰ احمد میکش یہاں تحقیقاتی عدالت کے فاضل جج صاحبان کی رائے کو یوں پیش کرتے ہیں:

''فاضل جج صاحبان کی رائے میں مطالبات کا یہ بچہ جسے احرار نے پیدا کیا اور علمائے اسلام نے اپنایا اور دولتانہ نے کراچی کی جانب نہر کھدوائی اور اس بچے کو صندوق میں ڈال کر اس نہر میں مرکزی حکومت کی طرف بہادیا- (یہ بچہ) ابھی زندہ ہے اور انتظار کر رہا ہے کہ کوئی آئے اور اسے اُٹھالے۔''[1]

یہاں یہ بعید از قیاس نہیں کہ میاں ممتاز دولتانہ وزارت عظمیٰ سے خواجہ ناظم الدین کو الگ کرنا چاہتے تھے کیوں کہ خواجہ ناظم الدین دستور میں پنجاب اور بنگال کے لیے مساوی درجہ کے قائل تھے جب کہ دولتانہ ایسا نہ چاہتے تھے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ حمید نظامی کا الزام درست ہو۔ منیر رپورٹ کے مطابق دولتانہ چاہتے تھے کہ تحریک بڑھے لیکن اس کا دائرۂ اثر پنجاب سے نکل کر مرکزی حکومت کو متاثر کرے۔

---

[1] ردِ قادیانیت اور سنی صحافت، جلد ۳ صفحہ ۲۸۱

اربابِ اقتدار سے علماء کی ملاقاتیں

☆.....منیر انکوائری رپورٹ کے مطابق ۳؍مارچ ۱۹۵۰ء کو قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے مولانا احتشام الحق تھانوی کے ہمراہ وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کی اور قادیانی لٹریچر سے قادیانی افکار و عقائد بارے ان کو مطلع کیا جس سے خواجہ صاحب سخت پریشان ہوئے۔ (منیر رپورٹ اردو، ۱۲۷)

☆.....مجلس عمل کے قیام کے بعد مولوی اختر علی خان نے ایک پریس کانفرنس کے دوران جولائی ۱۹۵۲ء میں وزیر اعظم سے ملاقات کی اور مجلس عمل کے مطالبات کا ذکر کیا۔

☆.....۱۳؍اگست ۱۹۵۲ء کو مجلس عمل کے ایک وفد نے وزیر اعظم سے ملاقات کی، اس وفد میں درج ذیل علماء شامل تھے:

۱۔مولانا ابوالحسنات سید احمد قادری ۔ ۲۔مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش

۳۔مولانا عبدالحامد بدایونی ۔ ۴۔ماسٹر تاج الدین انصاری

۵۔علامہ احتشام الحق تھانوی

اس وفد نے وزیر اعظم کو ایک تحریری یادداشت پیش کی جس میں مرزائیوں کے رویے بارے شکایات کے علاوہ درج ذیل مطالبات بھی کیے گئے:

۱۔ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔

۲۔ چودھری ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ کو عہدے سے برطرف کیا جائے۔

۳۔ احمدیوں کو مملکت کے کلیدی عہدوں سے موقوف کر دیا جائے۔

خواجہ ناظم الدین نے کہا کہ وہ اس وقت یوم پاکستان (۱۴؍اگست) کی تیاریوں میں مصروفیت کے سبب اس مسئلے پر گفتگو نہیں کر سکتے، اس لیے ارکانِ وفد ان سے بعد میں ملاقات کریں۔تاہم اسی دن مرکزی حکومت کی طرف سے یہ اعلان شائع کیا گیا:

''حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ صوبائی یا مرکزی وزارتوں کا کوئی رکن ان اشخاص

میں جن کے ساتھ اس کا واسطہ پڑتا ہے۔کسی فرقہ وار عقیدے کی تبلیغ کے لیے اپنی سرکاری پوزیشن کو استعمال نہ کرے گا۔ ہر گورنر کو ہدایت کی گئی ہے کہ یہ فیصلہ تمام متعلقہ وزیروں تک پہنچا دیں اور حکومت توقع رکھتی ہے کہ آیندہ کوئی وزیر اس قاعدے کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔

حکومت پاکستان کو اکثر اس امر کی شکایات موصول ہوئی ہیں کہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے بعض افسر جو ایک خاص فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔اپنے ماتحتوں اور ان دوسرے اشخاص کے درمیان جن کے ساتھ سرکاری حیثیت میں ان کا واسطہ پڑتا ہے۔اپنے فرقہ وار عقائد کی تبلیغ کے لیے اپنی سرکاری حیثیت کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔حکومت اس معاملے کو سخت نامناسب خیال کرتی ہے چناں چہ اس نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اس ناپسندیدہ سرگرمی کو فی الفور ختم کر دیا جائے اور آیندہ کے لیے اس قابل اعتراض طریقے سے فرقہ وار عقائد کی تبلیغ کو ممنوع قرار دیا جائے۔

گورنمنٹ سروس کنڈکٹ رُولز (قواعد کردار ملازمانِ سرکاری) میں اس منشا کے مطابق ترمیم کردی گئی ہے۔

حکومت اعلانِ عام کر دینا چاہتی ہے کہ جو شخص خواہ وہ کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو اس قاعدے کی خلاف ورزی کرے گا اس کے خلاف شدید کارروائی کی جائے گی۔

پاکستان کی صوبائی اور ریاستی حکومتوں کو بھی اسی قسم کے اقدام کی ہدایت کی گئی ہے۔"

☆......۱۶؍اگست ۱۹۵۲ء کو مجلس عمل کا وفد دوبارہ خواجہ ناظم الدین سے ملا، اس موقع پر سردار عبدالرب نشتر، مسٹر گورمانی اور مسٹر فضل الرحمن بھی موجود تھے۔اس ملاقات کا نتیجہ ارکانِ وفد کے لیے دل شکن تھا۔خواجہ ناظم الدین نے کہا کہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مسئلہ دستور ساز اسمبلی کے دائرہ اختیار میں ہے اور میں اس معاملے میں کسی اقدام پر آمادہ نہیں ہوسکتا، چودھری ظفراللہ کو قائداعظم نے مقرر کیا تھا اس لیے میں ان کو برطرف نہیں کرسکتا۔ رہا مسئلہ احمدی افسروں کو کلیدی عہدوں سے الگ کیا جائے تو اس کے متعلق ارکانِ وفد کو دلائل و

براہین سے کیس (Case) تیار کرنا چاہیے اور ربوہ کے متعلق جو شکایات ہیں وہ صوبائی حکومت کے سامنے پیش کرنی چاہئیں۔ (منیر رپورٹ)

☆......۲۹ ستمبر ۱۹۵۲ء کو مولانا ابوالحسنات سید احمد قادری، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، شیخ حسام الدین اور مولانا داؤد غزنوی نے وزیر اعلیٰ پنجاب ممتاز دولتانہ سے ملاقات کی اور ربوہ میں خالص احمدی بستی کے لیے اراضی کا عطیہ اور ناواجب الاٹمنٹس پر شکایات پیش کیں۔ وزیر اعلیٰ نے اس پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔

آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن

تحقیقاتی کمیشن کے رُوبرو مجلس عمل، (پنجاب) کے تحریری بیان کے مطابق یہ کنونشن ۱۶ر جنوری ۱۹۵۳ء کو بعد نماز جمعہ منعقد ہوا، تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء شریک ہوئے، مسئلہ احمدیت پر بحث ہوئی اور ایک سبجیکٹس کمیٹی (Subjects Committee) مرتب کی گئی۔

اس اجلاس میں درج ذیل علماء شریک ہوئے:

۱۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی

۲۔ حاجی محمد امین (امیر جماعت ناجیہ)

۳۔ خلیفہ حاجی ترنگ زئی، پشاور

۴۔ پیر سرسینہ شریف (امیر حزب اللہ ڈھاکہ)

۵۔ مولانا راغب حسین، ڈھاکہ

۶۔ مولانا عزیز الرحمن، ڈھاکہ

۷۔ مولانا اطہر علی، ڈھاکہ

۸۔ مولانا سخاوت الانبیاء، ڈھاکہ

۹۔ مولانا یوسف بنوری

۱۰۔ مولانا شمس الحق، قلات

۱۱۔ مولانا ابراہیم میر، سیالکوٹ
۱۲۔ مولانا احمد علی لاہوری
۱۳۔ مفتی محمد حسن، لاہور
۱۴۔ مولانا محمد ادریس، لاہور
۱۵۔ مولانا ظفر احمد عثمانی، کراچی
۱۶۔ علامہ سید سلیمان ندوی، کراچی
۱۷۔ مفتی محمد شفیع دیوبندی، کراچی
۱۸۔ مولانا سلطان احمد، کراچی
۱۹۔ مفتی صاحبداد خان، سندھ
۲۰۔ علامہ عبدالحامد بدایونی، کراچی
۲۱۔ مولانا محمد یوسف کلکتوی، کراچی
۲۲۔ مولانا محمد اسماعیل
۲۳۔ مولانا سید داؤد غزنوی
۲۴۔ مولانا محمد علی جالندھری
۲۵۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری
۲۶۔ مولانا متین، کراچی
۲۷۔ مولانا احتشام الحق تھانوی
۲۸۔ مولانا سید ابوالحسنات احمد قادری، لاہور

راست اقدام بارے غور وخوض

☆......۱۸ر جنوری کو کنونشن کا دوسرا اجلاس ہوا جس میں درج ذیل قراردادیں منظور کی گئیں:
۱۔ چوں کہ خواجہ ناظم الدین وزیراعظم پاکستان کے رویے کے پیش نظر اس امر کی کوئی

اُمید نہیں کہ مرزائیوں کے متعلق مطالبات تسلیم کر لیے جائیں گے، اس لیے آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ان حالات میں مطالبات کو تسلیم کرانے کی غرض سے "راست اقدام" ناگزیر ہوگیا ہے۔

۲۔ چوں کہ حکومت مرزائیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے پر آمادہ نہیں ہے اس لیے ایسی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہوگیا ہے کہ فرقہ مرزائیہ کو ملت اسلامیہ سے خارج کر دیا جائے۔ ان تدابیر میں سے ایک یہ ہے کہ اس فرقے سے کامل مقاطعہ کیا جائے۔

۳۔ چوں کہ مرزائی وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خاں کی برطرفی کا مطالبہ اب تک منظور نہیں کیا گیا اس لیے کنونشن خواجہ ناظم الدین سے استعفیٰ کا مطالبہ کرتی ہے تاکہ مسلمانان پاکستان اپنے دینی عقائد پر عمل کرنے اور اسلامی روایات کی حفاظت کرنے کے قابل ہو جائیں۔

۴۔ مذکورہ بالا مطالبات کو عملی صورت دینے کی غرض سے کنونشن تجویز کرتی ہے کہ وہ معزز و مقتدر مسلمانوں اور مختلف مذہبی جماعتوں کے نمائندوں کو جنرل کونسل کا ممبر بنائے۔

۵۔ جنرل کونسل اپنے پندرہ ممبروں کو منتخب کرے جو مجلس عمل کے ممبر قرار پائیں۔

۶۔ جنرل کونسل مندرجہ ذیل آٹھ اصحاب کو مجلس عمل کا ممبر منتخب کرتی ہے:

(۱) مولانا سید ابوالحسنات احمد قادری

(۲) سید عطاء اللہ شاہ بخاری

(۳) مولانا عبدالحامد بدایونی

(۴) سید ابوالاعلیٰ مودودی

(۵) حافظ کفایت حسین

(۶) مفتی احتشام الحق تھانوی

(۷) ابوصالح محمد جعفر پیر صاحب سرسینہ شریف، مشرقی پاکستان

(۸) مولانا محمد یوسف کلکتوی

اور ان ممبروں کو اختیار دیتی ہے کہ بقیہ سات ممبروں کو اپنی مرضی سے نامزد کرلیں۔

۷۔مجلس عمل کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ مطالبات کو منظور کرانے کے لیے لائحہ عمل مرتب کرے۔

۸۔مجلس عمل کو ہدایت کی جاتی ہے کہ کوئی عملی پروگرام اختیار کرنے سے پیشتر ایک نمائندہ وفد مرتب کرے جو مرکزی حکومت سے ملاقات کرکے اس کو لوگوں کے آخری فیصلے سے مطلع کردے۔اس وفد کو اختیار ہوگا کہ کابینہ کو آخری جواب کے لیے مزید وقت دے دے۔

اسی دن نماز مغرب کے بعد مجلس عمل کے آٹھ ممبروں کا اجلاس ہوا جس میں مندرجہ ذیل سات ممبران نامزد کیے گئے:

(۱) پیر غلام مجدد سرہندی
(۲) مولانا نورالحسن
(۳) ماسٹر تاج الدین انصاری
(۴) مولوی اختر علی خان
(۵) مولوی اسماعیل، گوجرانوالہ
(۶) صاحب زادہ فیض الحسن
(۷) حاجی محمد امین سرحدی

مجلس عمل کا ایک وفد جس کے رئیس مولانا عبدالحامد بدایونی اور شرکاء پیر صاحب سرسینہ شریف، سید مظفر علی شمسی اور ماسٹر تاج الدین انصاری تھے۔ ۲۲؍جنوری ۱۹۵۳ء کو خواجہ ناظم الدین سے ملاقی ہوا۔خواجہ صاحب نے مطالبات سے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن یہ کہا کہ وہ ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہیں۔

ارباب اقتدار سے مزید ملاقاتیں

☆.....۱۶؍نومبر ۱۹۵۳ء کو خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان لاہور آئے تو مجلس عمل کا ایک وفد ان سے مرزائیوں بارے مطالبات کے متعلق ان کا طرز عمل جاننے کے لیے حاضر ہوا۔

اس وفد میں درج ذیل علماء شریک تھے:

(۱) مولانا ابوالحسنات سید احمد قادری

(۲) مولوی اختر علی خان

(۳) ماسٹر تاج الدین انصاری

(۴) سید مظفر علی شمسی

(۵) حافظ خادم حسین

خواجہ ناظم الدین نے اپنی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے ارکانِ وفد کو اس اَمر کی طرف اشارہ کیا کہ وہ فی الفور مطالبات تسلیم نہیں کر سکتے، اگر ارکانِ وفد مزید گفت وشنید کے خواہاں ہوں تو کراچی ملاقات کر سکتے ہیں۔

☆......۲۰؍فروری کو ایک وفد جس میں مولانا غلام محمد ترنم امرتسری، مولانا محمد بخش مسلم، سید مظفر علی شمسی اور حافظ کفایت حسین شریک تھے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب ممتاز دولتانہ سے ملا اور احمدیوں بارے اپنی شکایات یاد دلائیں لیکن وزیر اعلیٰ نے جواب دیا کہ وہ ابھی اس بارے تحقیق کر رہے ہیں۔

☆......۲۱؍فروری کو ایک وفد جس میں سید سلیمان ندوی، مولوی احتشام الحق تھانوی دیوبندی، مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولوی اختر علی خان اور مولانا عبدالحامد بدایونی شریک تھے۔ خواجہ ناظم الدین سے ملاقی ہوا۔ اس ملاقات میں سردار عبدالرب نشتر بھی موجود تھے۔ ارکان وفد نے خواجہ ناظم الدین کو بتایا کہ الٹی میٹم کو ایک مہینہ گزر چکا ہے لیکن ابھی تک مطالبات بارے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ دورانِ گفتگو مولوی احتشام الحق تھانوی دیوبندی نے کاغذ کے ایک پُرزے پر کچھ لکھ کر دوسروں کو دکھایا جس پر مولانا عبدالحامد بدایونی کے سوا باقی سب نے قبولیت کے اظہار کے طور پر سر ہلائے۔

دوسرے دن مولانا عبدالحامد بدایونی بعض علماء پنجاب سید ابوالحسنات قادری، سید مظفر علی شمسی، ماسٹر تاج الدین انصاری کے ہمراہ خواجہ ناظم الدین سے پھر ملے لیکن اس بار

اراکین وفد کو زیادہ واضح طور پر بتا دیا گیا کہ نہ مطالبات تسلیم کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی خواجہ ناظم الدین ان کو دستور ساز اسمبلی کے روبرو پیش کرنے پر آمادہ ہیں۔

یہاں تک تحریک ختم نبوت 1953ء کے حالات ہم نے جسٹس منیر کی تحقیقاتی رپورٹ سے مختصراً نقل کیے۔ اس سے آگے کے حالات کے لیے ہم تحریک کے بعض اکابر علماء کی تحریروں وانٹرویوز سے نقل کرتے ہیں۔

علامہ عبدالحامد بدایونی

مولانا بدایونی کا تعلق برصغیر کے ایک عظیم علمی وروحانی خانوادہ عثمانیہ قادریہ، بدایوں سے ہے جو گزشتہ آٹھ سو سال سے اسلامیانِ برصغیر کی توجہات کا مرکز ہے۔ آپ تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن رہے، مسلم لیگ ومطالبۂ پاکستان کی حمایت کے لیے متعدد شہروں کا دورہ کیا، صوبہ سرحد (موجودہ نام خیبر پختونخواہ) کی پاکستان میں شمولیت کے لیے قائداعظم نے مولانا بدایونی کو سرحد بھیجا، آپ کی کوشش سے کانگریسی وظیفہ خوار نام نہاد مولویوں کو شکست ہوئی اور سرحد پاکستان کا حصہ بنا، اسی وجہ سے آپ کو "فاتح سرحد" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ نے متعدد کتب بھی تصنیف کیں۔ آپ کی مذہبی وسماجی وسیاسی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے آپ کے سیکرٹری، کراچی کے بزرگ محقق جناب آزاد بن حیدر نے ایک ضخیم کتاب "انسائیکلو پیڈیا فاتح سرحد مولانا عبدالحامد بدایونی القادری" (۱۳۰۰ صفحات) ترتیب دی جو کہ ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی۔

قیام پاکستان کے بعد آپ نے جمعیت علمائے پاکستان کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس کے پہلے سربراہ علامہ سید ابوالحسنات قادری تھے۔ آپ کو مرزائیت سے سخت نفرت تھی، ۱۹۴۴ء میں مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں آپ نے قادیانیوں کے مسلم لیگ میں شمولیت کے خلاف ایک قرارداد بھی پیش کی۔ جب ۱۹۵۲ء میں تحریک ختم نبوت کا آغاز ہوا تو آپ نے اس میں بھرپور حصہ لیا۔ وزیراعظم خواجہ ناظم الدین سے اس سلسلہ میں مسلسل رابطہ قائم کیے رکھا

اور مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے وفد کے ہمراہ متعدد ملاقاتیں بھی کیں۔ راست اقدام کے فیصلہ کے بعد آپ کو کراچی سے گرفتار کیا گیا اور لاہور، سکھر وغیرہ مختلف جیلوں میں منتقل کیا جاتا رہا۔ اس دوران آپ نے عبادات کی حکمت کے متعلق ایک کتاب "فلسفۂ عبادات اسلامی" تصنیف کی، اس کتاب کے مقدمہ میں مولانا بدایونی اپنے ایام اسیری کے معمولات بارے لکھتے ہیں:

"کبھی وہ وقت تھا کہ حضور سید عالم ﷺ کی خاتمیت رسالت اور حضور کے ناموس شریفہ کی حفاظت کفار و مشرکین کے زمانے میں ہم بہ بانگ دہل کر لیتے تھے مگر آج ہماری بدبختی ہے کہ ایک ایسے فرقۂ ضالہ کے متعلق جس کے کفر پر پوری دنیائے اسلام اور سارے فرقے متفق ہیں- کچھ کہنا لب ہلانا منع ہے۔ جس کی تخلیق برطانیہ کے اشاروں پر ہوئی، اسے آزادیٔ تقریر حاصل، ہم پر پابندیاں۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ بہت جلد دنیا ہی میں ختم نبوت کے منکرین کو سزائیں ملیں گی۔

برطانیہ اور انگریزوں کے جن غلاموں نے اپنے خداوندوں کے اشارے پر ہم لوگوں پر مظالم ڈھائے ہیں وہ دیکھ لیں گے کہ نہ ان کی کرسیاں رہیں گی نہ وزارتیں اور عہدے۔

......ہم یہاں (یعنی جیل میں) نہ تخریب پسندی کے تحت آئے نہ اپنا یہ عقیدہ کہ پاکستان کی سالمیت کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے۔ وطن عزیز کے خمیر میں ہمارا خون شامل ہے، پس کیسے ممکن ہے کہ اپنے ملک کی ہم کسی وقت بھی تخریب چاہیں۔ مانا کہ اتفاقی طور پر اس وقت ہمارے ساتھ تحریک ناموس نبوی کی حفاظت کی خاطر ایسے حضرات شامل ہیں جن کا سیاسی مسلک ہم سے مختلف تھا۔ بلا شبہ وہ تحریک قیام پاکستان کے مخالف اور کانگریس کے ہم نوا تھے اور ہمارا تعلق قائد اعظم کی جماعت سے تھا- مذہبیات اور معتقدات میں بھی ہمارے ان کے درمیان اختلافات تھے اور اب بھی ہیں لیکن حفاظت ناموس نبوی کا مسئلہ ایسا بنیادی مسئلہ تھا جس کے سبب سے ایک پلیٹ فارم بن گیا، دیگر مسائل سیاسی و مذہبی میں ان کی راہ دوسری، ہمارا مطمح نظر

اور۔" (فلسفۂ عبادات اسلامی: ۱۲-۱۳)

علامہ ابوالحسنات سید احمد قادری:

علامہ ابوالحسنات سید احمد قادری لاہور کے جید عالم دین ومحدث علامہ سید دیدار علی شاہ الوری کے صاحب زادے تھے۔ آپ نے طویل عرصہ لاہور کی تاریخی مسجد وزیر خاں میں خطابت کے فرائض انجام دیے۔ تحریک پاکستان و جہاد کشمیر میں بھرپور کردار ادا کیا۔ آپ نے متعدد موضوعات پر قلم اُٹھایا اور بیش قیمت کتب تصنیف کیں۔ "اوراقِ غم" اور "تفسیر الحسنات" آپ کی علمی یادگار ہیں۔

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے لیے جب تمام مکاتب فکر کے علماء نے متحدہ مجلس عمل تشکیل دی تو آپ کو صدر منتخب کیا گیا۔ تحریک کے ابتدائی ایام میں ہی علماء کے ایک وفد کے ہمراہ آپ کراچی میں موجود تھے کہ آپ کو گرفتار کر کے سکھر جیل میں قید کیا گیا۔ جہاں آپ کے صبر و استقلال کا مظاہرہ دیکھ کر فکری مخالفین بھی قائل ہو گئے۔

مولانا سید خلیل احمد قادری نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا: جس وقت لاہور ہائی کورٹ میں کیس چل رہا تھا تو جسٹس منیر صاحب نے مختلف علماء کے بیانات لیے، ان کا مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ علماء کو ذلیل کیا جائے اور انھیں جاہل ثابت کیا جائے، اس مقصد میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ مسلمان کی تعریف پر میرے والد (سید ابوالحسنات قادری) نے ڈھائی گھنٹہ کا بیان دیا جس پر عطاء اللہ شاہ بخاری بہت متاثر ہوئے اور وہ اس قدر مفصل جواب تھا کہ جسٹس منیر خود کہنے لگا کہ مولانا میں آپ کی بہت قدر کرتا ہوں اور پھر مزید سوالات کرنا شروع کر دیے۔ اسی میں انھوں نے والد صاحب سے ایک سوال کیا کہ مولانا اس اخبار میں یہ لکھا ہے کہ آپ نے ایک تقریر میں کہا کہ مسلمان فوج کو ختم نبوت کی تحریک کے سلسلے میں مسلمانوں پر گولی چلانی پڑی تو یہ ان کے لیے حرام ہے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ یہ پرانی باتیں ہیں اور بہت سی چیزیں قید میں رہنے کی وجہ سے ذہن سے نکل گئی ہیں، بہرحال اگر اخبار میں لکھا ہے تو کہا ہو

گا۔اس پر وہ کہنے لگے کہ میں آپ سے شرعی مسئلہ پوچھتا ہوں کہ ایسے موقع پر کیا فوج کے لیے گولی چلانا جائز ہوگا؟ تو والد صاحب نے کہا کہ یہ حرام ہے،تو جسٹس منیر نے کہا کہ مولانا آپ سوچ کر جواب دیجیے یہ ہائی کورٹ ہے۔اس وقت مولانا نے کہا کہ اگر یہ فوجی عدالت بھی ہوتی تو بھی میرا جواب یہی ہوتا اور میں اپنے موقف سے نہیں ہٹتا۔[1]

سید عطاء اللہ شاہ بخاری آپ کی جرات اظہار اور مصائب پر صبر و استقلال سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جیل میں آپ کی خدمت بجالانے میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔مولانا مجاہد الحسینی کے بقول سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک سال کے عرصۂ جیل میں مولانا ابوالحسنات کو بیت الخلاء جاتے وقت کبھی لوٹا اُٹھانے کا موقع نہ دیا بل کہ پانی بھر کر دروازے تک خود چھوڑ کر آتے اور اس خدمت کی بجا آوری میں کسی اور کی شرکت ہرگز گوارا نہ کرتے۔سید عطاء اللہ شاہ بخاری کہتے:

''ہم لوگ تو مختلف تحریکوں میں حصہ لے کر مصائب برداشت کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔قید و بند کی صعوبتیں ہمارے لیے نئی اور انوکھی نہیں ہیں......لیکن مولانا ابوالحسنات جس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں وہ اس وادی کے لوگ نہیں ہیں،انھوں نے جس صبر اور استقامت کا مظاہرہ کیا اور پاداشِ حق میں زینت زنداں بنے ہیں- لائق صد تحسین و آفریں ہے پھر گھر میں کوئی دوسرا بچہ اور نرینہ اولاد موجود نہیں ہے جو اہل خانہ کو روز مرہ کی اشیائے خوردنی ہی بازار سے لا کر دے سکے۔دونوں باپ بیٹا یہاں جیل خانے کی سلاخوں میں جکڑے ہوئے ہیں،ان کے سینے میں ناموس رسالت اور عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کا جذبہ صادق موجود ہے۔ہم اس کا نہ تو حق ادا کر سکتے ہیں اور نہ ہی زبان و الفاظ اس کے صحیح عکاس ہو سکتے ہیں۔قلبی کیفیات گفتنی نہیں ہوا کرتیں۔میرے دل میں مولانا کی بڑی قدر و منزلت ہے۔''[2]

---

[1] ماہ نامہ ترجمان اہل سنت،کراچی-ختم نبوت نمبر اگست ستمبر ۱۹۷۲ء،ص ۷۹

[2] تحریک ختم نبوت 1953ء- ناقابل فراموش مشاہدات از مجاہد الحسینی،صفحہ:۷۲ مطبوعہ ختم نبوت پبلی کیشنز،لاہور

مولانا ابوالحسنات قادری نے جیل میں تفسیر قرآن بنام "تفسیر الحسنات" لکھنا شروع کر دی اور سات جلدوں میں مکمل کی۔ ذرا اندازہ کیجیے کہ پیرانہ سالی، جیل کی صعوبتیں اور اکلوتے بیٹے کو سزائے موت کی روح فرسا خبر اس پر مستزاد۔ لیکن مولانا کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور قرآن پاک سے دل لگا لیا۔ ایک بار ان کو جیل میں یہ اطلاع ملی کہ ان کے بیٹے کو گولی مار دی گئی تو مولانا نے اپنے ہاتھ دعا کے لیے بلند کرتے ہوئے کہا:

"اے اللہ! اگر ایسا ہوا ہے تو ناموس محمد ﷺ کی خاطر قربانی دینے والے خلیل کی قربانی قبول فرما اور ایک خلیل نہیں ہزار خلیل ناموس مصطفیٰ پر قربان ہوں اور اگر وہ زندہ ہے تو اسے اپنی حفاظت میں رکھ۔"[1]

مولانا عبدالستار خان نیازی کا تاریخی انٹرویو:

انجمن طلباء اسلام، پنجاب کے ناظم محمد اقبال اظہری نے تحریک ختم نبوت 1953ء کے متعلق مولانا عبدالستار خان نیازی سے انٹرویو کیا جو کہ ماہ نامہ ترجمان اہل سنت، کراچی کے خاص شمارہ "ختم نبوت نمبر" بابت اگست/ستمبر ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ اس انٹرویو سے چند اہم اقتباسات ہم یہاں نقل کر رہے ہیں:

سوال: ۱۹۵۳ء میں مرزائیت کی جو تحریک چلی تھی اس کے کیا اسباب تھے؟

جواب: دراصل ۱۹۵۳ء کی تحریک سے پہلے BBC کی رپورٹ آچکی تھی۔ خواجہ ناظم الدین صاحب نے بنیادی اُصولوں پر غور وخوض کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس کمیٹی میں یہ تو کہا گیا تھا کہ ملک کا سربراہ مسلمان ہو گا لیکن یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ مسلمان کون ہے۔ یہ تحریک اسی لیے چلی کہ مسلمان کی تعریف کی جائے اور اسلامی شریعت کے مطابق جو شخص مسلمان نہیں اور اسلام کا دشمن ہے وہ کلیدی اسامیوں پر نہیں رہ سکتا۔ اس دور میں ظفر اللہ وزیر خارجہ تھا اور وزیر خارجہ ہوتے ہوئے وہ عالم اسلام اور پاکستان کے خلاف سازش کر رہا تھا۔ ہر جگہ مرزائیوں کو

---

[1] ماہ نامہ ترجمان اہل سنت، کراچی۔ ختم نبوت نمبر اگست ستمبر ۱۹۷۲ء، ص ۷۹

سفارت خانوں میں رکھ رہا تھا اور اس کا دماغ اس حد تک خراب ہو گیا تھا کہ اس نے قائداعظم کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی اور جب اس سے پوچھا گیا کہ نماز جنازہ کیوں نہیں پڑھی تو جواب دیا کہ یہ سمجھ لو کہ ایک مسلمان نے کافر کی نماز جنازہ نہیں پڑھی یا ایک کافر نے مسلمان کا جنازہ نہیں پڑھا۔

فروری ۱۹۵۳ء کے آخر میں کراچی اور لاہور سے تحریک تحفظ ختم نبوت نے تین مطالبات کو خواجہ ناظم الدین کی مسلم لیگی وزارت سے منوانے کی خاطر راست اقدام کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ تحریک کی ابتدا ایک مجلس عمل نے کی جس نے یہ پہلے سے بتادیا تھا کہ تحریک کا مقصد تشدد یا قانون شکنی نہیں بل کہ اس وزارت کو استعفیٰ دینے پر مجبور کرنا ہے جو رائے عامہ کے مطالبات کو تسلیم نہیں کرتی۔ خود اپنی جماعت کے فیصلے پر بھی عمل نہیں کرتی اور جس نے سوائے راست اقدام کے اور کوئی راستہ باقی نہیں چھوڑا، جس کے ذریعے یہ تین مطالبات منوائے جاسکیں، نہ ہی یہ وزارت ملک کا آئین مکمل کرنے پر آمادہ تھی۔ آئین کی عدم تکمیل کی صورت میں عام انتخابات کا بھی امکان نہ تھا جہاں رائے عامہ آئینی طریقے سے اپنے مطالبات پورے کرواسکتی۔ وہ تین مطالبات یہ تھے:

۱۔ سر ظفر اللہ کو وزارت خارجہ سے ہٹادیا جائے کیوں کہ وہ اپنے اس مذہبی عقیدے کا خود اقرار کرچکے ہیں کہ برطانوی حکومت سے وفاداری ان کے دین و ایمان میں داخل ہے اور جو شخص کسی غیر مملکت کی حکومت سے شرعی وفاداری اپنے ایمان میں داخل سمجھتا ہو، وہ پاکستان کی آزاد مملکت میں وزارت خارجہ جیسے اہم عہدوں پر متمکن رہنے کا ہرگز اہل نہیں۔

۲۔ دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک وہ ہر مسئلہ میں جناب خاتم النبیین ﷺ کی تعلیمات کو آخری حجت تسلیم نہ کرے اور حضور سرور کائنات ﷺ کی تعلیمات میں سے کسی کی تفسیر یا تاویل کا سوال پیدا ہو تو مسلمانوں کی کثرت رائے کے فیصلے کی پابندی کرنا اپنے لیے ضروری نہ سمجھے۔ پاکستان اس لیے حاصل کیا گیا ہے کہ یہاں اسلام کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی خاطر ایک وطن قائم کیا جائے۔ لہٰذا جو لوگ پاکستان

میں رہنا چاہیں لیکن خاتم النبیین ﷺ کی تعلیمات کو کسی مسئلہ میں آخری حجت تسلیم نہ کریں یا حضور ﷺ کی تعلیم کی تاویل میں مسلمانوں کی کثرت رائے کی پابندی نہ کریں۔انھیں آئین پاکستان کے ماتحت اقلیت قرار دینا چاہیے۔

۳۔تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد یہاں سب سے بڑا مسئلہ حکومت کو اسلامی تعلیمات کے ماتحت لانے کا ہے کہ حکومت صرف وزارت کا نام نہیں بل کہ جب تک اس میں ایسے سرکاری ملازمین کو مقرر نہیں کیا جاتا جو ہر مسئلہ میں خاتم النبیین ﷺ کی تعلیمات کو آخری حجت تسلیم کریں اور حضور ﷺ کی تاویل میں مسلمانوں کی کثرت رائے کے فیصلے کی پابندی اپنا ایمانی اور منصبی فرض سمجھیں تب تک پاکستان کو اسلامی مملکت نہیں بنایا جاسکتا۔

سوال: آپ نے اس تحریک میں بہت سرگرمی سے حصہ لیا تھا کیا آپ اس کی کچھ تفصیل بتائیں گے۔

جواب: اس تحریک میں علماء نے جب حصہ لیا تو برکت علی ہال (لاہور) میں ایک کنونشن ہوا،یہ قصہ ۱۹۵۱ء کا ہے۔اس میں ہم سب لوگ (تمام مکاتب فکر کے علماء) شریک ہوئے،وہاں یہ طے پایا تھا کہ کراچی میں ایک آل پاکستان کنونشن ہو۔اس کے لیے تیرہ (۱۳) آدمیوں کو منتخب کیا گیا تھا۔میں بھی ان میں پنجاب کی طرف سے بہ طور نمائندہ خصوصی منتخب ہوا تھا۔احرار کے ساتھ ہم نے ایک مجلس تحفظ ختم نبوت بنائی تھی اور اس میں علماء اہل سنت کو بھی شامل کیا گیا۔مولانا ابوالحسنات صاحب کو مجلس عمل کا قائد بنایا گیا۔علماء اہل سنت نے بہت سرگرمی سے کام کیا لیکن میں نے اس مجلس تحفظ ختم نبوت کے تمام ضوابط کے تحت کام نہیں کیا کیوں کہ انھوں نے مجھے اس میں شامل نہیں کیا تھا۔بہر حال میں نے اپنی بساط کے مطابق ملک بھر کا دورہ کیا۔

مجھے ایک خصوصیت یہ حاصل تھی کہ میں اسمبلی کا ممبر تھا اور ممبران اسمبلی سے میرا تعلق رہتا تھا۔علاوہ ازیں میں نے تحریک پاکستان میں جو کام کیا تھا اس کی وجہ سے مسلم لیگ کے کارکنان وغیرہ سے میرے تعلقات تھے اور کالجوں وغیرہ میں بھی طلبا سے تعلقات تھے۔مجلس تحفظ ختم نبوت نے کراچی میں کنونشن کیا،اس کے تیرہ (۱۳) نمائندوں میں میرا بھی نام تھا لیکن مجھے

اس میں شامل نہیں کیا گیا۔ان کا یہ خیال تھا کہ یہ گرم اور تیز آدمی ہے اور اس کی وجہ سے وقت سے پہلے تصادم نہ ہو جائے۔

بالآخر دولتانہ نے ایک چال چلی۔اس کا مقصد یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ میں نشانہ بنوں، نشانہ مرکز کو بننا چاہیے۔ابتدا میں دولتانہ نے تحریک کی مخالفت کی لیکن جب تحریک نے زور پکڑا تو اس نے یہ چال چلی کہ اپنے صوبہ میں مخالفت نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ کہا کہ آپ کا مطالبہ آئینی ہے اور آپ کو مرکز سے رجوع کرنا چاہیے۔احراری حضرات چاہتے تھے کہ دولتانہ ناراض نہ ہو اور انھیں معلوم تھا کہ میں حزب اختلاف ہوں اور میری شمولیت سے دولتانہ اس تحریک میں رکاوٹیں ڈال سکتا ہے۔ان کی اس مصلحت کو میں برا نہیں سمجھتا کیوں کہ یہی صوبہ انھیں کام کرنے کے لیے بہت مناسب تھا۔جب یہ تحریک تیز ہوگئی اور کراچی میں ملاقات کے لیے یہ حضرات گئے تو پتہ چلا کہ یہ گرفتار ہو گئے۔یہ ۲۵ر فروری ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ میرا ان سے یہ اختلاف تھا کہ لاہور کے قافلے کراچی یعنی ۷۵۰ میل دور جا کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کریں یہ کوئی پُر اثر چیز نہیں ہوگی۔دولتانہ غلط کہتا ہے کہ میں تمہاری تحریک سے متفق ہوں اگر تحریک سے متفق ہے تو صوبائی اسمبلی میں جا کر قرارداد پاس کرے اور دوسری بات یہ کہ دولتانہ بھی خواجہ ناظم الدین کا ہی بنایا ہوا ہے۔میری رائے یہ تھی کہ کراچی والے کراچی میں، پنجاب والے پنجاب میں اور سرحد والے سرحد میں کام کریں اور یہ تحریک ملک گیر صورت اختیار کرلے اور صوبے مجبور ہو کر مرکز پر دباؤ ڈالیں اور ہمارے مطالبات مرکز تسلیم کرلے۔علماء کی گرفتاری کی اطلاع مجھے جمعہ کے دن داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر تقریر کے دوران ملی تھی اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ قافلہ جانے والا ہے تو میں نے کہا کہ اس کی بجائے پنجاب اسمبلی کا گھیراؤ کیا جائے اور انھیں مجبور کر دیا جائے کہ وہ مرکز سے ہمارا مطالبہ تسلیم کرائیں۔تحریک چلتی رہی یہاں تک کہ سب قائدین گرفتار ہو گئے۔ان کی گرفتاری کے بعد تحریک ختم ہونے لگی لیکن میں نے کہا کہ یہ تحریک ختم نہیں ہونی چاہیے چنانچہ ۲۷ اور ۲۸ر فروری کو میں نے علماء سے ملاقات کی۔

مولانا مودودی کی معذرت

مولانا غلام غوث ہزاروی سے ملاقات ہوئی اور پھر ہم لوگ مل کر مولانا مودودی کے پاس گئے اور انھیں صورت حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ یہ تحریک آگے بڑھانی ہے۔ مولانا نے کہا کہ آپ کچھ دیر بعد آئیں تاکہ کچھ اور لوگ آجائیں اور پھر فیصلہ کیا جائے۔ وہاں مولانا مودودی نے کہا کہ میں ابھی تحریک میں شامل نہیں ہوتا جب تحریک فیل (Fail) ہونے لگے گی تو میں اس کو سنبھال لوں گا۔ میں نے کہا مولانا آپ اس کو نہیں سنبھال سکتے۔ میں نے علماء اور کارکنان کو جمع کیا اور ایک پُرامن جلوس کا پروگرام بنایا۔ اس وقت بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کا رابطہ جیل میں مجلس عمل کے حضرات سے تھا۔ ان کی معرفت ہم نے ان کی رائے معلوم کی۔ انھوں نے کہا کہ اب کراچی میں گروپ بھیجنے کی بجائے لاہور میں ہی کام کیا جائے کیوں کہ لاہور اور پنجاب سے جو گروپ بھیجے جاتے تھے انھیں راستے ہی سے اُتار لیا جاتا تھا۔ غرض یہ کہ میں نے تحریک کو از سر نو منظم کرنے کا فیصلہ کیا اور ۲۸/فروری کو اعلان کیا کہ آج تک یہ مذہبی تحریک تھی اب یہ سیاسی تحریک بھی ہے۔

مولانا نیازی مسجد وزیر خان میں

......پھر میں مسجد وزیر خاں چلا گیا اور وہاں سے تحریک کو آگے بڑھایا اور تحریک پُرامن چلتی رہی۔ میں نے لوگوں کو ہدایت کی کہ مثبت نعرے لگائیں اور تصادم سے بچیں جب کہ حکومت یہ چاہتی تھی کہ تصادم ہو۔ اور میں نے تصادم کے سب راستے بند کر دیے۔ حکومت نے بہت کوشش کی کہ گڑبڑ پیدا کی جائے لیکن کامیاب نہ ہوسکی۔ اس تحریک میں جو آدمی بھی شریک ہوتا تھا وہ یہ طے کر کے آتا تھا کہ ناموس مصطفی ﷺ کے لیے جان دے گا۔ ہم نے طے کیا کہ اگر لاٹھی چارج ہوا تو لاٹھیاں کھاتے رہیں گے چناں چہ یہی ہوا لیکن مولانا خلیل صاحب نے مشورہ دیا کہ ایسے موقع پر سب زمین پر لیٹ جائیں، پولیس نے لوگوں کو اُٹھانا چاہا لیکن وہ نہ اُٹھے۔ ایک ڈی ایس پی نے ایک نوجوان کو ٹھوکر لگائی، اس کی بغل میں حمائل تھی اور وہ دُور

جا پڑی اور پھٹ گئی۔ کچھ نوجوان اس ڈی ایس پی کو دیکھ رہے تھے۔ اس دن تین جلوس روانہ کیے گئے تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس، سول سیکرٹریٹ اور ڈسٹرکٹ کورٹ کی طرف، یہ لوگ پُرامن طور پر واپس آگئے کچھ گرفتاریاں بھی ہوئیں۔ ڈی ایس پی کے ٹھوکر لگانے پر لوگ بپھر گئے۔ وہاں ایک آدمی تھا جس کا نام میں لینا نہیں چاہتا، اس نے دہلی دروازے کے باہر تقریر میں اس واقعہ پر لوگوں کو بھڑکا دیا۔ میرا ہیڈ کوارٹر مسجد وزیر خاں تھا ان کی اسکیم یہ تھی کہ اس شخص (مولانا نیازی) کو پکڑ کر لے جانے سے تحریک ختم ہو جائے گی چناں چہ انھوں نے مجھے دیکھا کہ کسی وقت میں اکیلا ہوتا ہوں، عصر کی نماز میں عام طور پر میں کام کی زیادتی کی وجہ سے آخری صف میں کھڑا ہوتا تھا۔ انھوں نے اسکیم بنائی کہ آدمی بھیج کر اسے اٹھوا لیا جائے۔ میں مسجد کے حجرے میں بیٹھا نوجوانوں کو ہدایات دے رہا تھا، ایک شخص آیا اور دیکھ کر واپس چلا گیا۔ میں نے نوجوانوں کو بتایا کہ یہ آدمی مشکوک نظر آتا ہے اس کا تعاقب کرو، نوجوان اس کے پیچھے گئے لیکن اسے پکڑ نہ سکے۔ اس کے کچھ دیر بعد ڈی ایس پی پولیس کا ایک جتھا لے کر وہاں آیا اور مسجد میں داخل ہونا چاہا۔ ہم نے مسجد کے باہر باقاعدہ پہرہ لگایا ہوا تھا اور کوڈ ورڈز (code words) سے اطلاعات دیتے تھے۔ رضا کاروں نے دروازے پر انھیں روک لیا اور ڈی ایس پی کو موقع پر ہی لڑکوں نے قتل کر دیا کچھ پولیس والے بھی زخمی ہو گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ گل پھر تشدد کیا جائے اور میں سمجھ گیا تھا کہ حکومت اپنی چال میں کامیاب ہوگئی ہے۔ ہمارا طریقہ یہ تھا کہ دن بھر تقریریں ہوتی تھیں اور رات کو بھی تقاریر کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ رات کو ایک ڈیڑھ بجے ہم لوگ مسجد سے ایک اور پوشیدہ محفوظ مقام پر منتقل ہو جاتے تھے، میں چوکنا ہو گیا تھا۔ میں نے ۴ تاریخ کو جلسے میں ایک قرارداد پاس کرائی کہ:

> جن لوگوں نے ڈی ایس پی کو قتل کیا ہے، انھوں نے بُرا کیا ہے اور وہ ہمارے آدمی نہیں۔ وہ حکومت کے آدمی ہیں اور اس طرح تحریک کو تباہ کرنا چاہتے ہیں اور ہماری پُرامن تحریک کو انتشار کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں اس لیے نوجوان پُرامن رہیں اور اس

تحریک کے دوران ڈیوٹی پر جو مسلمان ہلاک ہوں گے وہ شہید ہوں گے۔"

اور یہ قرارداد پاس ہوگئی۔صبح کو ہم نے پروگرام شروع کیا لیکن صبح تشدد کیا گیا اور بے تحاشہ فائرنگ کی گئی۔

قادیانی فوج کی وردی میں

قادیانی بھی فوج اور پولیس کی وردیوں میں آکر بے تحاشہ فائرنگ کرنے لگے۔ ہمارے نوجوان علماء نے اس موقع پر جو قربانیاں دیں انھیں سن کر یقیناً آپ دنگ رہ جائیں گے جب مسجد وزیر خان سے ہمارے دستے نکلتے تھے تو دہلی دروازے کے باہر چار نوجوانوں کی ڈیوٹی تھی۔انھوں نے ایک ایک کرکے چاروں کو گولی کا نشانہ بنادیا۔ہمارا ایک جلوس مال روڈ سے آرہا تھا اور اس کا نعرہ صرف لا الہ الا اللہ نعرۂ تکبیر اور نعرۂ رسالت تھے وہاں پر زبردست فائرنگ ہوئی۔وہاں پر نوجوان سینہ کھول کھول کر سامنے آئے اور جام شہادت نوش کرتے رہے۔یہ پانچ تاریخ کا واقعہ ہے۔چھ تاریخ کو جمعہ تھا انھوں نے یہ شرارت کی کہ ایک پوسٹر نکالا جس میں اعلان کیا گیا کہ آج نیازی جمعہ شاہی مسجد میں پڑھائیں گے تاکہ ہماری قوت بٹ جائے۔میں نے ایک جیپ کے ذریعے اعلان کیا اور اس پوسٹر کی تردید کی۔نتیجہ یہ ہوا کہ چھ تاریخ کو شاہی مسجد میں ہمارا کوئی آدمی نہیں گیا۔اسی دن مارشل لاء لگا دیا گیا۔ہماری تحریک کامیاب ہو چکی تھی۔صوبائی حکومت نے میرے پاس اسمبلی کے اسپیکر کو بھیجا اور کہلوایا کہ پنجاب کی حکومت آپ کے مطالبات حکومت کو پہنچائے گی اور آپ سے بات چیت کرے گی۔اس سے پہلے گورنر نے ان معاملات کو روکنے کے لیے بہت کوششیں کیں،ہم نے ان سے وعدہ کیا کہ تحریک پُرامن رہے گی اور آپ کو ہماری تحریک کو ختم کرنے کی کوششیں ختم کرنا ہوں گی۔

چھ تاریخ کی رات کو ہمارے آدمی خوف و ہراس کی وجہ سے اور بجلی کے نظام کے ختم ہوجانے کی وجہ سے نہیں آئے۔میں نے حاضرین کو بتایا کہ آپ کی تحریک کا محافظ اللہ ہے اور

مردانہ وار بڑھتے رہو چناں چہ ۷ تاریخ کو پورے اہتمام سے پروگرام جاری رکھے گئے اور بڑا
زبردست اجتماع ہوا۔ مسجد وزیرخاں کو میں نے ایک قلعہ قرار دیا جسے کوئی فتح نہیں کر سکتا۔
مارشل لاء کے باوجود ۷ اور ۸ کے جلسے ہوتے رہے۔ ان حالات میں ہم نے کسی اور جگہ مرکز
بنانے کے متعلق سوچا۔ ۹ تاریخ سے اسمبلی کا سیشن شروع ہو رہا تھا۔ اس لیے میں اس پوشیدہ
جگہ سے منتقل ہو گیا۔ ۹ تاریخ کو ہمارے دیگر ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ میرے خلاف ایک
مقدمہ قتل درج کر لیا گیا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ میں سیدھا اسمبلی میں داخل ہو جاؤں۔ میں نے
سوچا کہ لاہور سے باہر چلا جاؤں اور کوئی روپ دھار کر گاڑی میں آؤں اور سیدھا اسمبلی ہال میں
داخل ہو جاؤں۔ میں نے ۱۶ تاریخ کو اسمبلی میں شریک ہونے کا پروگرام بنایا۔ بہر حال اسمبلی
سیشن ۲۲ تاریخ تک کے لیے ملتوی ہو گیا۔ میں ریڑھی میں بیٹھ کر مسلح نوجوانوں کی حفاظت
میں لاہور سے نکل گیا۔ ہم بے شمار تکالیف کے بعد اوکاڑہ پہنچے، وہاں سے پاک پٹن شریف
گئے۔ ملٹری مجھے تلاش کرنے میں پوری طرح مصروف تھی۔ پاک پٹن سے میں قصور گیا۔ قصور
میں جن لوگوں کے ہاں میں رہا انھوں نے غداری کی اور ملٹری کو اطلاع کر دی۔ اگر مجھے آدھ
گھنٹہ مل جاتا تو میں اسمبلی گیٹ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ فوج
کے قبضے میں جانے سے پہلے اسمبلی میں تقریر کروں اور اپنی تحریک کے بارے میں پوری
تفصیلات بتا دوں، وہاں سے روانگی سے پہلے وہ آ گئے اور مجھے گرفتار کر کے قصور اسٹیشن لے
گئے۔ میرے ساتھ بشیر مجاہد بھی تھا، اسے بھی گرفتار کر لیا ہمیں قلعہ میں لایا گیا۔ ۲۳/مارچ سے ۹
اپریل تک ہم قلعہ میں رہے۔ مجھے ۱۰ نمبر کوٹھری میں بند کر دیا گیا اور سب معلومات حاصل
کیں۔ میرے بیان کے بعد ایس پی نے کہا کہ آپ کا مقصد تو ٹھیک تھا وہاں سے مجھے جیل
منتقل کیا گیا اور مجھے چارج شیٹ دی گئی۔ ملٹری کورٹ میں کیس چلا جو ۱۷/اپریل کو شروع
ہوا اور مئی تک چلتا رہا۔ مودودی صاحب کا کیس میرے بعد چلا، ۷/مئی کو ۹ بجے مجھے بلایا گیا اور
اسپیشل ملٹری کورٹ کا ایک افسر اور ایک کیپٹن میرے پاس آئے۔ مجھے ایک کمرے میں لے
گئے جہاں قتل کے کیس کے اور ملزم بھی تھے۔ قتل کا کیس ثابت نہ ہو سکا، دوسرا کیس بغاوت کا

تھا۔اس میں ثبوت کے لیے میری دو تقریریں تھیں لیکن ان میں بغاوت کا کوئی جملہ نہیں تھا۔ کیس ختم ہوگیا اور مجھے قتل کے کیس سے بری کر دیا تھا اور دوسرے کیس کے متعلق مجھے ایک آرڈر پڑھ کر سنایا "تمہیں گردن سے پھانسی پر چڑھایا جائے گا یہاں تک کہ تم مرجاؤ" میں نے یہ آرڈر لے لیا اور اس افسر نے مجھ سے کہا کہ اس پر دستخط کرو، میں نے کہا جب میں رسی کو چھوؤں گا تو اس پر دستخط کروں گا......میں جیل میں ہوں، آپ کے پنجوں میں ہوں، مجھے لے جاؤ اور پھانسی دے دو، میں دستخط کر دوں گا۔انھوں نے پھر کہا کہ دستخط کرو لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس پر وہ افسر بولا کہ ہمارے افسر ہم سے پوچھیں گے کہ تم نے نوٹس دے دیا یا نہیں؟ میں نے کہا اگر آپ کو اپنے افسران ہی کا خوف ہے تو میں آپ کی خاطر اس پر دستخط کیے دیتا ہوں۔میں نے بڑے اطمینان سے دستخط کر دیے اور تاریخ ڈال کر انھیں دے دیا اور کہا یہ تو کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے میں تو اس سے بھی زیادہ کے لیے تیار تھا۔اس وقت مجھے قرآن کریم کی یہ آیت یاد آئی:

"اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا"[1]

اور میں نے اس آیت سے یہ تاثر لیا کہ موت وحیات کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہے اور یہ لوگ میری زندگی کا سلسلہ منقطع نہیں کر سکتے اور اگر اس مقصد کے لیے جان جائے تو اس سے بڑی زندگی کیا ہو سکتی ہے!!!

......حقیقت یہ ہے کہ جو ایام میں نے جیل کی اس کوٹھری میں گزارے ان دنوں میری صحت اتنی اچھی ہوگئی کہ لوگ حیرت کرتے تھے۔...... ۲۳/مارچ ۱۹۵۳ء کو ہمیں گرفتار کیا گیا اور ۲۹/اپریل ۱۹۵۵ء کو ضمانت پر رہا ہوئے، یہ ہو گئے دو سال ایک ماہ اور چھ دن۔

اس وقت سارا ملک تحریک کی اہمیت سے آگاہ نہیں تھا، اب تحریک کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔اب قادیانیوں کے لیے یہودیوں کے ساتھ مل کر پاکستان کی تباہی کا پروگرام بنایا ہے اور حکومت کو آلۂ کار بنایا ہے۔اب ہوتا یہ ہے کہ الیکشن ہوں یا حکومت کے جلسے ہوں، وہ حکومت کی مفت کی فوج ہوتے ہیں۔ان کی کوشش یہ ہے کہ یہاں پر سیکولر نظام ہو۔اگر یہاں اسلامی

---

[1] پارہ ۲۹، سورۃ الملک، آیت نمبر ۲

نظام حکومت آجاتا ہے تو انھیں اپنی موت نظر آتی ہے۔ اس لیے ان کی کوشش یہ ہے کہ یہاں اسلامی ریاست قائم نہ ہو، اور پھر چوں کہ یہ لوگ مختلف شعبوں میں حاوی ہو گئے ہیں اس لیے ان کا فتنہ بڑھ رہا ہے اور لوگ اس سے بہ خوبی واقف ہو رہے ہیں۔ یہ بالکل طے شدہ بات ہے کہ اگر ملک بچ سکتا ہے تو نظریہ پاکستان سے اور نظریہ پاکستان کی حفاظت ایک جملے میں ادا کی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تحفظ عقیدۂ ختم نبوت۔ اس لیے اب جو تحریک چلے گی تو وہ علمی، تحقیقی تحریک ہوگی۔ اس لیے میں پُر امید ہوں کہ اب تحریک ایسی ہوگی جو پُر امن طور پر مجبور کر دے گی کہ حکومت کتاب وسنت پر عمل پیرا ہو اور کتاب وسنت کے الفاظ کا پاکستان کے آئین میں ہونا تحفظ ختم نبوت کے لیے بنیاد ہے۔

مولانا سید خلیل احمد قادری:

مولانا سید خلیل احمد قادری، مفسر قرآن حضرت مولانا ابوالحسنات سید احمد قادری ابن مولانا سید دیدار علی الوری محدث لاہوری رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ مجاز امام احمد رضا خاں قادری بریلوی قدس سرہ) کے اکلوتے فرزند اور اپنے والد محترم کی رحلت کے بعد تادم حیات تاریخی مسجد وزیر خاں (لاہور) کے خطیب رہے، مرکزی دار العلوم حزب الاحناف لاہور سے دستار فضیلت حاصل کی اور طب وحکمت میں اپنے والد ماجد کے مخصوص نسخوں اور طریق علاج کے امین رہے، آپ نے جوانی کے دور میں دینی تحریکوں میں حصہ لیا، "تحریک ختم نبوت 1953ء" میں ایک مجاہد کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے، گرفتار ہوئے، لاہور کے قلعہ کے عقوبت خانہ میں رہے، مارشل لاء نے انہیں سزائے موت کا حکم سنایا مگر ثابت قدم رہے، تحریک ختم نبوت میں ایک طویل عرصہ تک پس دیوار زنداں رہے، لاہور میں مسجد وزیر خاں کے پاس "جامعہ حسنات العلوم" قائم کیا، مسجد کی خطابت کو تادم زیست اپنایا، اپنے والد مکرم کی تفسیر قرآن "تفسیر الحسنات" کے آخری حصوں کو مکمل کیا اور انہیں چھپوایا۔ مولانا سید خلیل احمد قادری نے 27/ ذیقعد 1418ھ/ 27/ مارچ 1998ء بروز جمعہ لاہور میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا سید خلیل احمد قادری سے ایک تفصیلی انٹرویو معروف محقق جناب خلیل احمد رانا اور شفقت عثمانی نے لیا اور اوّل بار مختلف اقساط میں ماہ نامہ فیضان کے شمارہ اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں یہ انٹرویو ماہ نامہ کنز الایمان، لاہور کے "محاسبہ قادیانیت نمبر" میں شائع ہوا۔ اس انٹرویو میں مولانا خلیل احمد قادری نے تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کی رُوداد قدرے تفصیل سے بیان کی ہے لہٰذا قارئین کے افادہ کے لیے ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔

مولانا سید خلیل احمد قادری بیان کرتے ہیں:

مرزائیوں کی اشتعال انگیزی

1951ء کے اواخر ہی میں مرزائیوں کے اخبار الفضل (ربوہ) نے مرزا محمود بشیر کی نہایت اشتعال انگیز تقریروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، سر ظفر اللہ کے وزیر ہونے کے باعث مرزائی اپنے آپ کو بہت زیادہ طاقتور تصور کرنے لگے تھے اور وہ غالباً اس زعم میں بھی مبتلا ہو چکے تھے کہ پاکستان میں ان کے ناپاک عزائم کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی مؤثر قوت موجود نہیں ہے، چنانچہ الفضل نے سرخیاں جمائیں:

"جب تک اپنے دشمنوں کو قدموں پر نہ جھکا لو چین سے نہ بیٹھو"

"ہمارے پاس عسکری قوت موجود ہے"

"1953ء گزرنے نہ پائے گا کہ ہم اپنے مخالفین کو مجبور کر دیں گے کہ وہ ہمارے قدموں پر آ کر گریں"

ان اشتعال انگیز تحریروں سے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہوا اور ان کے سینوں میں ایک لاوا سا پکنے لگا جو ایک بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا مختلف شہروں سے علماء کرام اور دیگر حضرات وفود کی صورت میں میرے والد محترم مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کے پاس آئے اور انہوں نے مرزائیوں کے خلاف تحریک چلانے کا مطالبہ کیا، علماء اہل سنت کے علاوہ دیگر مکاتب فکر کے اکابر علماء مثلاً سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے قبلہ والد صاحب کو اس بات پر

رضامند کرنے کی کوشش کی کہ وہ مرزائیوں کے خلاف تحریک کی قیادت کریں، یہ سب حضرات اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ والد محترم قبلہ سید صاحب کے تحریک پاکستان میں مجاہدانہ کردار اور دیگر قومی وملی خدمات کے باعث ان کا سواد اعظم میں بہت زیادہ اثرورسوخ ہے، چنانچہ تمام مکاتب فکر کے زعماء نے ان سے تحریک ختم نبوت کی قیادت قبول کرلینے پر اصرار کیا۔ اور پھر برکت علی محمڈن ہال میں ایک عظیم الشان کنونشن کا اہتمام کیا گیا جس میں تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء شریک ہوئے، اس موقع پر جلسہ کی صدارت صاحبزادہ غلام محی الدین سجادہ نشین آستانہ عالیہ گولڑہ شریف نے فرمائی جو مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت کے پیش نظر پہلی بار عوامی اجتماع میں تشریف لائے تھے، تونسہ شریف اور علی پور شریف کے سجادہ نشین حضرات کے علاوہ ملک بھر سے جید مشائخ اس کنونشن میں شریک ہوئے۔

مجلس عمل کی تشکیل

اس کنونشن میں یہ طے پایا تھا کہ تمام مکاتب فکر کے نمائندوں پر مشتمل ایک مجلس عمل تشکیل دی جائے، چنانچہ اس موقع پر تمام جماعتوں نے ابوالحسنات علامہ سید محمد احمد قادری کو صدر منتخب کیا، سید داؤد غزنوی کو جنرل سیکرٹری کے فرائض سونپے گئے اور دیگر سرکردہ حضرات میں سید عطا اللہ شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین، شیخ حسام الدین اور صاحبزادہ فیض الحسن (مجلس احرار) شامل تھے، مجلس عمل میں جمعیت علماء پاکستان کے مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا غلام محمد ترنم اور حافظ خادم حسین، جمعیت اہل حدیث کے مولانا محمد اسماعیل اور مولانا عطاء اللہ حنیف، جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد، امین احسن اصلاحی اور نصر اللہ خاں عزیز، جمعیت علماء اسلام کے مولانا احمد علی لاہوری اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے علاوہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے لال حسین اختر اور محمد علی جالندھری شامل تھے، مرکزی تنظیم کے قیام کے بعد صوبائی اور ضلعی کمیٹیاں بنادی گئیں اور مختلف مقامات پر کنونشنوں کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہوگیا، ان کنونشنوں میں جو تین مطالبات حکومت کے سامنے رکھے گئے ان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے، ظفر اللہ سمیت تمام

قادیانیوں کو کلیدی آسامیوں سے ہٹانے اور ربوہ کو کھلا شہر قرار دینے پر زور دیا گیا تھا، پنجاب اور ملک کے دوسرے صوبوں میں جلسوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

1952ء میں مرکزی انجمن حزب الاحناف کا سالانہ اجلاس مسجد وزیر خاں میں شروع ہوا، نماز جمعہ کے بعد پہلی نشست سے حضرت علامہ ابوالحسنات نے خطاب کرنا تھا لیکن چند گھنٹے قبل اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب ممتاز دولتانہ نے دفعہ ۱۴۴ کے تحت جلسوں وغیرہ پابندی عاید کروادی، حضرت علامہ ابوالحسنات نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تقریر کی اور انہوں نے دولتانہ کو چیلنج کیا کہ وہ ختم نبوت کی حق آواز کو نہیں روک سکتے، انہوں نے نہایت پُر جوش انداز میں فرمایا:

> ''اگرچہ دولتانہ تحریک پاکستان میں ہمارے ہم سفر رہے ہیں لیکن آج کلمۂ حق بلند کرنے کے جرم میں وہ ہمیں بہ خوشی گرفتار کر سکتے ہیں ہم پاکستان کی بقاء اور استحکام کے لیے تحریک ختم نبوت کو جاری رکھیں گے''۔

دفعہ 144 کی کھلی خلاف ورزی کے باوجود انہیں گرفتار نہ کیا گیا اور سہ روزہ اجلاس بخیر وخوبی اختتام پذیر ہوا، اس کے بعد تحریک چلتی رہی اور اجتماعی جلسوں کا سلسلہ جاری رہا۔

خواجہ ناظم الدین سے ملاقات

1953ء کے اوائل میں مجلس عمل نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک وفد کی صورت میں خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان سے ملا جائے اور انہیں اپنے مطالبات اور ملکی صورت حال سے آگاہ کیا جائے، چنانچہ علامہ ابوالحسنات کی قیادت میں ایک وفد ترتیب دیا گیا جس میں مولانا عبدالحامد بدایونی، عطاء اللہ شاہ بخاری، سید داؤد غزنوی، صاحبزادہ فیض الحسن، ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین، سید مظفر علی شمسی اور مولانا محسن فقیہ شافعی شامل تھے، یہ وفد کراچی پہنچا اور وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کر کے قوم کے مطالبات ان کے سامنے رکھے گئے، خواجہ صاحب نے مطالبات کو سننے کے بعد کہا:

''میرے لیے ان مطالبات کو مان لینا بہت مشکل ہے کیونکہ اگر میں سر ظفر اللہ کو کیبنٹ سے نکال دوں تو امریکہ ناراض ہو جائے گا اور جو امداد پاکستان کو مل رہی ہے وہ بند ہو جائے گی۔''

قائدِ وفد علامہ ابوالحسنات نے جواباً فرمایا:

''ہم تو سمجھے تھے کہ آپ کا ناصر اور رازق اللہ تعالیٰ ہے لیکن آج معلوم ہوا کہ آپ سب کچھ امریکہ کو سمجھتے ہیں...... حکومت کو ہمارے مطالبات بہر حال منظور کرنا ہوں گے ورنہ ہمیں موجودہ تحریک کو ڈائریکٹ ایکشن کی طرف لے جانا پڑے گا، ہاں البتہ ہم آپ کو سوچنے کے لیے وقت دینے کو تیار ہیں، اس وقت تک ہم تحریک کو نرم رکھ سکتے ہیں۔''

راست اقدام کا فیصلہ اور قائدین کی گرفتاری

لیکن خواجہ ناظم الدین پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے واضح طور پر مطالبات کو منظور کرنے سے انکار کر دیا، اس کے بعد کراچی ہی میں مجلس عمل کا ایک اجلاس بلایا گیا جس میں متذکرہ وفد کے ارکان کے علاوہ مولانا مودودی اور مولانا احتشام الحق تھانوی بھی شامل تھے، اس اجلاس کی کئی نشستیں ہوئیں اور آخری نشست میں ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا گیا، 26ر فروری 1953ء کی شام کو نشتر پارک کراچی میں جلسہ عام کا اعلان کیا گیا، مولانا مودودی ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط کرنے کے بعد لاہور واپس آگئے اور 26ر فروری کی شام کو پروگرام کے مطابق نشتر پارک میں عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں مولانا مودودی اور مولانا احتشام الحق تھانوی کے علاوہ باقی تمام اکابرین نے تقاریر کیں، 26 اور 27ر فروری کی درمیانی شب کو جلسہ سے فارغ ہونے کے بعد یہ حضرات جب واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا، 27ر فروری کو جمعہ کے روز اکابرین کی گرفتاریوں کی خبر پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ مشتعل ہو کر سڑکوں پر نکل آئے، لاہور میں دلّی دروازہ کے باہر ایک بہت بڑا اجتماع ہوا اور مشتعل ہجوم نے مرزائیوں کے اداروں اور ان

کے مکانوں کو آگ لگانے کا پروگرام بنایا، نمازِ جمعہ ادا کرنے کے بعد میں مولانا غلام محمد ترنم اور حافظ خادم حسین کے ہمراہ اجتماع میں پہنچا اور ہم نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اعلیٰ سطح کی میٹنگ کے فیصلے کا انتظار کریں۔ 27 اور 28 رفروری کی درمیانی شب مولانا غلام محمد ترنم اور حافظ خادم حسین کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

مولانا مودودی سے ملاقات

اگلے روز 28 رفروری کو صبح نو بجے کے قریب میں مولانا مودودی سے ملاقات کر کے صورت حال کے متعلق مشورہ کرنے کے لیے ان کی اقامت گاہ پر پہنچا، مولانا عبدالستار خان نیازی بھی اس موقع پر موجود تھے، مولانا مودودی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے تحریک میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا، انہوں نے فرمایا:

''مولانا احتشام الحق تھانوی کا رات ٹیلی فون آیا تھا ڈائریکٹ ایکشن کی تجویز سے انہیں اور مجھے اتفاق نہیں تھا اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم تحریک میں حصہ نہ لیں''

میں نے عرض کی آپ کے تو دستخط موجود ہیں پھر یہ فیصلہ کیسا؟ مولانا نے جواباً فرمایا: وہ میٹنگ کا فیصلہ تھا، اب صورتِ حال مختلف ہے، بہر حال میں تحریک میں حصہ نہیں لے سکتا۔ مولانا عبدالستار خان نیازی نے اس موقع پر اُن سے کہا لوگ اس وقت بہت مشتعل ہیں اور وہ جذبات میں اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں کوئی ان کی قیادت کرنے والا نہیں، آپ مجلس عمل کے رکن ہیں، اگر اب آپ آگے نہیں آنا چاہتے تو ہمیں اختیار دیجئے تاکہ ہم تحریک چلا سکیں، مولانا مودودی ہمیں تحریری طور پر اختیارات دینے پر رضامند ہو گئے، مولانا داؤد غزنوی دل کے عارضہ میں مبتلا تھے، انہوں نے بھی ہمیں اختیارات لکھ کر دے دیے۔

مولانا احمد علی لاہوری سے ملاقات

اس کے بعد میں مولانا احمد علی لاہوری کے پاس گیا، انہوں نے کہا:

''میرا بستر بندھا ہوا رکھا ہے، مولانا ابوالحسنات میرے صدر ہیں، میں نے ان کو تار

دے دیا ہے اور ان کا جواب ملنے پر میں ان کے حکم کی تعمیل کروں گا۔"

اس کے جواب میں میں نے کہا، مولانا ابوالحسنات تو اس وقت جیل میں ہیں، نہ آپ کا تار انہیں پہنچے گا اور نہ ان کا جواب آپ کو ملے گا، لہٰذا اگر ٹالنا مقصود ہے پھر تو الگ بات ہے اور اگر آپ کا ارادہ عملاً حصہ لینے کا ہے تو آپ وعدہ فرمائیے، انہوں نے کہا میں تیار ہوں جو حکم مجھے دیا جائے گا میں اس کی تعمیل کروں گا۔

مفتی محمد حسن سے ملاقات

اس کے بعد میں مفتی محمد حسن (نیلا گنبد) کے پاس گیا تو انہوں نے اپنی معذوری ظاہر کی اور کہا میں ٹانگوں سے معذور ہوں اس لیے عملاً حصہ نہیں لے سکتا، میں نے ان سے کہا؛ جناب آپ معذور ضرور ہیں لیکن قیامت کے دن میرے آقا گنبد خضری کے مکین حوض کوثر پر جلوہ افروز ہوں گے اور آپ سے فرمائیں گے کہ میرے نام پر کھاتے رہے، عزت کرواتے رہے اور مفتی کہلواتے رہے لیکن جب میری ناموس کا مسئلہ آیا تو معذوری ظاہر کر دی، اس وقت آپ کیا جواب دیں گے؟ یہ سن کا مفتی صاحب کا چہرہ متغیر ہوگیا، انہوں نے میرے ہاتھوں کو پکڑ کر چوما اور پھر کہنے لگے، آپ مجھے جب چاہیں گرفتار کروا دیں، اگر آپ ابھی چاہیں تو میں اسی وقت آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔

اس گفتگو کے بعد میں وہاں سے دلی دروازہ کی طرف روانہ ہوا۔

مولانا غلام دین سے ملاقات

یہاں میں نے دیکھا کہ تقریباً ایک لاکھ افراد کا جم غفیر موجود تھا اور لوگ منتظر تھے کہ کوئی انہیں پروگرام بتائے، میں وہاں سے فوراً مولانا غلام دین صاحب خطیب انجمن لوکوشیڈ کے پاس پہنچا، اس وقت ظہر کا وقت تھا اور مولانا نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے، میں نے ان سے کہا؛ مولانا آپ کو آج ہی اور اسی وقت گرفتاری پیش کرنا ہے، مولانا نے بلا حیل وحجت فرمایا "نماز پڑھ لوں یا پہلے چلوں" میں نے عرض کی وہاں لوگ منتظر ہیں، نماز آپ وہیں پڑھیں اور تقریر کے بعد

جلوس کی قیادت کرتے ہوئے چیئرنگ کراس پہنچ کر گرفتاری دیں، مولانا نے گھر پر اطلاع دے دی اور فوراً میرے ساتھ دہلی دروازہ کی طرف روانہ ہو لیے، وہاں پہنچ کر انہوں نے نماز ظہر پڑھائی اور ایک نہایت ایمان افروز تقریر فرمائی، اس کے بعد انہوں نے ایک عظیم الشان جلوس کی قیادت کرتے ہوئے چیئرنگ کراس پہنچ کر گرفتاری دے دی۔

مسجد وزیر خاں میں رضا کاروں کا اجتماع

اسی روز شام کو مسجد وزیر خاں میں رضا کاروں کا اجتماع شروع ہو گیا، میں بھی بستر لے کر مسجد وزیر خاں پہنچ گیا اس کے بعد پروگرام کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا کہ صبح دس بجے مسجد وزیر خاں میں اجلاس ہوتا اور دس رضا کار جلوس کے ساتھ گرفتاریاں پیش کرتے اور نماز ظہر کے بعد دہلی دروازہ کے باغ سے (جو اس وقت اکبری دروازہ تک پھیلا ہوا تھا) دس رضا کار گرفتاریاں پیش کرتے، روزانہ گرفتاریاں پیش کرنے والوں کی قیادت کوئی ایک عالم دین کرتا تھا، مولانا عبدالستار خان نیازی اور مولانا بہاء الحق قاسمی (والد معروف کالم نگار عطاء الحق قاسمی) بھی میرے ساتھ مسجد وزیر خاں میں تھے، 29 رفروری کو مولانا احمد علی لاہوری نے دہلی دروازے کے اجلاس میں تقریر کر کے گرفتاری پیش کی۔

ظفر علی خاں کے صاحبزادے اور "زمیندار" کے ایڈیٹر اختر علی (جو کہ مجلس عمل کے خازن بھی تھے) نے پہلے تو تحریک کی پُر زور حمایت کی لیکن جب دولتانہ وزارت کی طرف سے ان پر دباؤ ڈالا گیا تو ان کا رویہ بدل گیا، عوام نے "زمیندار" کی کاپیاں جلا کر احتجاج کیا، اور پھر 30 فروری کی شام کو مشتعل ہجوم نے ان کا گھیراؤ کر لیا، انہوں نے جان بچانے کے لیے برقعہ پہنا اور گھر کے پچھلے دروازے سے نکل کر مسجد وزیر خاں پہنچ گئے اور اگلے روز انہوں نے بھی تقریر کر کے گرفتاری پیش کر دی۔

مارچ کے پہلے ہفتے میں رضا کاروں کا ایک جلوس دہلی دروازے سے حسب معمول نکلا اور جب یہ جلوس برانڈرتھ روڈ پہنچا تو پولیس نے بلا جواز سخت تشدد کیا جس کے باعث بہت سے

رضا کار شدید زخمی ہو گئے، ہم نے مسجد وزیر خاں میں ڈسپنسری کا انتظام پہلے سے ہی کر رکھا تھا، چنانچہ ان کا علاج شروع ہو گیا، اسی دوران شہر میں یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ ڈی ایس پی فردوس شاہ نے قرآن پاک کی توہین کی ہے، چنانچہ اگلے روز ظہر کے اجلاس میں ایک صاحب نے مجمع عام میں قرآن پاک کے پھٹے ہوئے اوراق پیش کیے، جس سے لوگوں میں اشتعال پیدا ہوا اور ان کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا۔

فردوس شاہ ڈی ایس پی کا قتل

چوک وزیر خاں کے قریب پولیس کا ایک سپاہی کشمیری بازار کی طرف سے آرہا تھا، لوگوں نے اسے گھیر لیا، اس نے جان بچانے کے لیے ایک قریبی مکان میں پناہ لی، جب وہ کھڑکی سے باہر سر نکالتا تو لوگ نعرے لگاتے، یہ خبر ڈی ایس پی فردوس شاہ تک پہنچی تو وہ اس سپاہی کو بچانے کے لیے ایک گارڈ کے ہمراہ چوک وزیر خاں کی طرف چلا، اور پھر اس کا ایک مشتعل جلوس سے آمنا سامنا ہو گیا، کسی شخص نے زور سے کہا کہ یہی وہ شخص ہے، جس نے قرآن پاک کی توہین کی ہے، اتنا سننا تھا کہ پورا جلوس اس پر پل پڑا اور اس کو وہیں قتل کر دیا گیا، درحقیقت یہ ساری واردات حکومت نے ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت کروائی تھی، کیونکہ دولتانہ وزارت چاہتی تھی کہ اسے تشدد کا کوئی بہانہ ہاتھ آئے تاکہ تحریک کو کچلا جا سکے، چنانچہ اس واقعہ کے بعد وسیع پیمانے پر تشدد کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اور رات بھر گولیاں چلنے کی آوازیں آتی رہیں، فردوس شاہ کے قتل کے بعد کرفیو لگا دیا گیا تھا لیکن ہم نے مسجد وزیر خاں کا اجلاس جاری رکھنے اور بدستور گرفتاریاں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

حکومت کی اشتعال انگیز کارروائی

اسی روز مولانا غلام محمد ترنم، مولانا غلام دین، حافظ خادم حسین صاحب اور مولانا احمد علی لاہوری کو ہتھکڑیاں لگا کر لاہور سے ملتان لے جانے کے لیے اسٹیشن پر لایا گیا، جس سے عوام کا اشتعال اور زیادہ بڑھ گیا، رات کو مسجد وزیر خاں میں میری صدارت میں ایک اجلاس ہوا جس میں

فردوس شاہ کے قتل اور حکومت کی اشتعال انگیز کارروائیوں کی مذمت کی گئی۔

تحریک کی نظامت اس وقت میرے پاس تھی، حکومت کے کچھ نمائندے میرے پاس آئے اور انہوں نے دورانِ گفتگو بتایا کہ دولتانہ حکومت نے آپ کے مطالبات منظور کر لیے ہیں اس لیے آپ تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیں، میں نے جواباً انہیں یہ بتایا کہ تحریک کی باگ ڈور اور اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار ان لوگوں کے پاس ہے جو کراچی اور سکھر جیل میں محصور ہیں لہذا آپ ان سے رابطہ قائم کیجئے، اگر انہوں نے ہمیں تحریک ختم کرنے کا حکم دے دیا تو ہم کوئی پس وپیش نہیں کریں گے، بصورت دیگر ہم پوری قوت کے ساتھ مطالبات منوانے کے لیے جدو جہد جاری رکھیں گے، اس کے بعد حکومت کے نمائندے مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

3/ مارچ کو مسجد وزیر خاں میں مسلم لیگ کی کچھ خواتین آئیں، انہیں دراصل ایک سازش کے تحت بھیجا گیا تھا تاکہ کوئی ہنگامہ آرائی ہو اور تشدد کرنے کا بہانہ ہاتھ آسکے لیکن ہم نے عوام پر کنٹرول کرتے ہوئے ان خواتین کو مسجد سے محفوظ جگہ تک پہنچا دیا اور اس طرح حکومت کی سازش ناکام ہو کر رہ گئی، مسجد وزیر خاں میں ہر روز بعد نماز عشاء بھی جلسہ عام کا اہتمام ہوتا تھا جس میں بڑی ایمان افروز تقاریر ہوتیں، 5/ مارچ تک تحریک نے پورے پنجاب میں زور پکڑ لیا تھا سندھ اور سرحد میں بھی ہنگاموں کا سلسلہ جاری تھا، 4/ مارچ 1953ء کو سارا دن گولیاں چلنے کی آوازیں آتی رہیں، جس مکان سے ختم نبوت کی آواز بلند ہوتی اس کے مکینوں کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا جاتا، 4/ مارچ کی رات کو مسجد وزیر خاں کے اجلاس میں ہم نے "پہیہ جام ہڑتال" کا اعلان کر دیا، انتہائی مختصر نوٹس کے باوجود اس اپیل کے نتیجے میں اگلے روز ایسی شاندار ہڑتال ہوئی کہ اس کی مثال نہیں ملتی، حتیٰ کہ اخبارات میں خبر پڑھنے کے بعد گورنمنٹ ہاؤس سیکرٹریٹ کے سرکاری ملازمین نے بھی قلم چھوڑ دیے، کسی بس یا ٹرک کا تو ذکر ہی کیا تانگہ یا رکشہ تک نظر نہ آتے تھے، غرضیکہ اس ہڑتال نے حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔

رضا کاروں کی شہادتیں

5 رمارچ کی شام کو پورے ملک میں ایک عجیب سناٹا تھا عورتیں، بچے، بوڑھے سبھی میدان میں نکل آئے تھے، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، راولپنڈی اور سندھ کے بہت سے علاقوں میں تھانوں پر شمع ختمِ نبوت کے پروانوں نے قبضہ کرلیا تھا، دولتانہ کی صوبائی اور خواجہ ناظم الدین کی مرکزی حکومت بالکل بے بس ہوکر رہ گئی تھی، اسی روز پولیس نے دہلی دروازے کے اجلاس پر پابندی عاید کردی اور لوگوں کو اس میں شرکت سے روکا، جب پولیس کو کامیابی نظر نہ آئی تو اس نے گولی چلادی، اس موقع پر محمد عربی ﷺ کے غلاموں نے سینے تان تان کر گولیاں کھائیں اور جام شہادت نوش کیا، مسجد وزیر خاں زخمیوں اور شہداء سے بھر چکی تھی، زخمیوں کی مرہم پٹی اور شہداء کے کفن دفن کا انتظام بڑی سرگرمی سے جاری تھا، ایک عجیب منظر تھا، ہر طرف خون میں نہائے ہوئے نوجوان لیٹے تھے، اس موقع پر عوام کے تعاون کا یہ عالم تھا کہ خوراک اور مالی امداد کے علاوہ جس چیز کی بھی اپیل کی جاتی فوراً مہیا ہوجاتی، زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کے لیے کثیر تعداد میں ڈاکٹر اور ڈسپنسر پہنچ چکے تھے اور انہوں نے رضا کارانہ طور پر تمام خدمات انجام دیں، اس روز تقریباً چالیس (40) مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا اور سینکڑوں کی تعداد میں زخمی ہوئے، شہداء کو تدفین کے لیے جلوس کی شکل میں قبرستان میانی صاحب اور دیگر قبرستانوں میں لے جایا گیا، دو شہداء کی قبریں سنہری مسجد کشمیری بازار کے عقب میں بنادی گئیں، اس وقت ملت اسلامیہ کے جوش و جذبے کا یہ عالم تھا کہ انہیں مرنے مارنے کے سوا کچھ نہیں سوجھ رہا تھا، ہماری طرف سے لوگوں کو پُرامن طور احتجاج کرنے کی اپیلیں مسلسل جاری کی جارہی تھیں۔

دولتانہ وزارت نے اس موقع پر ایک اور چال چلی کہ ہوائی جہاز کے ذریعے اشتہارات پھینکے گئے کہ حکومت نے مطالبات منظور کر لیے ہیں اور تحریک ختم ہوگئی ہے لیکن یہ چال بھی کامیاب نہ ہوسکی اور عوام حکومت کے ہتھکنڈے کو فوراً سمجھ گئے۔

6 رمارچ کو جنرل اعظم کی قیادت میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا، یہ مارشل لاء انتہائی سخت تھا اور ریڈیو سے دھمکی آمیز اعلانات نشر ہو رہے تھے، دن کے بارہ بجے ریڈیو پاکستان سے اعلان ہوا:

"مولانا عبدالستار خاں نیازی اور مولانا خلیل احمد قادری اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیں ورنہ انہیں دیکھتے ہی گولی ماردی جائے گی۔"

مولانا عبدالستار خان نیازی پر ایک بہتان کی تردید

مولانا عبدالستار خان نیازی اس وقت صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے اور ہماری خواہش تھی کہ وہ اس مسئلہ پر اسمبلی میں تقریر کریں، اسمبلی کا اجلاس چند روز میں ہی شروع ہونے والا تھا، چنانچہ ہم نے مولانا عبدالستار خان نیازی کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے آپ کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیں، مولانا نیازی نے اس تجویز سے اتفاق کیا، مولانا نیازی چند افراد کے ہمراہ مسجد کے مغربی اور جنوبی مینارہ سے متصل مکان میں منتقل ہوئے اور پھر دیہاتیوں کا سا لباس پہن کر لاہور سے باہر چلے گئے، اس موقع پر تحریک دشمن عناصر نے یہ افواہیں پھیلائیں کہ مولانا نیازی دیگ میں بیٹھ کر گئے ہیں اور یہ کہ انہوں نے داڑھی منڈوالی ہے، یہ افواہیں صرف تحریک کو ناکام بنانے کے لیے پھیلائی گئیں اور پولیس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے انہیں ہوا دی حالانکہ ان باتوں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

6 رمارچ کو مسجد وزیر خاں میں تقریباً تین چار ہزار رضا کار موجود تھے، مسجد میں پروگرام کے مطابق اجلاس ہوتے رہے اور 5، 6 رضا کار گرفتاریاں پیش کرتے رہے، 7 مارچ کو نماز ظہر کے بعد مسجد میں اجلاس ہو رہا تھا اور رضا کار جلوس کی تیاری کر رہے تھے کہ مسجد سے متصل سڑک پر جنرل محمد ایوب خاں (جو بعد میں سربراہ مملکت بھی بنے) چند دیگر فوجی افسران کے ہمراہ آئے اور انہوں نے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اعلان کیا کہ مولانا خلیل احمد قادری اور مسجد کے اندر موجود تمام رضا کار خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیں ورنہ ہم انہیں مسجد کے اندر داخل ہو کر گرفتار کر لیں گے اور اس طرح جو کشت و خون ہوگا اس کی ذمہ داری انہی افراد پر ہوگی، اس

کے جواب میں میں نے لاؤڈ اسپیکر پر تقریر کی اور حضرت امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ پیش کیا کہ جب بادشاہِ وقت نے اپنی بیگم زبیدہ کو ان الفاظ میں مشروط طلاق دی کہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے میری سلطنت سے باہر چلی جاؤ ورنہ تم پر میری طلاق ہو جائے گی، غصے کے عالم میں تو بادشاہ نے یہ بات کہہ دی لیکن جب غصہ ختم ہوا تو وہ پریشان ہو گیا اور اس نے علماء سے فتویٰ پوچھا، علماء نے جواب دیا کہ حدودِ سلطنت سے نکلنا لازم ہے ورنہ طلاق ہو جائے گی، حضرت امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو آپ نے سارا واقعہ سننے کے بعد فرمایا کہ بادشاہ سے کہو وہ بے فکر ہو جائے سورج غروب ہونے سے پہلے اس کی بیگم اس کی حدود سے نکل جائے گی اور یہ شرط پوری ہو جانے کے بعد طلاق نہیں ہو گی، سورج غروب ہونے میں چند گھنٹے باقی رہ گئے تو بادشاہ بہت گھبرایا اور اس نے اپنے نمائندے دوبارہ امام صاحب کی خدمت میں بھیجے، آپ نے فرمایا کہ بیگم کو مسجد میں لے آؤ اور علماء سے پوچھ لو کہ مسجد بادشاہ کی حدودِ مملکت سے باہر ہے یا نہیں؟ چنانچہ بیگم صاحبہ کو مسجد میں لایا گیا اور تمام علماء نے بالاتفاق یہ فیصلہ دے دیا کہ مسجد اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی مملکت نہیں ہے، اور اس طرح طلاق نہیں ہوئی، اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد میں نے کہا کہ مسجد خانۂ خدا ہے اور اگر مارشل لاء حکام نے مسجد میں قدم رکھنے کی کوشش کی تو اس کا بڑی سختی سے جواب دیا جائے گا اور تمام تر ذمہ داری فوجیوں پر عائد ہو گی، میں نے یہ بھی کہا کہ فوج اور پولیس کو مسلمانوں پر گولیاں چلانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، ایک مسلمان کا خون دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کے بعد خدا کے فضل و کرم سے فوجی افسران کسی کارروائی کے بغیر ہی واپس چلے گئے، اس موقع پر یہ بات بھی سننے میں آئی کہ ایک مرزائی فوجی افسر نے مسجد کو ڈائنامیٹ سے اُڑا دینے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن وہ ناکام رہا اور یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا، اس روز بھی حسب معمول جلسہ ہوا اور رضاکاروں نے گرفتاریاں پیش کیں۔

ریڈیو اور اخبارات پر حکومت کا مکمل کنٹرول تھا اور ہمارے خلاف مسلسل پروپیگنڈا کیا

جارہا تھا،لیکن اس موقع پر مولانا سید محمود احمد رضوی (لاہور) اوران کے رفقاء نے تحریک کی حمایت میں اشتہارات سائیکلو سٹائل کر کے شہر کے مختلف حصوں میں لگانے کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی،حکومت نے مسجد وزیر خاں میں کچھ ایسے افراد بھیج دیے تھے جو رضا کاروں کے حوصلے پست کرنے کے لیے سرگرم عمل تھے۔

8رمارچ کو فجر کی نماز کے بعد جب کرفیو کھلا تو میں نے ایک مختصر سی تقریر کی اور اعلان کیا کہ ہم لوگ ناموس مصطفٰی کی خاطر اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں لہٰذا جو شخص اپنے دل میں ذرا سی بھی کمزوری محسوس کرتا ہے اسے میری طرف سے اجازت ہے وہ جاسکتا ہے:

وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

میری تقریر کے بعد مسجد میں صرف ڈیڑھ ہزار جاں نثار رہ گئے اور باقی سب گھروں کو چلے گئے،اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مسجد وزیر خاں کی بجلی اور پانی بند کر دیا گیا تھا اور خوراک کے تمام راستے بھی مسدود تھے،لیکن ہمارے پاس مسجد کے حوض میں پانی کا کافی ذخیرہ موجود تھا، اس کے علاوہ گڑ اور چنے کی بوریاں ہم نے پہلے سے ہی مسجد میں محفوظ کرلی تھیں، چنانچہ یہ خوراک استعمال کی گئی،امیر الدین قدوائی ایڈووکیٹ دوپہر کے وقت میرے پاس آئے اور انہوں نے گورنر پنجاب نواب چندریگر کا یہ پیغام مجھے دیا کہ وہ مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، میں نے مسجد سے باہر نکلنے سے انکار کر دیا اور وہ واپس چلے گئے۔

8رمارچ کی شام کو رنگ محل،شیرانوالہ گیٹ اور موچی دروازہ سے مسجد تک ریت کی بوریاں چن دی گئیں اور خاردار تار بچھا دیے گئے تاکہ نہ تو کوئی مسجد کے اندر آسکے اور نہ کوئی واپس جاسکے، مسجد کے شمالی اور مغربی حصے کے مکانات خالی کروا کر ان پر سٹین گنیں اور دیگر ہتھیار نصب کر دیے گئے،رات بھر مسجد میں ذکر الٰہی جاری رہا،نعرہ ہائے تکبیر ورسالت اور "ختم نبوت زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے فضاء میں گونجتے رہے۔

مولانا سید خلیل احمد قادری کی رضا کارانہ گرفتاری

9رمارچ کو صبح دس بجے امیر الدین قدوائی ایڈووکیٹ میرے پاس دوبارہ تشریف لائے، موصوف تحریک پاکستان کے راہنما اور قبلہ والد صاحب کے دوست تھے، انہوں نے مجھے کہا کہ سارے شہر میں فوج کا کنٹرول ہو چکا ہے اور اگر آپ نے مزاحمت جاری رکھی تو جانوں کا بھی نقصان ہوگا اور مسجد کی بے حرمتی کا بھی خطرہ ہے، قدوائی صاحب سے گفتگو کے بعد میں نے رضا کاروں سے مشورہ کیا تو فیصلہ ہوا کہ سب سے پہلے میں اپنی گرفتاری پیش کر دوں، چنانچہ میں گرفتاری پیش کرنے کے لیے قدوائی صاحب کے ہمراہ مسجد کے جنوبی دروازے سے باہر آیا، ایک کرنل، دو کیپٹن اور کثیر تعداد میں فوجی باہر موجود تھے، انہوں نے پستول اور ریوالور ہماری طرف کر کے ہم کو گھیرے میں لے لیا، میں ہنس پڑا اور میں نے ان سے کہا: میں تو خود گرفتاری پیش کر رہا ہوں، اتنے تکلف کی کیا ضرورت ہے، کرنل نے جواب دیا آپ ہم کو مسلمان نہیں سمجھتے، آپ نے مسجد میں اسلحہ جمع کر رکھا ہے اور میناروں پر پوزیشن لی ہوئی ہے اس لیے یہ کچھ کرنا پڑا، میں نے اس کرنل کو کہا: اگر آپ مرزائی ہیں تو پھر یقیناً مسلمان نہیں اور اگر مسلمان ہیں تو پھر کسی مسلمان کو غیر مسلم سمجھنا بہت بڑا ظلم ہے، رہا مسجد میں پوزیشن سنبھالنے اور اسلحہ جمع کرنے کا سوال تو یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی، دروازے کھلے ہیں اور آپ اندر جا کر دیکھ سکتے ہیں، اس پر وہ ہنس پڑا اور اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا، قدوائی صاحب بھی میرے ہمراہ تھے، کپڑے جو میں نے پہن رکھے تھے کافی پھٹ چکے تھے، کیونکہ 28رفروری کو مسجد میں منتقل ہونے کے بعد مجھے گھر جانے کا موقع نہیں مل سکا تھا، جب مجھے خرادی محلہ کی طرف لایا گیا تو میں نے فوجیوں سے کہا کہ میرا مکان قریب ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں کپڑے تبدیل کرلوں، کرنل نے رضامندی ظاہر کر دی، لیکن جب ہم چند قدم آگے آئے تو کرفیو کے باوجود عورتیں، مرد اور بچے گھروں سے باہر نکل آئے اور انہوں نے نعرے لگانے شروع کر دیے، اس صورت حال کو دیکھ کر کرنل نے مجھے کہا اب آپ ہمارے ساتھ چلیں کپڑے ہم

بعد میں آپ کو منگوا دیں گے، چوہٹہ مفتی باقر سے ہمیں پرانی کوتوالی لایا گیا، یہاں تک ہم پیدل ہی آئے۔ پرانی کوتوالی میں فوجیوں نے بڑے بڑے وائرلیس لگا رکھے تھے انہوں نے وائرلیس پر اپنے ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی کہ ملزم کو پکڑ لیا گیا ہے اور اسے ہم لے کر آرہے ہیں، پھر ہمیں پرانی کوتوالی سے دہلی دروازے تک پیدل ہی لایا گیا، ہمیں زیر حراست دیکھ کر لوگ مکانوں کی چھتوں سے نعرے لگانے لگے۔ دہلی دروازے سے جیپ میں بٹھا کر شاہی قلعہ کی طرف لے جایا گیا۔

مارشل لاء حکام کی تفتیش

مارشل لاء حکام کو ہماری گرفتاری کی اطلاع تو ہو ہی چکی تھی، شاہی قلعہ میں داخل ہوئے تو عام خاص دربار کے بالائی حصے میں تین چار لمبے لمبے قد والے فوجی افسران کو بیٹھے ہوئے دیکھا، پھر وہ نیچے آئے میز اور کرسیاں بچھائی گئیں اور وہ فوجی افسران کرسیوں پر بیٹھ گئے (غالباً ایک فوجی افسر کا نام سرفراز تھا)۔ مجھے بھی کرسی پر بیٹھنے کو کہا گیا، قدوائی صاحب میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے، ایک فوجی افسر نے سب سے پہلا سوال مجھ پر کیا کہ کیا آپ غیر ملکی ایجنٹ ہیں اور یہ تحریک کسی ملک کے ایما پر چلائی جا رہی ہے؟ میں نے جواباً کہا 1947ء میں تحریک پاکستان کی حمایت میں خضر وزارت کے خلاف جو ایجی ٹیشن ہوا تھا کیا وہ بھی غیر ملکی سازش تھی؟ جن لوگوں نے اس تحریک میں گرفتاریاں پیش کیں کیا وہ بھی غیر ملکی ایجنٹ تھے؟ ہماری تحریک تو ان لوگوں کے خلاف ہے جو غیر ملکی ایجنٹ ہیں اور مذہبی اور سیاسی لحاظ سے پاکستان کے دشمن ہیں، ان لوگوں نے بانی پاکستان قائداعظم کی نماز جنازہ تک پڑھنے سے گریز کیا، آج یہ لوگ ملک کے کلیدی عہدوں پر فائز ہو گئے ہیں، ہم نے یہ تحریک ان کو کلیدی عہدوں سے علیحدہ کرنے کے لیے چلائی ہے۔

پھر اس فوجی افسر نے دوسرا سوال کیا کہ کیا آپ قادیانیوں کو مسلمان نہیں سمجھتے؟ میں نے جواب دیا "نہیں"۔ اس نے پوچھا کیوں؟ میں نے جواب دیا سرکار دو جہاں ﷺ کے بعد

نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور قادیانیوں نے ایک ''بنا سپتی نبی'' پیدا کر لیا ہے اور ان کا فقہ بھی مسلمانوں سے علیحدہ ہے، ضابطہ اخلاق بھی جدا ہے اور سیاسی نظام بھی مختلف ہے، اس نے پوچھا فقہ کیسے علیحدہ ہے؟ میں نے جواباً کہا زانی کو ہم مسلمان حکم قرآنی کے مطابق کوڑوں کی سزا کا حق دار سمجھتے ہیں اور قادیانیوں نے زنا کی سزا دس جوتے مقرر کی ہے جو زانیہ زانی کو لگاتی ہے، اس طرح قادیانیوں نے زنا کا بھی دروازہ کھول دیا ہے، یہ جواب سن کر تو وہ آگ بگولہ ہو گیا اور اس نے انگریزی میں گالیاں دینی شروع کر دیں۔

''پورا ملک قادیانیوں کا ہے''

قدوائی صاحب نے اسے ٹوکا تو دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہو گئی، فوجی افسر نے قدوائی صاحب کو کہا، اب تم بھی اپنے آپ کو گرفتار سمجھو میں تمہارے ساتھ نپٹ لوں گا، قدوائی صاحب نے اس سے پوچھا کیا آپ قادیانی ہیں؟ اس نے جواب دیا: پورا ملک قادیانیوں کا ہے، اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا، تقریباً ایک بج چکا تھا اور ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی تھی، پھر کرسیاں اُٹھالی گئیں اور ہم نیچے فرش پر بیٹھ گئے، چاروں طرف پٹھان فوجی ہماری نگرانی کر رہے تھے، اسی دوران ظہر کا وقت ہو گیا اور ہم نے وضو کے لیے پانی مانگا، ہمیں شمالی حصے میں لایا گیا جہاں نلکا لگا ہوا تھا، وہاں سے وضو کرنے کے بعد میں نے اذان دی، اذان کی آواز سن کر کچھ فوجی اور کچھ رضا کار جو پہلے ہی گرفتار ہو کر آئے ہوئے تھے، نماز پڑھنے کے لیے آ گئے، چنانچہ میں نے امامت کروائی اور سب نے باجماعت نماز ادا کی، نماز کے بعد میں نے خشوع وخضوع کے ساتھ دعا کی، دعا کے بعد فوجی میرے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے مجھ سے گرفتاری کی وجوہات پوچھیں، میں نے قادیانیوں کا پول کھولا اور تحریک کا پس منظر بیان کیا، میری باتیں سن کر فوجیوں نے اپنی چادریں بچھا دیں اور نہایت محبت کے ساتھ پیش آئے، ایک فوجی میس (Mess) میں گیا اور ہمارے لیے کھانا لے آیا، پھر ہم نے نماز عصر بھی اسی طرح باجماعت ادا کی، نماز عصر کے بعد پہلے فوجیوں کی ڈیوٹیاں تبدیل کر دی گئیں اور نئے فوجی آ گئے، انہوں نے پھر ہمیں نیچے بٹھا

دیا اور نہایت سختی کا مظاہرہ کیا، ملنے تک کی ممانعت تھی، نماز مغرب کا وقت ہوا تو میں نے پھر اسی طرح اذان دی اور باجماعت نماز ادا کرنے کے بعد دعا میں مشغول ہوگیا، یہ نئے فوجی بھی دعا سے بڑے متاثر ہوئے انہوں نے بھی ہم سے سوالات کیے، ہم نے تفصیلات بتائیں تو ان کا رویہ فوراً بدل گیا اور وہ بڑے اخلاق کے ساتھ پیش آئے، نماز مغرب کے بعد مجھے اور قدوائی صاحب کو جیپ میں بٹھا کر مغربی حصے میں واقع سی آئی اے کے دفتر میں لایا گیا، جہاں ہمارا نہایت فحش اور غلیظ گالیوں سے استقبال ہوا، قدوائی صاحب کو مجھ سے علیحدہ کر دیا گیا اور مجھے اوپر کے حصے میں لے جا کر ایک چھوٹی سی حوالات میں بند کر دیا گیا جس میں پانی کا کوئی انتظام نہیں تھا، رات کو مجھے کھانا بھی نہیں دیا گیا اور میں بھوکا ہی سو گیا۔

حوالات کے قریب کوئی سپاہی نہیں تھا جس سے پانی مانگا جا سکے، چنانچہ اگلے روز فجر کے وقت میں نے تیمم کر کے نماز ادا کی، نماز کے بعد میں نے قدوائی صاحب کی آواز سنی جس سے اندازہ ہوا کہ وہ نچلے حصے کی حوالات میں ہیں، تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص ایک کپ چائے اور ایک چھوٹی سی روٹی رکھ کر چلا گیا، میں نے اسے غنیمت جان کر ناشتہ کیا، دس گیارہ بجے کے قریب سی آئی اے کا ایک افسر آیا اور مجھے حوالات سے نکال کر اپنے دفتر میں لے آیا، چھوٹے قد کے اس افسر کا نام غالباً چوہدری اصغر تھا، اس نے مولانا عبدالستار خاں نیازی کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی، میں نے لاعلمی کا اظہار کیا، درحقیقت مجھے اس وقت مولانا کے متعلق کچھ علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں، جب میں کچھ نہ بتا سکا تو اس نے مغلظات سنانا شروع کر دیں، کچھ دیر تو میں خاموشی سے سنتا رہا لیکن پھر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اس سے کہا وہ میرے بزرگوں کے متعلق ایسے الفاظ استعمال نہ کرے ورنہ نتیجہ اچھا نہ ہوگا، یہ بات سننے کے بعد وہ بکتا ہوا چلا گیا اور مجھے ایک دوسری حوالات میں تنہا بند کر دیا گیا، شام کے وقت سی آئی اے کا ایک اور افسر آیا اور اس نے دفتر میں لے جا کر قدرے نرمی سے تحریک کے متعلق سوالات پوچھے جس کے میں نے مناسب جوابات دیے، پوچھ گچھ کا یہ سلسلہ تقریباً 15 رمارچ تک جاری رہا، اس دوران مجھے قید تنہائی میں ہی رکھا گیا، دوپہر اور شام کو دال روٹی دی جاتی، ایک روز مجھے جب حوالات میں بند کرنے کے

لیے لے جایا گیا تو متصل حوالات میں مفتی محمد حسین نعیمی نظر آئے، ہم دور سے ہی ایک دوسرے کو سلام کر سکے اس سے زیادہ کی اجازت نہ تھی، مجھے بعد میں علم ہوا کہ گرفتاری کے اگلے روز ہمارے مکان پر چھاپہ مارا گیا، اس زمانے میں جمعیت علمائے پاکستان کا مرکزی دفتر ہمارے گھر میں ہی تھا، مرزائیوں کے خلاف سارا لٹریچر، (اخبار) جمعیت کی فائلیں، لاؤڈ اسپیکر، سائیکلو سٹائل مشین اور بھی دوسری چیزیں پولیس نے قبضہ میں لے لیں، اس وقت مکان پر مستورات کے علاوہ اور کوئی نہ تھا، مستورات کو پردے میں کرا دیا گیا، اور دفتری سامان کے ساتھ ساتھ گھریلو سامان کی بھی تلاشی لی گئی۔

قید و بند کی صعوبتیں

15 مارچ سے 25/مارچ تک معمول یہ رہا کہ دن کے وقت مجھے قید تنہائی میں رکھا جاتا اور رات کو تقریباً دس گیارہ بجے تیز روشنی میں بٹھا کر نہایت بدتمیزی سے سوالات کیے جاتے، اس کے بعد مجھے پریشان کرنے کے لیے ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا، حوالات کی پچھلی طرف ایک کھائی تھی اس میں فائر کیے جاتے اور پھر ایک افسر سپاہیوں سے پوچھتا آج کتنے اُتارے؟ سپاہی جواب میں چار یا چھ کہتا اور پھر مجھے کہا جاتا اب آپ کی باری بھی آنے والی ہے، پھر پوچھ گچھ کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ مجھے ہتھکڑی لگا کر ایک تہہ خانے میں لے جایا جاتا اور وہاں اوٹ پٹانگ سوالات کر کے پریشان کرنے کی کوشش کی جاتی، اسی دوران ایک بڑا عجیب واقعہ پیش آیا، ایک روز مجھے تہہ خانے میں اُتارا جا رہا تھا، جب تین چار سیڑھیاں باقی رہ گئیں تو میں نے دیکھا کہ تقریباً ڈیڑھ گز لمبا سانپ پھن پھیلائے فرش پر پڑا ہے، میرے ساتھ آنے والے افسر نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے معافی نہ مانگی تو مجھے اس سانپ کے اُوپر ڈال دیا جائے گا، میں نے اپنے حوصلے کو قائم رکھا اور معافی مانگنے سے صاف انکار کر دیا، اس نے مجھے دھکا دینے کی کوشش کی تو میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا، چنانچہ اتفاق یہ ہوا کہ وہ اپنے ہی زور سے نیچے کی طرف لڑھک گیا اور پھر بدحواسی کے عالم میں اوپر کی طرف بھاگا،

میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی، جب مجھے حوالات میں بند کرنے کے لیے پولیس کی بیرک کے سامنے سے گزارا گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے، میں نے اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھائے اور پھر ہتھکڑی کو چوم کر آنکھوں سے لگا لیا، میرے ساتھ چلنے والے سپاہیوں نے اس کی وجہ پوچھی تو میں نے انہیں کہا خدا کا شکر ہے کہ میں نے یہ ہتھکڑیاں کسی اخلاقی جرم کی پاداش میں نہیں پہنیں اور مجھے فخر ہے کہ میں نے آج اللہ کے پیارے حبیب شافع محشر ﷺ کی ناموس اور عظمت کے تحفظ کی خاطر یہ زیور پہنا ہے، یہ سن کر وہ سپاہی خاصے متاثر ہوئے اور انہوں نے کہا دل تو ہمارے آپ کے ساتھ ہیں لیکن ہم کر کچھ نہیں سکتے، ملازمت کا معاملہ ہے، میں نے ان سے کہا یزیدی فوج بھی یہی کہتی تھی اگر تم مجھے حق پر سمجھتے ہو تو اُسوۂ حر (رضی اللہ عنہ) پر عمل کرو، یہ سن کر وہ شرمندہ ہو گئے۔

30 ؍مارچ کو حوالات میں سو رہا تھا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ مغرب کی جانب سے ایک کوّا اُڑتا ہوا آرہا ہے اور اس کے منہ میں ایک چھوٹا سا سانپ ہے، یہ کوّا اُڑتا ہوا دوسری سمت چلا گیا، جب میں بیدار ہوا تو اس خواب کا اثر ذہن پر موجود تھا، میں اس خواب کی تعبیر سوچنے لگا، چند لمحے بعد ماشکی گھڑے میں پانی ڈالنے کے لیے آیا تو اس نے بتایا کہ خواجہ ناظم الدین کی وزارت ختم ہو گئی ہے، یکم اپریل کو ایک افسر نے آکر مجھ سے کہا کہ آپ کے والد نے معافی مانگ لی ہے اور وہ گھر واپس آگئے ہیں، لہٰذا آپ بھی معافی مانگ لیں، میں اس کی چال فوراً سمجھ گیا اور میں نے کہا میں ایک بہادر اور غیور باپ کا بیٹا ہوں، آپ غلط بیانی کر رہے ہیں میرا والد ہرگز معافی نہیں مانگ سکتا، میرا جواب سن کر وہ ناکام واپس چلا گیا۔

2 ؍اپریل سے اذیت کا سلسلہ اور بڑھا دیا گیا، رات دن مجھے قلعے کے مختلف حصوں میں تبدیل کر دیا جاتا، رات کو جگایا جاتا اور تیز روشنی میں بٹھا کر ایک افسر سوال کرتا، ابھی میں اس کا جواب دینے نہ پاتا تھا کہ دوسرا سوال کر دیا جاتا، حوالات کے دروازے پر رائفل بردار فوجی ہر وقت موجود رہتے تھے، اگر میں ان سے کوئی بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ گردن ہلا

کر معذرت کا اظہار کر دیتے تھے، ماشکی گھڑے میں پانی لا کر ڈالتا اور خاموشی سے واپس چلا جاتا، گویا وہ ماحول صمٌ بکمٌ عمیٌ فھم لا یرجعون کا سا تھا، لیکن حوصلہ اور ہمت اس لیے بلند تھی کہ تاجدارِ ختم نبوت کی ناموس کا معاملہ تھا، ایک روز میرے اصرار پر ایک پہرے دار فوجی نے بتایا کہ انہیں سختی سے آرڈر ہے کہ میری نقل وحرکت کی نگرانی کی جائے اور میرے ساتھ کوئی بات نہ کی جائے، اس نے بتایا کہ اگر کسی افسر نے اسے میرے ساتھ باتیں کرتے دیکھ لیا تو اس کا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔

7 راپریل کی شب مجھے قلعے کے اندر ایک بڑی حوالات میں لے جایا گیا، یہاں مختلف علاقوں کے رضا کار موجود تھے، یہاں پہنچ کر یہ انکشاف ہوا کہ مسجد وزیر خاں میں جوشیلے نعرے لگانے اور سائے کی طرح ہر وقت ہمارے ساتھ رہنے والے رضا کار دراصل سی آئی ڈی کے ملازم تھے، سی آئی ڈی کے کچھ ملازم اس حوالات میں بھی ہماری جاسوسی کے لیے موجود تھے، رضا کاروں کے اس اجتماع میں کئی شناسا چہرے بھی تھے، لاہور کے علاوہ راولپنڈی اور کراچی کے وہ کارکن بھی موجود تھے جنہوں نے تحریک میں سرگرم حصہ لیا تھا، یونس پہلوان اور ان کے ساتھیوں سے بھی یہیں ملاقات ہوئی، ایک مدت کے بعد کارکنوں سے گفتگو کرنے کا موقع نصیب ہوا تھا، چنانچہ ہم سب رات تین بجے تک تحریک کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت کرتے رہے، سی آئی ڈی کے ملازم پوری توجہ سے ہماری گفتگو سنتے رہے، لیکن اب چونکہ ان کے چہرے بے نقاب ہو چکے تھے اس لیے ہم نے بڑے محتاط انداز میں باتیں کیں، پھر اچانک ایک پولیس انسپکٹر آیا اور اس نے میرا نام پکارا، پھر اس نے یونس پہلوان اور بلال گنج کے کارکن غلام نبی کا نام بھی پکارا اور کہنے لگا کہ مزنگ میں ایک قتل ہوا ہے اور اس میں آپ تینوں کا نام بھی آرہا ہے، لہذا آپ ہمارے ساتھ چلیں اور اپنی صفائی پیش کریں، ہمیں یہ بات سن کر بہت حیرانی ہوئی اور ہم نے اسے جواباً کہا کہ ہم نو مارچ سے قلعے میں بند ہیں اور باہر کرفیو لگا ہے، قتل کرنے کے لیے ہم کیسے چلے گئے، ہم نے پولیس افسر پر واضح کر دیا کہ ہم

رات کے وقت کہیں جانے کو تیار نہیں ہیں اور اگر اس نے کوئی انکوائری کرنی ہے تو صبح آئے، ہمارا جواب سن کر اس نے کہا کہ وہ اپنے افسران بالا کو بتا دے گا اور اگر انہوں نے اسی وقت بلایا تو پھر ہمیں بلا حیل وحجت چلنا ہوگا، یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔

8 راپریل کو عصر کے بعد ڈی ایس پی سی آئی اے نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور کاغذ اور قلم میرے سامنے رکھ دیا اور مجھے کہا کہ میں جو کچھ بھی چاہتا ہوں کاغذ پر لکھ دوں، میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی ضرورت کیوں پیش آگئی، تو اس نے جواب میں مغلظات سنانا شروع کر دیں، میں یہ گالیاں برداشت نہ کر سکا اور میں نے اسے کہا آپ میرے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں لیکن میرے بزرگوں کو گالی نہ دیں ورنہ آپ کو اس کی بڑی سخت سزا ملے گی کیوں کہ میرے بزرگوں کا تعلق اہل بیت سے ہے، یہ باتیں سن کر وہ مرعوب سا ہوگیا، اس کے بعد فائرنگ کی آواز آئی اور پھر دو سپاہی دفتر میں داخل ہوئے، ڈی ایس پی نے ان سے پوچھا آج کتنے اُتارے؟ انہوں نے جواب دیا "دو"، سپاہی واپس چلے گئے اور پھر فائرنگ کی آواز آنے لگی، ڈی ایس پی نے فون اُٹھایا اور پھر وہی سوال دہرایا اب کتنے اُتارے؟ اور پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اب مزید چار افراد کو گولی مار دی گئی ہے، حکومت کے باغیوں کا یہی حشر ہوتا ہے، اور پھر اس نے بڑی لجاجت سے کہا آپ تو شریف آدمی ہیں اس کاغذ پر معافی نامہ لکھ دیجئے ہم آپ کو ابھی رہا کروا دیں گے، میں نے اسے جواب دیا کہ جو حکومت ختم نبوت کی منکر ہو اور محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی باغی ہو میں اس سے ہرگز معافی نہیں مانگ سکتا، میرا جواب سن کر اس نے کہا میں اپنے یہی الفاظ کاغذ پر لکھ دوں، چنانچہ میں نے یہ الفاظ کاغذ پر لکھ دیے، ڈی ایس پی نے یہ عبارت پڑھی تو غصے سے پاگل ہوگیا، اس نے قلم زور سے زمین پر مارا اور کاغذ پھاڑ دیا پھر مجھے مارنے کے لیے کرسی سے اُچھلا، میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور جلدی میں کرسی کا تکیہ ہی پکڑ سکا، لیکن اس پر اللہ کے فضل سے ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ مجھے کچھ کہے بغیر دفتر سے باہر چلا گیا، پھر ایک سپاہی آیا اور اس نے مجھے قلعے کے دروازے کے پاس حوالات میں لے

جا کر بند کر دیا۔اس روز دوپہر کو مجھے نہ تو کھانا دیا گیا اور نہ ہی پانی مل سکا،ظہر اور عصر کی نماز میں نے تیمم سے ادا کی،مغرب کے وقت مجھے وضو کے لیے پانی دے دیا گیا اور پھر مجھے کھانا بھی دیا گیا جس میں خلاف معمول پھل بھی تھے تقریباً نو بجے مجھے ہتھکڑی لگا کر ایک بڑے کمرے میں لایا گیا، یہاں میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور پھر مجھے سیدھا کھڑا رہنے کا حکم دیا گیا،تھوڑی دیر کے بعد ایک سپاہی نے میرے بازو پکڑ کر اوپر کر دیے اور ٹانگیں چوڑی کرنے کو کہا،اسی عالم میں دو تین گھنٹے گزر گئے پھر وہ سپاہی چلا گیا اور اس کی جگہ دوسرا آ گیا،اسی طرح تین تین گھنٹے کے بعد ڈیوٹیاں بدلتی رہیں،جونہی میں ہاتھ ذرا نیچے کرتا ڈیوٹی پر موجود سپاہی فوراً میرا بازو پکڑ کر ہاتھ اوپر کر دیتا،یہ اذیت ناک سلسلہ ساری رات جاری رہا،فجر سے دو گھنٹے قبل میرے پیٹ اور سینے میں شدید درد اٹھا اور میں کراہنے لگا لیکن اُن لوگوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا،پھر میں نے تہجد کے نفل ادا کرنے کی اجازت مانگی،لیکن اس سے بھی انکار کر دیا گیا،درد سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں نے دُرود شریف کا ورد شروع کر دیا،چند ہی لمحے بعد کافی افاقہ ہو گیا،نماز فجر ادا کرنے کی اجازت بھی مجھے نہ مل سکی،رات کے نو بجے سے صبح گیارہ بجے تک یہی عالم رہا، طبیعت نہایت مضمحل تھی اور تھکاوٹ سے بدن چُور چُور ہو رہا تھا،میں نے سیدی سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے استغاثہ کیا اور یہ اشعار پڑھنے شروع کیے:

غوثِ اعظم بمن بے سر و ساماں مددے
قبلۂ دیں مددے کعبۂ ایماں مددے

اتنے میں ایک پولیس افسر آیا اور مجھے ہتھکڑی لگا کر حوالات میں لے گیا،یہاں ایک سپاہی کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ وہ مجھے سونے نہ دے،پانی کا گھڑا تو لا کر رکھ دیا گیا مگر کھانا نہ ملا،نماز ظہر کے بعد میں نے داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اقدس کی طرف رُخ کیا اور اس شعر کا ورد شروع کر دیا:

گنج بخش فیض عالم مظہر نورِ خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را راہنما

خواب میں شیخ سید عبدالقادر جیلانی کی زیارت

عصر کے بعد وہ سپاہی چلا گیا اور میری آنکھ لگ گئی، خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بہت بڑا کمرہ ہے جس میں سبز رنگ کی روشنی ہے، اس کمرے کی سیڑھیاں ہیں جس پر والد محترم حضرت علامہ ابوالحسنات (جو اس وقت سکھر جیل میں تھے) کھڑے ہیں، مجھے دیکھ کر انہوں نے سینے سے لگا لیا، میں نے ان سے پوچھا آپ کا کیا حال ہے؟ تو انہوں نے جواباً فرمایا مجھے بھی انہوں نے رات بھر کھڑا رکھا ہے، اس گفتگو کے بعد میں اُن سیڑھیوں سے نیچے کمرے میں اُترا تو میں نے دیکھا کہ شمالی جانب ایک دروازہ ہے جو کہ کھلا ہوا ہے، میں اس کمرے میں دوزانو بیٹھ گیا اتنے میں ایک بزرگ سپید نورانی چہرہ، کشادہ پیشانی، درمیانہ قد، سفید داڑھی، کھلی آستینوں کا سبز کرتہ زیب تن کیے میری طرف تشریف لائے اور پیچھے سے ایک آواز آئی "سرکار غوث اعظم تشریف لا رہے ہیں" میں نے دست بستہ حضرت سے عرض کی، حضور ان کتوں نے بہت تنگ کر رکھا ہے، سرکار غوث اعظم نے میری داہنی طرف پشت پر تھپکی دی اور فرمایا شاباش بیٹا گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا، میں نے دوبارہ عرض کی حضور! انہوں نے بہت پریشان کر رکھا ہے، رخ انور پر مسلسل شگفتگی تھی فرمایا کچھ نہیں، سب ٹھیک ہے اور یہ کہہ کر آپ واپس تشریف لے گئے، اس واقعہ کے بعد میرا حوصلہ بہت بلند ہو گیا ورنہ اس رات کی اذیت سے ممکن تھا کہ میں ڈگمگا جاتا، لیکن سرکار غوث پاک کے روحانی کرم نے مجھے ذہنی اور قلبی سکون سے مالا مال کر دیا، مغرب کے بعد مجھے کھانا دیا گیا اور پھر رات کو کسی نے مجھے پریشان نہیں کیا، دوسرے روز اعلیٰ فوجی افسر راؤنڈ کرتے ہوئے آئے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ میں نے انہیں تمام واقعات بتائے، اور انہوں نے میرے سامنے متعلقہ پولیس افسران کی سرزنش کی اور کچھ ہدایات جاری کیں، پھر مجھے ایک دوسری حوالات میں منتقل کر دیا گیا جو قدرے بہتر تھی، وہاں میں نے مولانا عبدالستار خاں نیازی کی آواز سنی مولانا تلاوت کلام پاک فرما رہے تھے، اور میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی قریبی حوالات میں

ہیں، دوپہر کے وقت مجھے ایک بیرک میں منتقل کردیا گیا جہاں سے بالکل سامنے مولانا عبدالستار خاں نیازی تھے، مولانا نیازی نے اشارے سے سلام کیا اور خیریت پوچھی، فاصلہ چونکہ خاصا تھا اس لیے مزید کوئی بات نہ ہو سکی، پھر سی آئی اے کے ایک افسر اعجاز حسین (جو کہ میرے واقف کار تھے اور چوک نواب صاحب میں رہتے تھے) میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے ایک چادر اور کچھ کپڑے دیے، انہوں نے بتایا کہ یہ کپڑے میرے تایا حافظ غلام احمد نے بھیجے ہیں، اس سے پہلے میرے کپڑے بہت زیادہ پھٹ چکے تھے اور بنیان میں جوئیں پڑ گئی تھیں، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کے تایا حافظ صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ کپڑے بھی وہ اپنی ذمہ داری پر لے آئے ہیں ورنہ اس کی بھی اجازت نہیں ہے، مغرب کے بعد میں بیٹھا ہوا تھا کہ معاً دل میں خیال آیا کہ یہاں خشک روٹی اور چنے کی دال کے سوا کچھ نہیں مل رہا اگر اپنے گھر میں ہوتے تو حسب منشا کھانا کھاتے، لیکن دوسرے ہی لمحے ضمیر نے ملامت کی اور صحابہ کرام علیہم الرضوان کی قربانیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا، میں نے سربسجود ہو کر توبہ کی اور اس وسوسے کا ازالہ چاہا، لیکن خدا کی قدرت دیکھیے کہ چند لمحے بعد اندھیرے میں ایک ہاتھ آگے بڑھا اور آواز آئی شاہ جی! یہ لے لو، اور پھر ایک لفافہ مجھے دیا گیا جس میں کچھ پھل اور مٹھائی تھی، میں حیران رہ گیا کہ اتنے سخت پہروں کے باوجود یہ سب کچھ مجھ تک کیسے پہنچ گیا، لیکن میرے دل کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ غیبی دعوت قاسم عالم ﷺ کے صدقے میں ملی ہے، وہ پھل اور مٹھائی تین روز تک میں استعمال کرتا رہا۔

عدالت میں پیشی

دس اپریل کو تقریباً گیارہ بجے مجھے چارج شیٹ دی گئی، میرے خلاف 29 مختلف دفعات کے تحت مقدمات قائم کیے گئے تھے، ان میں قتل و غارت اور بدامنی پیدا کرنے کے مقدمات بھی شامل تھے، دوپہر ایک بجے کے قریب مجھے ہتھکڑی لگا کر ایک بند گاڑی میں بٹھایا گیا اور بورسٹل جیل کے قریب ایک فوجی عدالت میں پیش کیا گیا، فوجی عدالت میں کیپٹن شفیق

نے پولیس افسر سے پوچھا کہ ہتھکڑی کیوں لگائی گئی ہے؟ پولیس افسر نے کچھ وضاحت کرنے کی کوشش کی، لیکن اس نے حکم دیا کہ ہتھکڑی کھول دی جائے، چنانچہ عدالت ہی میں میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور پھر مختصر سی عدالتی کارروائی کے بعد مجھے سنٹرل جیل (شادمان کالونی) پہنچا دیا گیا۔

سنٹرل جیل میں پہنچا تو وہاں ایک میلے کا سا سماں تھا، بیرکوں کے باہر ہزاروں افراد کا اجتماع تھا، بیرکوں میں جگہ ختم ہو جانے کے باعث خاروار تار لگا کر شمع رسالت کے پروانوں کو حراست میں رکھا گیا تھا، جیل کے مختلف حصوں میں عجیب کیف و سرور کی محفلیں برپا تھیں، کہیں نعت خوانی ہو رہی ہے تو کہیں ختم نبوت کے موضوع پر تقاریر، کہیں درود و سلام پڑھا جا رہا ہے تو کہیں ذکر و اذکار کا غلغلہ ہے، غرض ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔

جیل میں احباب سے ملاقات

مجھے سی کلاس کی ایک بیرک میں اخلاقی مجرموں کے ساتھ رکھا گیا، دوسرے روز میں نے دیکھا کہ جیل کے گیٹ سے قطار کی صورت میں کچھ لوگ آرہے ہیں، جنہوں نے کندھوں پر بستر اٹھا رکھے تھے، میں آگے بڑھا تو دیکھا کہ ان میں میاں طفیل محمد، مولانا کوثر نیازی، مولانا امین احسن اصلاحی، نصر اللہ خاں عزیز، نقی علی اور جماعت اسلامی کے بہت سے کارکن ہیں، ان حضرات سے علیک سلیک ہوئی اور میں نے پوچھا حضرت! آپ کیسے تشریف لائے، جماعت اسلامی کے ایک سرکردہ رہنما نے جواب دیا، ہم تو گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے، ہمیں پکڑ کر لے آئے ہیں، میں نے کہا آپ کا جرم کیا ہے (یعنی کس جرم میں آپ کو پکڑ کر لائے ہیں؟) وہ بولے جرم کا خود ہمیں بھی علم نہیں...... ان حضرات کو بھی مختلف بیرکوں میں جگہ دی گئی۔

جیل کے اندر ہی کچھ فوجی عدالتیں قائم کی گئی تھیں اور جو لوگ یہ تحریر لکھ دیتے تھے کہ ان کا تحریک کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، ان کی رہائی فوراً عمل میں آجاتی تھی، باوجودیکہ کافی لوگ اس طرح رہا ہونے میں کامیاب ہو گئے لیکن جیل کی رونق اور گہما گہمی میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا،

تیسرے روز مولانا عبدالستار خاں نیازی کو بھی قلعے سے سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا، مولانا مودودی کو بھی گرفتار کر کے جیل پہنچا دیا گیا، ان دونوں حضرات کو اے کلاس دے دی گئی اور ملاقات پر پابندی عائد کر دی گئی، میرے ساتھ سی کلاس میں اندرون دہلی دروازہ چنگڑ گلی کے تھا پہلوان اور یکی دروازہ کے چند نامی گرامی غنڈوں کو رکھا گیا تھا۔

جیل میں شارح بخاری مفتی سید محمود احمد رضوی سے ملاقات

ایک روز مجھے جیل میں علم ہوا کہ میرے چچازاد بھائی علامہ سید محمود احمد رضوی (جو کہ بعد میں مجلس عمل تحریک ختم نبوت 1974ء کے مرکزی جنرل سیکرٹری بنے) کو بھی گرفتار کر کے جیل میں لایا گیا ہے، میں نے مہر محمد حیات ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل سے مطالبہ کیا کہ انہیں میرے ساتھ رکھا جائے، انہوں نے فوراً یہ مطالبہ تسلیم کر لیا، محمود رضوی صاحب مجھے دیکھتے ہی بغل گیر ہو گئے اور میں نے ان کی خیریت دریافت کی، معلوم ہوا کہ پھیپھڑوں کے مرض میں مبتلا ہیں، انہوں نے مجھے بتایا کہ سائیکلوسٹائل کے ذریعے جو ہدایات پورے شہر میں پہنچائی جاتی تھیں وہ ان کے قلم سے ہی لکھی جاتی تھیں اور ان کی گرفتاری اسی بنا پر عمل میں آئی ہے، محمود صاحب سے تحریک کی صورت حال اور گھر کی خیریت کا علم ہوا، ہمیں بم کیس کی بیرکوں میں رکھا گیا تھا، ہماری قریبی بیرکوں میں مولانا غلام محمد ترنم صدر جمعیت علمائے پاکستان (پنجاب) بھی تھے، اور ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی، انہی بیرکوں میں ایک نو سالہ بچہ خالد بھی تھا جس کے خلاف بغاوت، ڈاکہ اور آتش زنی وغیرہ سنگین نوعیت کے مقدمات بنائے گئے تھے، آٹھ روز بعد فوجی عدالت نے اسے رہا کر دیا۔

مجھے ابھی تک اپنے والد محترم کے بارے میں کوئی اطلاع نہ مل سکی تھی کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں، اور نہ ہی میرے متعلق انہیں کوئی علم تھا، البتہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ کراچی جیل میں انہیں میرے قتل کی اطلاع دی گئی تھی، اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور سید مظفر علی شمسی کا بیان ہے کہ چند روز تک تو ہم نے یہ خبر علامہ ابوالحسنات سے چھپائے رکھی اور پھر آخر کار ایک روز

ہم نے انہیں بتا ہی دیا کہ آپ کے صاحبزادے کو موت کی نیند سلا دیا گیا ہے،علامہ ابوالحسنات یہ سنتے ہی سجدے میں گر گئے اور انہوں نے فرمایا؛

''میرے آقا گنبد خضراء کے مکیں صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے اِکلوتے بیٹے خلیل کی قربانی قبول ہے تو میں بارگاہِ ربی میں سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں، ناموس رسالت پر ایک خلیل تو کیا میرے ہزاروں فرزند بھی ہوں تو اُسوۂ شبیری پر عمل کرتے ہوئے سب کو قربان کردوں''

اس کے بعد انہوں نے قرآن پاک کی تفسیر کا آغاز کر دیا،بعد میں والد صاحب کو سکھر جیل منتقل کر دیا گیا تھا،اور خود ان کا بیان ہے کہ جیل میں جب بھی مجھے تمہاری یاد آئی تو میں قرآن پاک کی تفسیر شروع کر دیا کرتا تھا اور اس سے دل کو تسکین ہو جاتی تھی، چنانچہ جیل میں انہوں نے نصف قرآن کی تفسیر مکمل کی اور باقی رہائی کے بعد تحریر فرمائی۔

چارج شیٹ میں فردوس شاہ ڈی ایس پی کے قتل کا الزام مجھ پر اور مولانا عبدالستار خاں نیازی پر عائد کیا گیا تھا،اور اس کی تفصیل یہ بتائی گئی تھی کہ مسجد وزیر خاں میں مولانا عبدالستار خاں نیازی جلسۂ عام سے خطاب کر رہے تھے اور صدارت میں کر رہا تھا، فردوس شاہ ڈی ایس پی پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہوا ہی تھا کہ مولانا نیازی نے کہا ان کتّوں کو مسجد سے نکالو، میں نے صدارت کی کرسی سے کہا جانے نہ پائیں، یہیں ختم کر دو، یہ سن کر تھا پہلوان اور تقریباً نو دیگر افراد فردوس شاہ پر پل پڑے اور اسے وہیں قتل کر دیا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسجد میں نہ تو کوئی جلسہ ہو رہا تھا اور نہ تقریر، بلکہ ایک جلوس چوہٹہ بستی بھگت سے نکلا، فردوس شاہ ایک سپاہی کے تحفظ کے لیے آ رہا تھا کہ قتل کر دیا گیا۔

مقدمہ قتل کی سماعت اور بریّت

میرے خلاف مقدمہ قتل ایک فوجی عدالت میں چلایا گیا جو کہ سنٹرل جیل اور بورسٹل جیل کے درمیان لگائی گئی تھی، یہ مقدمہ تقریباً 19 روز تک فوجی عدالت میں زیر سماعت رہا،حکومت

کی طرف سے جو گواہ پیش ہوئے تھے وہ جرح کے دوران پسینے سے شرابور ہو جاتے اور ان کا جسم تھر تھر کانپنے لگتا، مولانا عبدالستار خاں نیازی اور میری طرف سے چودھری نذیر احمد (سابق اٹارنی جنرل) میاں غیاث الدین، رفیق احمد باجوہ، چوہدری کلیم الدین اور چند دیگر وکلاء فوجی عدالت میں پیش ہوئے، چوہدری نذیر احمد جب گواہوں پر جرح کرتے تو گواہوں کی حالت دیدنی ہوتی تھی، ایک گواہ نے اپنے بیان میں کہا کہ فردوس شاہ کی لاش مسجد وزیر خاں کے دروازے پر پڑی تھی اور میں اس کو اٹھا کر چوک وزیر خاں میں لے آیا اور پھر میں نے پولیس کو اطلاع دے دی، اس نے ایک شیشی میں جائے وقوعہ سے لی گئی خون آلود مٹی بھی عدالت میں پیش کی، فوجی عدالت نے جو کہ ایک بریگیڈیر اور دو کرنلوں پر مشتمل تھی، مجھ سے مسجد وزیر خاں میں جمعہ کا وقت پوچھا جو میں نے بتا دیا اور پھر عدالت نے کہا کہ وہ خود اگلے روز دس بجے صبح جائے وقوعہ کا معائنہ کرے گی۔

چنانچہ اگلے روز مولانا عبدالستار خاں نیازی اور میں، فوجی عدالت اور چند دیگر افراد کے ہمراہ مسجد وزیر خاں میں آئے، ہمیں دیکھ کر مکانوں کی چھتوں اور مکانوں سے محبان تاجدار ختم نبوت نعرے لگانے لگے اور فوجی عدالت نے اپنی آنکھوں سے ملت اسلامیہ کے جذبات کا مشاہدہ کیا، جب عدالت جائے وقوعہ پر پہنچی تو وہاں پر گواہ کے بیان کے بالکل برعکس مٹی کی بجائے سنگ سرخ کی سیڑھیاں تھیں، ۱۹ روز کی عدالتی کارروائی کے بعد عدالت نے ہمیں مقدمہ قتل سے بری کر دیا۔

دوبارہ گرفتاری

بری ہونے کے بعد ہم جیل سے سامان لینے کے لیے گئے تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل نے مجھے اور مولانا نیازی کو کہا کہ آپ جلدی سے گھر ہو آئیں کیوں کہ دوبارہ گرفتاری کا خدشہ ہے، چنانچہ ہم سامان لیے بغیر ہی جیل سے چلے آئے، گھر پہنچ کر میں نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کیے اور پھر حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اقدس پر پہنچ کر حاضری دی، واپسی پر دربار شریف کے

باہر لوگوں نے گھیر لیا اور پھولوں کے ہار پہنائے، یہاں کئی دوستوں سے بھی ملاقات ہوگئی، مارشل لاء کی پابندیاں اگرچہ کافی نرم ہو چکی تھیں لیکن اثرات ابھی بہت زیادہ باقی تھے، چوراہوں پر فوجیوں نے ریت کی بوریوں سے مورچے بنائے ہوئے تھے، میں دربار شریف سے گھر جانے کے لیے تانگے پر بیٹھا، ابھی تانگہ لوہاری گیٹ تک ہی پہنچا تھا کہ پیچھے سے ایک فوجی جیپ آئی اس نے ہارن دیا اور رکنے کا اشارہ کیا، ایک فوجی افسر نے میرے قریب آ کر وارنٹ دکھائے اور کہا تشریف لے آئیے، آپ کو دوبارہ گرفتار کیا جا رہا ہے، مجھے چند گھنٹے تھانہ یکی گیٹ میں رکھنے کے بعد شاہی قلعے میں پہنچا دیا گیا، اسی روز لوہاری دروازے کے کچھ افراد گرفتار ہو کر آئے تھے اور ان کے پاس گھر کا کھانا بھی موجود تھا، چنانچہ ان کے ساتھ میں نے بھی کھانا کھایا، ایک رات قلعے میں گزارنے کے بعد اگلے روز مجھے سنٹرل جیل پہنچا دیا گیا، مولانا محمود احمد رضوی صاحب کو جیل سے ہسپتال کے ٹی بی وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا اور ملاقات پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

سزائے موت کا فیصلہ

پھر تقریباً ایک ماہ تک فوجی عدالت میں 7 رمارچ کو مسجد وزیر خاں میں ہونے والی میری تقریر کے خلاف مقدمہ زیر سماعت رہا، اس مقدمہ میں بھی میری پیروی ان وکلاء صاحبان نے ہی کی جو کہ مقدمہ قتل میں پیش ہوئے تھے، اگرچہ سرکاری گواہیاں جرح کے دوران ساقط ہو چکی تھیں لیکن مجھے سات سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی اور مجھے جیل میں قیدیوں کا لباس پہنا دیا گیا، پہلے بان اور چرخے کی مشقت دی گئی، اسی دوران مولانا عبدالستار خاں نیازی (جنہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا تھا) اور مولانا مودودی کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا، مولانا عبدالستار خاں نیازی کو جس وقت سزائے موت سنائی گئی میں فوجی عدالت میں موجود تھا، انہوں نے سزائے موت کا فیصلہ سننے کے بعد گرج کر کہا؛

بس۔۔۔اس سے بھی زیادہ کوئی سزا آپ کے پاس ہے تو دے دیجیے، میں ناموس

مصطفی (ﷺ) کی خاطر سب کچھ برداشت کرنے کو تیار ہوں۔

مولانا نیازی نے اس موقع پر کچھ اشعار بھی پڑھے، ان کا چہرہ تمتما رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سزائے موت کا فیصلہ سن کر انہیں ذرہ بھر افسوس بھی نہیں ہوا۔

مجھے سات سال قید بامشقت کی سزا ہوئے تقریباً ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ فوجی عدالت نے مقدمہ بغاوت کی سماعت شروع کر دی اور سرسری کارروائی کے بعد مجھے سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا، فوجی عدالت کے سربراہ نے فیصلہ پڑھا "ملزم کو گلے سے اس وقت تک پھانسی پر لٹکایا جائے جب تک کہ وہ مر نہ جائے"، سزائے موت کا فیصلہ سننے کے بعد ایک لمحے کے لیے تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا لیکن معاًبعد آیت کریمہ "بل احیاء ولکن لا تشعرون" زبان پر آ گئی اور پھر حوصلے کا یہ عالم تھا کہ جام شہادت نوش کرنے کے لیے طبیعت مچلنے لگی اور جنت کے لہلہاتے ہوئے باغات آنکھوں میں گھومنے لگے، مجھے سزائے موت کے قیدیوں کے لیے مخصوص "پکی کوٹھی" میں لا کر بند کر دیا، میں اپنے بخت رسا پر ناز کرنے لگا کہ مقام مصطفی ﷺ کے تحفظ کی خاطر جان کی قربانی پیش کرنے کی سعادت حاصل ہونے والی ہے۔

سزائے موت کے فیصلہ میں تبدیلی

تین روز کے بعد مجھے دوبارہ فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور اس نے میری سزائے موت چودہ (14) سال قید میں تبدیل کر دی حالاں کہ میں نے سزا میں تخفیف کے لیے کوئی اپیل نہ کی تھی، بعد میں مجھے علم ہوا میرے علاوہ مولانا نیازی اور مودودی صاحب کی سزائے موت کے فیصلے کے خلاف افغانستان کے ممتاز روحانی پیشوا ملا شور بازار (کابل)، حضرت مولانا فضل الرحمن مدنی مدظلہ (مدینہ منورہ) کی طرف سے اور دیگر اسلامی ممالک کے گوشے گوشے سے حکومت پاکستان کو تاریں اور قراردادیں موصول ہونا شروع ہو گئی تھیں جن میں ہماری فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا تھا، اندرون ملک بھی بڑا موثر ردعمل ہوا، دوسری طرف مرزائیوں کے سرخیل محمود بشیر کے لڑکے ناصر محمود کو رہا کر دیا گیا، سر ظفر اللہ اس وقت وزیر خارجہ تھا اور تحریک کا ایک اہم مقصد مرزائیوں

کو کلیدی عہدوں سے ہٹانا بھی تھا۔ظفر اللہ نے ذاتی طور پر دلچسپی لے کر ناصر محمود کو رہا کروایا اور پاکستان کے طول وعرض میں غم وغصے کی ایک لہر دوڑ گئی ،سردار عبدالرب نشتر نے ہماری سزائے موت کوختم کرانے کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں،خان عبدالقیوم خان اس وقت وزیر داخلہ تھے،انہوں نے تحریک کو کچلنے کے لیے انتہائی تشدد آمیز رویہ اختیار کیا۔

میری سات سال اور چودہ سال کی سزائیں ایک ساتھ ہی شروع ہوگئی تھیں، میں بدستور سی کلاس میں تھا جہاں گڑ اور چنے کا ناشتہ کرنا پڑتا تھا، دال روٹی کھانے کو ملتی تھی، دال نہایت عجیب اور بدمزہ ہوتی تھی اور مسلسل کھانے سے دل اکتا چکا تھا پھر ایک قیدی قمر الدین نے مجھے سالن دینا شروع کر دیا اور یوں گزارہ ہونے لگا، ایک روز میں نے سکھر جیل کے پتے پر والد محترم کو اپنی خیریت کا خط لکھا جس کا جواب مجھے پندرہ روز کے بعد موصول ہوگیا، والد صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ تم رتبہ شہادت حاصل نہیں کر سکے، لیکن بہر حال یہ جان کر دل کو اطمینان ہوا کہ تم ناموس مصطفی ﷺ کی خاطر لڑ رہے ہو، خط کے آخر میں لکھا:
"کاش اللہ تعالیٰ میرے بیٹے کی قربانی قبول کر لیتا"۔

مولانا عبدالستار نیازی اور مولانا مودودی سے ملاقاتیں

چند روز بعد مولانا عبدالستار خان نیازی اور مولانا مودودی کی سزائے موت بھی چودہ سال قید بامشقت میں تبدیل ہوگئی اور انہیں اے کلاس کی بیرکوں میں تبدیل کر دیا گیا، مجھے بدستور سی کلاس میں ہی رکھا گیا تھا، میں اکثر دو پہر کے وقت مشقت سے فارغ ہونے کے بعد مولانا نیازی اور مولانا مودودی سے ملاقات کے لیے ان کی بیرک میں چلا جایا کرتا تھا، یہ دونوں حضرات زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں صرف کرتے تھے، دو پہر کے وقت مولانا نصر اللہ خاں عزیز لطائف کی محفل جماتے، ایک روز دو پہر کے وقت میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی، اُلٹیاں اور چکر آنے لگے، میں مولانا مودودی کی بیرک میں داخل ہوا تو مولانا نے حسب معمول میری خیریت دریافت کی اور میری طبیعت ناساز پا کر انہوں نے اپنا کام چھوڑ دیا اور فوراً میری

تیمار داری میں لگ گئے، انہوں نے جیل کے ڈاکٹر کو بلانے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر موجود نہ تھا، پھر انہوں نے اپنی دواؤں میں سے مجھے دوا دی جس سے میری طبیعت قدرے سنبھل گئی، اس طرح ان کے اخلاق نے مجھے بہت متاثر کیا۔

مولانا مودودی سے مباحثہ

نصر اللہ خاں عزیز، سید نقی علی اور مودودی صاحب کے دیگر رفقاء جیل میں اکثر مودودی صاحب کی تصنیفات تقسیم کیا کرتے تھے، ایک روز انہوں نے مجھے مولانا کا ایک کتابچہ "تجدید احیائے دین" پڑھنے کے لیے دیا، میں نے اسے بغور پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس میں اولیاء کرام کی تنقیص کی گئی ہے اور بزرگانِ دین سے عقیدت کو ہندو ازم سے تعبیر کیا گیا ہے، اس کے علاوہ اس میں اور بھی کئی قابل اعتراض عبارات نظر سے گزریں، پھر ایک روز مجھے مودودی صاحب سے تخلیہ میں گفتگو کا موقع ملا تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اس کتابچہ میں اولیاء کرام کے وجود سے انکار کیا ہے اور ان سے عقیدت کو ہندو ازم سے تعبیر کیا ہے، آپ یہ الفاظ لکھنے میں کس حد تک حق بجانب ہیں؟ انہوں نے جواب دیا "مجھے تو آج تک کوئی ولی نظر نہیں آیا" میں نے عرض کی اگر آپ کو کوئی ولی نظر نہیں آیا تو اس بات کی دلیل نہیں کہ دنیا میں کوئی ولی موجود ہی نہیں، اور پھر آپ نے تو کسی نبی یا رسول کو بھی نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ بھی تو کبھی آپ کو نظر نہیں آیا، چنانچہ اگر آپ کا وضع کردہ اُصول تسلیم کر لیا جائے تو پھر خدا اور رسول کے وجود سے بھی انکار کرنا پڑے گا، یہ باتیں سن کر مودودی صاحب نے کہا یہ کتابچہ میں نے اس زمانے میں تحریر کیا تھا جب میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور انسان سے غلطی بھی تو ہو سکتی ہے، میں نے کہا آپ کی اس غلطی سے جو لوگ گمراہ ہوئے ہوں گے ان کا ذمہ دار کون ہے؟ مولانا نے اس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی اور میں نے انہیں کہا قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اولیاء اللہ کرام کی شان میں واضح طور پر فرمایا ہے: "الا ان اولیاء اللہ لا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون" اور اس کے علاوہ بھی قرآن پاک میں اولیاء کرام کے متعلق بہت سی آیات موجود ہیں، لہٰذا آپ کے اس کتابچہ کی اصلاح ہونی چاہیے، مودودی صاحب کچھ

جواب دینا چاہتے تھے لیکن اسی اثناء میں اُن کے کچھ رفقاء آگئے اور بات دوسری طرف چل نکلی، اس کے بعد بھی ان سے کئی بار نہایت خوش گوار ماحول میں گفتگو کا موقع ملتا رہا۔

ایک روز جیل میں یہ اطلاع ملی کہ کچھ قیدیوں نے جیلر کی توہین کی ہے اور اس جرم کی پاداش میں انہیں ٹکٹکی لگائی جائے گی، ہم اپنی بیرک سے اس مقام کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں پانچ چھ افراد کو نہایت بے دردی سے بید لگائے گئے، ہم نے چھپ کر یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ملزموں کے جسم سے گوشت قیمے کی طرح کٹ کر فضا میں اُڑتا ہوا نظر آیا، اس دردناک واقعہ کی مکمل تفصیل ہم نے لکھ کر ممبران اسمبلی کو ارسال کی اور صوبائی اسمبلی میں حکومت کی طرف سے باقاعدہ یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ آئندہ جیل میں کسی ملزم کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک نہیں کیا جائے گا۔

اسی دوران مولانا احمد علی لاہوری کو ملتان سے سنٹرل جیل لاہور میں منتقل کر دیا گیا، وہ کچھ علیل تھے اس لیے انہیں جیل کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا اور پھر دو روز بعد معلوم ہوا کہ انہیں رہا کر دیا گیا ہے، ان کی رہائی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی، چنانچہ اس سلسلہ میں جیل میں یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ وہ معافی مانگ کر رہا ہوئے ہیں۔

قائدین تحریک کی سکھر جیل سے لاہور سنٹرل جیل منتقلی

1954ء میں حکومت نے ایک انکوائری کمیشن قائم کیا، اس کمیشن کے قیام سے دو روز قبل مجھے جیل میں بی کلاس دے دی گئی اور اب میرا قیام جیل کے اس حصے میں تھا جہاں مولانا عبدالستار خاں نیازی، مولانا مودودی اور نصر اللہ خاں عزیز وغیرہ تھے، انکوائری کمیشن کے قیام کے بعد سکھر جیل میں نظر بند تمام راہنماؤں کو سنٹرل جیل لاہور میں منتقل کر دیا اور ان تمام حضرات کو سنٹرل جیل کے اس حصے میں رکھا گیا جسے دیوانی گھر کہا جاتا ہے، جب میں پہلی بار ان حضرات سے ملاقات کے لیے دیوانی گھر کے دروازے پر پہنچا تو سب سے پہلے سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے ملاقات ہوئی، انہوں نے مجھے ''شہید اعظم'' کہہ کر پکارا اور بغل گیر ہو گئے، چند

قدم آگے بڑھا تو شیخ حسام الدین اور تاج الدین انصاری سے ملاقات ہوئی، میں نے اپنے والد محترم کے متعلق دریافت کیا تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بڑ کے درخت کی طرف لے گئے جہاں میرے والد محترم ایک چارپائی پر بیٹھے قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے تھے، پہلی نظر میں تو میں انہیں پہچان بھی نہ سکا کیونکہ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے اور ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آرہے تھے، والد محترم نے مجھے دیکھا تو اٹھ کر سینے سے لگالیا میں نے عرض کی آپ اتنے کمزور کیوں ہوگئے؟ والد محترم نے فرمایا؛

''سکھر جیل سنٹر جیل تھی، 125 ڈگری گرمی تھی اور جس بیرک میں ہمیں رکھا تھا اس کے اوپر لوہے کی چادریں تھیں، پانی بھی وقت کی پابندی کے ساتھ ملتا تھا، اکثر پسینے سے ہی غسل کر کے تفسیر کا کام شروع کر دیتا تھا۔''

جیل میں مذہبی معمولات

قائدین کی آمد کے بعد جیل میں بہت زیادہ رونق اور چہل پہل ہوگئی تھی، اکثر علماء والد محترم سے ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے، والد صاحب قبلہ جیل سے ملنے والے راشن سے مٹھائی وغیرہ تیار کر کے گیارھویں شریف کے ختم کا اہتمام کرتے تھے، ایک روز مولانا غلام محمد ترنم (جنہیں دیوانی گھر سے کچھ فاصلے پر واقع ''بم کیس'' کی بیرکوں میں رکھا گیا تھا) معروف اہل حدیث عالم مولانا محمد اسماعیل کا ہاتھ پکڑ کر انہیں والد صاحب کے پاس لے آئے اور انہوں نے از راہِ مذاق فرمایا کہ آج اس وہابی کو گیارھویں شریف کا تبرک کھلانا ہے، مولانا اسمٰعیل ہنستے ہوئے گیارھویں شریف کی محفل میں بیٹھ گئے، ان کے علاوہ عطاء اللہ شاہ بخاری اور کئی دیگر دیوبندی اور وہابی علماء بھی اس محفل میں شریک تھے سوائے مولانا محمد علی جالندھری (ملتان) کے جو ''بدعت بدعت'' کی گردان کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلے جاتے تھے، اور تبرک لینے سے بھی انکار کرتے تھے، مولانا اسماعیل صاحب نے فاتحہ خوانی میں شرکت کرنے کے بعد کہا کہ اگر یہی گیارھویں شریف ہے تو آپ میرے گھر روزانہ آئیے اور گیارھویں شریف کی فاتحہ

کھچے، پھر انہوں نے تبرک بھی کھایا اور اس کے بعد وہ اکثر والد صاحب سے علمی گفتگو کرتے رہتے تھے، ایک روز گیارھویں شریف کی محفل میں مودودی صاحب بھی شریک ہوئے اور انہوں نے تبرک بھی کھایا، اس دوران ان کی والد صاحب سے چند علمی موضوعات پر گفتگو بھی ہوئی، شام کو میں مودودی صاحب سے ان کی بیرک میں ملا تو وہ مجھے کہنے لگے، مولانا ابوالحسنات سے ملاقات کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے اور ان کے تبحر علمی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے، میرا ارادہ ہے کہ میں اپنا لٹریچر ان کے سپرد کر دوں تاکہ وہ اس کی اصلاح کر دیں، میں نے مودودی صاحب سے کہا کہ اگر ایسا ہو جائے تو یہ بہت بڑا کام ہوگا۔

دوسرے روز میں والد محترم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے مودودی صاحب سے گزشتہ روز کی گفتگو کا ذکر کیا، سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی اس موقع پر موجود تھے انہوں نے کہا یہ سب منافقت ہے مودودی کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا، انہوں نے اس موقع پر مودودی صاحب کے خلاف اور بھی بہت سخت الفاظ استعمال کیے اور پھر جیل میں ان کے ورکروں نے مودودی صاحب کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی، جیل سے باہر مولانا احمد علی لاہوری نے مودودی صاحب کے خلاف اپنی مہم تیز تر کر دی اور روزنامہ نوائے پاکستان کے ذریعے پروپیگنڈے کا اچھا خاصہ محاذ قائم کر لیا، لیکن میں بدستور کسی مناسب موقع کی تلاش میں رہا تاکہ مودودی صاحب سے اس کی اصلاح کروائی جا سکے۔

منیر انکوائری کمیشن کے روبرو مولانا مودودی کی قلابازی

پھر جسٹس منیر (لاہور ہائی کورٹ) انکوائری کمیشن نے تحریک ختم نبوت کے مقدمہ کی باقاعدہ سماعت شروع کر دی، عدالت میں مودودی صاحب کا رویہ انتہائی افسوس ناک اور خلاف توقع تھا، انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ انہیں ڈائریکٹ ایکشن اور تحریک کے دیگر پہلوؤں سے کوئی اتفاق نہیں تھا، اس پر حافظ خادم حسین، مولانا غلام محمد ترنم اور حضرت والد محترم نے سخت جرح فرمائی، مودودی صاحب تو یہاں تک کہہ گئے کہ انہوں نے ڈائریکٹ ایکشن

کے فیصلے پر دستخط ہی نہیں کیے تھے، لیکن والد صاحب نے کہا کہ ہمارے پاس وہ دستاویز اب بھی موجود ہے جس میں ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر آپ نے دستخط کیے تھے، یہ بات سن کر مودودی صاحب نے کہا ہاں میں نے چھوٹے سے دستخط کیے تھے، والد صاحب نے فرمایا تو کیا ہمیں آپ کے دستخطوں کا بورڈ لکھوا کر لگانا چاہیے تھا، مودودی صاحب لاجواب ہو گئے اور والد صاحب نے وہ دستاویز عدالت میں پیش کر دی جس پر ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ تحریر تھا، مودودی صاحب کے علاوہ کسی راہنما نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ اس نے ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط نہیں کیے تھے۔

بہر حال میں پہلے پہل تو مودودی صاحب کے اخلاق سے بہت متاثر تھا لیکن ان کی اس صریح غلط بیانی اور بزدلانہ روش سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی، انکوائری کا سلسلہ جاری رہا لیکن چونکہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت یہ کمیشن بٹھایا گیا تھا اس لیے کوئی واضح نتیجہ سامنے نہ آیا، چنانچہ ممتاز صحافی مرتضیٰ احمد خاں میکش نے اپنی کتاب محاسبہ میں اس کمیشن کی کارکردگی پر تفصیلی تبصرہ کیا اور تمام پہلوؤں کو واضح کیا۔

مولانا ابوالحسنات کے تاریخی جملے

انکوائری کے دوران ایک روز والد محترم دیوانی گھر میں تشریف فرما تھے، مولانا عبدالحامد بدایونی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین، صاحبزادہ فیض الحسن، سید مظفر علی شمسی اور کچھ دیگر حضرات بھی ان کے قریب آ کر بیٹھ گئے، ماسٹر تاج الدین انصاری نے والد صاحب سے کہا حضرت موسم بہار ہے اور مجھے موچی دروازے کی یاد ستا رہی ہے، ہمیں کسی طرح جیل سے باہر جانا چاہیے، حضرت والد صاحب نے فرمایا:

"یہاں ہم ایک عظیم مشن کی تکمیل کے لیے آئے ہوئے ہیں اور پھر میں تو کلام پاک کی تفسیر میں بھی مصروف ہوں باہر جا کر ہم لوگ نہ جانے کن مصروفیات میں اُلجھ جائیں، آئیے بارگاہ الٰہی میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک کے صدقے اس

مقدس مقصد کو پورا فرمائے، جس کی خاطر ہم جیل آئے ہیں، سب نے آمین کہی اور پھر والد صاحب نے دعا فرمائی: الٰہی اپنے حبیب کریم کے صدقے اس جیل کے قیدیوں کو آزادی کی نعمت سے متمتع فرما، اس جیل کی دیواروں کو گرا دے اور یہاں باغ و بہار بنا دے۔"

سب نے اس دعا پر بھی آمین کہی، یہ کچھ ایسی مقبول ساعت تھی کہ آج اس دعا کا ایک ایک لفظ مقبول و منظور ہو کر ہمارے سامنے آرہا ہے، وہی سنٹرل جیل آج شادمان کالونی میں تبدیل ہو چکی ہے، اس کی اونچی اونچی دیواریں گر چکی ہیں اور جیل کی بیرکیں اب باغ و بہار کا نقشہ پیش کر رہی ہیں۔ شادمان کالونی کے مشرقی حصے میں وہ بڑ کا درخت اب بھی موجود ہے جس کے نیچے یہ دعا کی گئی تھی اور جس کے نیچے بیٹھ کر والد صاحب تفسیر لکھا کرتے تھے۔

جیل سے رِہائی

تقریباً ایک سال بعد ہائی کورٹ نے کراچی میں گرفتار ہونے والے تمام رہنماؤں کو رہا کر دیا لیکن مولانا نیازی، مولانا مودودی اور مجھے رہا نہیں کیا گیا تھا۔

ایک طویل عرصے تک جیل میں رہنے سے تقریباً سبھی حضرات ذیابیطس کے مریض ہو گئے تھے، ادھر عوام کے دلوں میں تحریک کے جذبات ابھی تک موجود تھے لیکن جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا اور بے انتہا تشدد کر کے تحریک کو کچلنے میں کوئی کسر روا نہ رکھی گئی تھی، ہمارے علاوہ تحریک کے دیگر بہت سے رضا کار بھی ابھی تک جیلوں میں تھے، جیل سے رہا ہونے والے زعماء نے اپنے مطالبات کے احیاء کے لیے دہلی دروازے کے باہر ایک عظیم الشان جلسہ کیا، اس جلسہ کی صدارت قبلہ والد صاحب نے کی، اور مختلف راہنماؤں نے اس جلسہ سے خطاب کیا اور تحریک کے حامیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا، اس کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد (جون ۱۹۵۵ء) میں ایک روز میں نماز عصر کے بعد بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک جیل کے ایک افسر نے آ کر کہا کہ آپ کی رہائی کے آرڈر آئے ہیں، میرے لیے یہ بات خلاف توقع تھی اور پہلے میں

نے اسے مذاق ہی سمجھا لیکن پھر جیل کے افسر نے چلنے کو کہا تو مولانا نیازی اور مولانا مودودی نے مجھے مبارک باد دی، میری رہائی کے تقریباً چھ سات ماہ بعد مولانا نیازی اور مولانا مودودی کو بھی رہا کر دیا گیا۔

جیل سے رہائی کے بعد مودودی صاحب نے ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں انہوں نے دیگر معززین شہر کے علاوہ مجھے بھی مدعو کیا، میں نے اس موقع پر مودودی صاحب سے کہا اب حالات معمول پر آچکے ہیں اپنا وعدہ پورا کیجئے اور اپنا سارا لٹریچر مجھے دیجئے تاکہ والد صاحب سے اس کی اصلاح کروادوں، لیکن مولانا مودودی نے ٹالنے کی کوشش کی، میں نے اصرار کیا تو کہنے لگے جیل میں میرا ارادہ تو بنا تھا لیکن اب جو چیز چھپ چکی ہے اس کو بدلنا بہت مشکل ہے۔[1]

☆

[1] ماہ نامہ کنز الایمان، محاصرۂ قادیانیت نمبر، ص ۵۶۹

جسٹس منیر انکوائری کمیشن

تحریک کے نتیجہ میں برپا ہونے والے فسادات کی تحقیق و تفتیش کے لیے گورنر پنجاب نے ۱۹رجون ۱۹۵۳ء کو ایک آرڈی ننس صادر کیا جسے بعدازاں چند ترمیمات کے بعد "فسادات پنجاب (تحقیقات عامہ) ایکٹ ۱۹۵۳ء" کا نام دیا گیا جس میں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ فسادات کے متعلق تحقیقات عامہ کرنے کی غرض سے ایک عدالت قائم کی جائے۔

آرڈی ننس کی دفعہ ۳ کی ذیلی دفعہ (۱) کے ماتحت جو اختیارات گورنر کو حاصل تھے، ان کو استعمال کرتے ہوئے گورنر نے جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم آر کیانی پر مشتمل تحقیقاتی عدالتی کمیشن قائم کیا اور ہدایت کی کہ مندرجہ ذیل دائرہ شروط میں رہتے ہوئے فسادات کی تحقیق کریں:

۱۔ وہ کیا کوائف تھے جن کی وجہ سے چھ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں مارشل لاء کا اعلان کرنا پڑا؟

۲۔ فسادات کی ذمہ داری کس پر ہے اور

۳۔ صوبے کے سول حکام نے فسادات کے حفظ ماتقدم یا تدارک کے لیے جو تدابیر اختیار کیں۔ آیا وہ کافی تھیں یا ناکافی؟

اس انکوائری کمیشن یا تحقیقاتی عدالت نے یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو تحقیقی کارروائی کا آغاز کیا اور کل 117 اجلاس منعقد کیے جن میں 92 اجلاس شہادتوں کی سماعت اور اندراج کے لیے مختص رہے۔ شہادتوں کا سلسلہ ۲۳رجنوری ۱۹۵۴ء تک جاری رہا اور مقدمے پر بحث یکم فروری سے ۲۸رفروری ۱۹۵۴ء تک جاری رہی۔ پانچ ہفتوں میں ممبران عدالت نے اپنے نتائج فکر مرتب کیے اور رپورٹ قلم بند کی۔

اس ساری تحقیقاتی کارروائی کا ریکارڈ تحریری بیانات کے 3600 صفحات اور شہادت

کے 2700 صفحات پر مشتمل ہے۔ 339 دستاویزات عدالت میں پیش کی گئیں اور شہادت اور بحث کے دوران کثیر کتب، کتابچے، رسالے اور اخبارات وغیرہ بھی پیش کیے گئے، نیز کئی عدد خطوط بھی موصول ہوئے۔ اس کے علاوہ خفیہ اداروں کی رپورٹوں کو بھی رپورٹ مرتب کرتے ہوئے پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ جماعت اسلامی اور مولانا عبدالستار خان نیازی نے اپنے تحریری بیانات بھی جمع کروائے۔

اس تحقیقاتی کمیشن کے رو برو مجلس عمل کی نمائندگی مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش نے کی جب کہ مجلس احرار کی جانب سے مولوی مظہر علی اظہر پیش ہوئے اور جماعت اسلامی کی نمائندگی مسٹر سعید ملک نے کی۔

تحقیقاتی عدالت نے اپنی رپورٹ ۱۰/اپریل ۱۹۵۴ء کو ہوم سیکرٹری، حکومت پنجاب کو پیش کی۔ یہ رپورٹ انگریزی زبان میں ترتیب دی گئی تھی تاہم اس کا اُردو ترجمہ بھی بعد ازاں شائع کیا گیا جو کہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔ تحقیقاتی عدالت نے اپنی رپورٹ کو چھ حصوں میں منقسم کیا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

حصہ اوّل: تقسیم ہند سے لے کر آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقدہ لاہور ۱۳/جولائی ۱۹۵۲ء تک

حصہ دوم: کنونشن سے ۲۱/جنوری ۱۹۵۳ء تک جب وزیراعظم کو الٹی میٹم دیا گیا

حصہ سوم: الٹی میٹم کی تاریخ سے لے کر فسادات کے خاتمے تک

حصہ چہارم: وہ کوائف جو مارشل لاء کا باعث ہوئے

حصہ پنجم: فسادات کی ذمہ داری

حصہ ششم: سول حکام کی انتظامی کارروائی کافی تھی یا نہیں

اس رپورٹ کی اشاعت پر مختلف حلقوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ معروف صحافی مرتضیٰ احمد خاں میکش (ایڈیٹر روزنامہ نوائے پاکستان) نے اس رپورٹ پر ایک جامع تبصرہ قلم بند کیا جو کہ روزنامہ نوائے پاکستان کی ایک خاص اشاعت بنام "رپورٹ نمبر" مورخہ ۲۹/اگست ۱۹۵۴ء کو

شائع ہوا،اور ہماری مرتبہ کتاب رد قادیانیت اور سنی صحافت کی جلد سوم میں شامل ہے۔

جناب میکش نے اس ضخیم رپورٹ کو ہاتھی کی مانند قرار دیا ہے،جس کے مختلف اعضاء کو چھ اندھوں نے اپنے ہاتھوں سے ٹٹولا اور اپنی حس لامسہ کی مدد سے ہاتھی کے متعلق ہر ایک نے اپنا جدا جدا مخصوص تصور قائم کرلیا۔ایک نے کہا ہاتھی ایسا تھا جیسے عمارت کا ستون،دوسرا بولا ایک بہت بڑا چھاج،تیسرے نے کہا موٹا سا اژدھا،چوتھے نے کہا ہاتھ بھر کی موٹی رسی،پانچویں نے کہا ناہموار سا چبوترہ،چھٹے نے کہا وہ تو ایک دیوار سی تھی اور بس۔یعنی اس رپورٹ کو ہر شخص نے اپنی سمجھ کے مطابق سمجھا اور اپنا تصور قائم کرلیا۔جناب میکش نے اپنے تبصرہ میں جن نکات کا اظہار کیا،ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔حکومت پنجاب نے فسادات کے سدباب کے لیے جو اقدامات کیے وہ کافی نہ تھے یوں حکومت آئین وقانون کی حفاظت کے فرض کی بجا آوری سے قاصر رہی۔

۲۔رپورٹ کے مطابق انتظامیہ،پولیس اور مارشل لاء حکام فسادات کی کیفیت پیدا کرنے اور ہر طرح کے اشتعال انگیز ماحول بنانے سے بری الذمہ ہیں اور فسادات او رنزاعی کیفیت کی مکمل ذمہ داری مجلس احرار اور اس کے قائدین پر عاید ہوتی ہے۔

۳۔بعد از تحقیق عدالت اس نتیجہ پر پہنچی کہ قادیانیوں/مرزائیوں/احمدیوں کے نظریات مسلمانوں کے عقائد سے متغائر ہیں اور مسلمانوں کے لیے ان کا طرز عمل،ان کی جارحانہ تبلیغ اور ان کے عزائم بدرجہ غایت دل آزارانہ اور اشتعال انگیز ہیں۔خود ان کے امام مرزا بشیر الدین محمود،چوہدری ظفر اللہ خان اور مرزائی سرکاری افسروں نے منافرت کے اس جذبے کو ترقی دی جو مسلمانوں میں مرزائیوں کے متعلق پہلے ہی سے بدرجہ اتم موجود تھا۔عدالت نے قادیانیوں کو فسادات کی براہ راست ذمہ داری سے بری قرار دیا یعنی بالواسطہ ذمہ داری کا مورد ٹھہرایا۔اور اس کا سبب قادیانیوں کے عجیب وغریب عقائد،ان کی جارحانہ اور اشتعال انگیزانہ سرگرمیوں اور قادیانی سرکاری افسروں کے نازوا شوق تبلیغ کو قرار دیا ہے جو پاکستان میں مذہبی

تفوق (برتری) حاصل کرنے کی غرض سے اختیار کیا گیا۔

۴۔عدالت نے حکومت پنجاب بالخصوص پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کو فسادات کی ذمہ داری میں اس بناء پر شریک گردانا کہ پنجاب حکومت نے احرار کی ایسی سرگرمیوں کو روکنے میں چشم پوشی اور رعایت سے کام لیا جو قانون کی زد اور گرفت میں آسکتی تھیں اور پبلک میں ہر دل عزیز بننے کی خاطر قانون وآئین کا احترام قائم رکھنے کے معاملے میں کوتاہی اور غفلت سے کام لیا اور ایسے اخبارات کو مالی امداد دی جو ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز (Director Public Relations) کے ایما پر تحریک کو خاص رخ پر ڈالنے کے لیے مضامین شائع کرتے تھے۔

۵۔عدالت نے خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان کی مرکزی حکومت کو اس وجہ سے فسادات کا ذمہ دار قرار دیا کہ اس نے چوہدری ظفر اللہ خان کو محض دیگر ملکوں کی چہ میگوئیوں کے خوف سے وزارت سے برطرف نہ کیا اور مسلمانوں کے مطالبات کو مسترد کر کے ہیجان عمومی کو ترقی دی۔مزید برآں عدالت نے تعلیمات اسلامیہ کے سرکاری بورڈ کو بھی ذمہ داری کا شریک ٹھہرایا کیونکہ اس بورڈ کے ارکان بھی مجلس عمل کے اقدامات سے متفق تھے۔

۶۔عدالت نے اپنی رپورٹ میں مجلس احرار، جماعت اسلامی اور مرزائیوں کی جماعت کا تحریک پاکستان کی مخالفت میں کردار کو تسلیم کیا ہے۔

۷۔عدالت نے جماعت اسلامی کو مجلس عمل کا عضو تسلیم کیا ہے اور مجلس عمل کو اس بنا پر فسادات کی ذمہ داری میں شریک گردانا ہے کہ اس نے اپنے مطالبات کی منظوری کے لیے راست اقدام کا فیصلہ کیا۔

۸۔عدالت کے خیال میں مسلم لیگ اس لیے ذمہ دار ہے کہ اس کی صوبائی کونسل نے ایسی قرارداد منظور کی جس میں قادیانیوں کو مسلمانوں سے جداگانہ عقائد رکھنے والا گروہ قرار دیا اور مسلم لیگ کے بعض لیڈروں اور کارکنوں نے تحفظ ختم نبوت اور راست اقدام کی تحریکات میں

عملی حصہ لیا اور مجلس عمل کا ساتھ دیا اور دوسرے لیڈروں اور کارکنوں نے راست اقدام کی تحریک کی مخالفت نہ کی۔

۹۔ رپورٹ میں فاضل جج صاحبان نے احرار کی مذمت کرنے میں پورا زورِ قلم صرف کیا ہے کیوں کہ انہوں نے ایک دینی موضوع کو دُنیوی مقصد کی خدمت پر لگا کر اس کا استخفاف کیا اور اپنی ذاتی اَغراض کی خاطر عامۃ الناس کے مذہبی جذبات سے ناجائز فائدہ اُٹھایا لیکن جہاں تک موضوع فساد کے دینی ہونے کا تعلق ہے عدالت کو اس کی صحت، اہمیت اور موجودگی سے انکار نہیں بل کہ عدالت نے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ مسلمانوں اور قادیانیوں کے درمیان مذہبی حیثیت سے اہم بنیادی اختلافات روزِ اوّل ہی سے موجود تھے اور موجود ہیں۔

۱۰۔ عدالت نے اپنی رپورٹ میں تسلیم کیا ہے کہ مرزا قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ قادیانی وکیل نے عقیدہ اجرائے نبوت کی تائید میں قرآن پاک کی جو آیات پیش کیں اور جس نوعیت کے استدلال سے کام لیا۔ اس پر فاضل جج صاحبان نے رائے زنی کرتے ہوئے تحریر کیا ہے: ایک سلسلہ استدلال کی بناء پر قرآن پاک کی ان آیات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مستقبل میں یعنی ہمارے رسول اقدس و اطہر ﷺ کے بعد بھی ایسے لوگ ظاہر ہوتے رہیں گے جن پر لفظ نبی یا رسول کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

۱۱۔ عدالت تحقیقات نے قادیانیوں کے خلاف مسلمانوں کی ایک بہت بڑی شکایت کی صحت کو من وعن تسلیم کیا ہے کہ مرزا غلام احمد نے اپنی تحریرات میں انبیاء کرام علیہم السلام اور حضور سید المرسلین ﷺ پر اپنی فضیلت کا اظہار کر کے مسلمانوں کی سخت دل آزاری کی ہے اور قادیانی اپنی مطبوعات میں مسلمانوں کی مقدس مصطلحات مثلاً امیر المومنین، اُم المومنین، سیدۃ النساء، صحابہ کرام کو جن کا محل استعمال مخصوص ہو چکا ہے۔ اپنے اکابر کے لیے استعمال کر کے دل آزاری کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔

۱۲۔ عدالت تحقیقات نے اس امر پر بھی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے کہ قادیانی نہ صرف

دیگر اسلامی مملکتوں پر برطانیہ کے راج کو ترجیح دیتے تھے بل کہ تقسیم ہند سے پہلے وہ پاکستان کی اسلامی مملکت کے قیام کے بھی مخالف تھے اور اب بھی اس اَمر کے خواہاں ہیں کہ ہندوستان پھر سے متحد ہو کر اکھنڈ بھارت بن جائے۔

۱۳۔ عدالت نے اس اَمر کو بھی تسلیم کر لیا کہ احمدی سرکاری افسر اور ملازم دوسروں کا مذہب تبدیل کراتے رہے ہیں اور اپنی جداگانہ جماعتی تنظیم رکھتے ہیں۔ اس تنظیم کے دفاتر میں اُمورِ خارجہ کا محکمہ بھی ہے اور اُمورِ داخلہ، اُمورِ عامہ اور نشر و تبلیغ کے محکمے بھی قائم ہیں، ان کے ہاں رضاکاروں کا ایک جیش بھی ہے جس کا نام خدام الاحمدیہ ہے اور فرقان بٹالین یعنی کشمیر میں کام کرنے والے مخصوص احمدی بٹالین پر مشتمل ہے۔

۱۴۔ قادیانی مسلمانوں سے رشتے ناطے کا تعلق بھی نہیں رکھتے اور نہ مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ وہ کسی مسلمان کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھتے۔

۱۵۔ مرزائیوں کی جانب سے مسلمانوں کی برملا تکفیر بارے عدالت نے مرزائیوں کے سابقہ کثیر اعلانات کا مطالعہ کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ اعلانات اس کے سوا اور کسی تشریح کے حامل نہیں کہ جو لوگ مرزا غلام احمد پر ایمان نہیں رکھتے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔

۱۶۔ عدالت نے تسلیم کیا ہے کہ احمدیوں/مرزائیوں کی جارحانہ تبلیغ نہ صرف پاکستان میں بل کہ دوسرے ملکوں میں بھی ہنگاموں اور حملوں کی وجہ بنتی رہی ہے۔

احراری مورخ تحقیقاتی عدالت کی اس رپورٹ کی مذمت کرتے ہیں یقیناً اس کا سبب یہ ہے کہ اس رپورٹ میں تمام تر فسادات کی ذمہ داری مجلس احرار پر ڈالی گئی ہے جب کہ مرزائیوں کو ان فسادات کا براہ راست ذمہ دار قرار نہیں دیا گیا۔ اس کے برعکس احراری مورخ فسادات کی ذمہ داری حکومتی دوغلی پالیسی بل کہ مرزائیت نوازی سمجھتے ہیں اور فسادات کی ذمہ داری انتظامیہ اور مرزائیوں پر ڈالتے ہیں۔

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت حکومتی تشدد اور مارشل لاء حکام کے جبر و بربریت کے سبب

وقتی طور پر دب گئی۔ اس کے بعد طویل عرصہ ملک مارشل لاء کی لپیٹ میں رہا، یہاں تک کہ ۱۹۷۱ء میں وطن عزیز دولخت ہو گیا۔ کلیدی عہدوں پر متمکن قادیانی افسروں کی سازشوں بالخصوص مرزا بشیر الدین محمود قادیانی کا داماد ایم ایم احمد (جو کہ طویل عرصہ تک حکومت کا اقتصادی مشیر رہا) کی بنگال مخالف پالیسی کے سبب بنگالیوں میں احساسِ محرومی پروان چڑھتا رہا اور پھر بھارتی مداخلت سے مکتی باہنی مستحکم ہوئی اور ۱۶؍دسمبر ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔

یہاں تک کہ ۳۰؍جون ۱۹۷۴ء کو ربوہ کا سانحہ رونما ہوا اور ملک بھر میں ایک نئی تحریک ختم نبوت کا آغاز ہو گیا جس کے نتیجہ میں آئین پاکستان میں دوسری ترمیم کرتے ہوئے آئینی طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔ تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء کے متعلق راقم کی کتاب ''تحریک ختم نبوت اور نوائے وقت'' نیز ''تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء'' (اخبارات و رسائل کے اداریے، شذرات) کا مطالعہ مفید رہے گا۔ رسالہ ''المنتہیٰ'' نے تحریک ختم نبوت کے متعلق پارلیمنٹ کی کارروائی کو تین زبانوں میں ''قادیانیت پر آخری ضرب'' کے نام سے شائع کیا ہے جو کہ اپنی نوعیت کی منفرد اشاعت ہے۔

☆

تحریک ختم نبوت 1953ء میں علماء ومشائخ اہلسنت کا کردار

محمد احمد ترازی (کراچی)

☆ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کیلئے کی جانے والی جدو جہد میں تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کو جو اہمیت اور مقام حاصل ہے۔آج اس سے کون واقف نہیں ہے۔

☆ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء بلاشبہ ایک عظیم تحریک ہے۔اس تحریک کے قائدین و رہنما اور تمام شرکاء وہ مردان خدا مست ہیں جن کی زندگی جہد مسلسل اور قربانیوں سے عبارت ہے۔انہوں نے فتنہ قادیانیت کے خلاف بے سروسامانی کے باوجود ایسی کاری ضرب لگائی جس نے اس تحریک کو ۷، ستمبر ۱۹۷۴ء کے تاریخ ساز دن تک پہنچنے کی راہ آسان کردی۔آج پوری ملت اسلامیہ اہل سنّت و جماعت کے ان اکابر علماء ومشائخ اور عوام کی شکرگزار ہے جن کی لازوال جدو جہد نے دنیا کو یہ دن دکھایا۔

☆ اس باب میں ہم ان اکابرین تحریک کے کردار اور کارناموں کا مختصراً جائزہ لے کر انہیں خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

تحریک کے اسباب ومحرکات

چوہدری ظفر اللہ خان قادیانی کا پاکستانی وزات خارجہ کا قلمدان سنبھالتے ہی قادیانی جماعت کے سربراہ مرزا محمود قادیانی اور اس کے حواریوں نے پاکستانی سیاست اور اہم انتظامی اداروں میں بڑی سرگرمی سے دخل اندازی شروع کردی۔مرزا محمود قادیانی نے ستمبر ۱۹۴۷ء سے جنوری ۱۹۴۸ء تک قادیانی ترجمان اخبار الفضل میں پاکستان کے معاشی اور

خود انحصاری کے حوالے سے مضامین لکھے۔ ان مضامین میں اُس نے ہندوستان کے ساتھ ہر ممکن تعاون کے نظریئے پر زور دیا۔ اُس کی خواہش تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کو اپنی دفاعی حکمت عملی کے لئے ایک مشترکہ مقصد پروان چڑھانا چاہیے۔ دراصل یہ اُن کی وہی پرانی خواہش ناتمام تھی، جس کے تانے بانے اُن کے اکھنڈ بھارت، اپنی اقلیتی جماعت کی بالادستی اور قادیان کی مرکزیت کے خود ساختہ تصور سے جاملتے تھے۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کا دن پاکستانی قوم کیلئے انتہائی دکھ اور تکلیف کا باعث تھا۔ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی وفات کے سانحے نے پوری قوم کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ ابھی لوگ اپنے عظیم قائد اور محبوب رہنما کی وفات کے سانحے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ انہیں ایک اور دھچکا پاکستان کے قادیانی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خاں نے قائد اعظم محمد علی جناح کو غیر مسلم قرار دے کر اُن کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کر کے پہنچایا۔ کیونکہ قادیانی کھلے عام دنیا بھر کے مسلمانوں کو کافر قرار دیتے تھے۔ اِس لیے اُن کے نزدیک قائد اعظمؒ کیلئے بھی کوئی استثنیٰ نہیں تھا۔ قادیانی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خاں کی قائد اعظم کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کے عمل نے پورے پاکستان میں قادیانیوں کیلئے نفرت کے جذبات کو اور تیز کرنے کے ساتھ اُن کی تشویش میں بھی اضافہ کر دیا اور پاکستان کے مسلمان محسوس کرنے لگے کہ قادیانی مسئلہ انگریزی دور سے بھی بڑھ کر اب اُن کیلئے زیادہ خطرناک بنتا جارہا ہے۔

اِس موقع پر پاکستان کے معروضی اور غیر مستحکم سیاسی حالات سے مرزا محمود قادیانی نے بھرپور فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے اپنے آپ کو سیاسی حلقوں میں متعارف کرانے کیلئے ملک کا دورہ شروع کیا۔ مرزا محمود قادیانی نے سیالکوٹ، جہلم، کراچی، پشاور، راولپنڈی اور کوئٹہ میں اجتماعات سے خطاب کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جماعت کے ایسے اجتماعات منعقد کروائے جن میں اُس کی جماعت کے علاوہ اہم سول و فوجی افسران اور سیاسی قائدین نے شرکت کی۔ اِن اجتماعات میں مرزا محمود قادیانی نے اُن کے سامنے دفاعی حکمت عملی سمیت پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ مرزا محمود قادیانی کی ان تمام

کوششوں کا اصل مقصد روزنامہ ''دی مسلم'' اسلام آباد واضح کرتے ہوئے یوں لکھتا ہے:

''اپنے نظریے کے ایک حصے کے طور پر قادیانیوں نے مسلمانوں کی صفوں میں انسانی کمزوریوں کا فائدہ اٹھایا، معصوم اذہان کو انتشار کا شکار کیا اور انہیں (مرزا غلام احمد قادیانی کی) جعلی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دی...... جب آزادی کے ابتدائی ایام میں پاکستان اپنی بقاء کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، تو سامراج کا یہ نیا ایڈیشن (قادیانی) افسر شاہی، مسلح افواج اور دوسرے سرکاری و نیم سرکاری اداروں کی جڑوں میں بیٹھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ (اور اُن کی جماعت کے افراد) ان (اہم) اداروں کی کلیدی اسامیوں پر قبضے کے بعد اپنے ماتحتوں کو احمدی بنانے کی کوششوں میں لگے رہے۔ یہ خالصتاً خدا اور انسان کے درمیان مذہبی معاملہ نہ تھا اور نہ ہی قائداعظم کی پالیسی کے مطابق تھا۔ یہ ''شدھی'' کی طرح کی ایک منظم اور اجتماعی تحریک تھی، یہ ایک طرح کا (دینی) استحصال، جارحیت اور مذہبی ارتداد تھا۔ سیکولرازم کے پرچارک یا روشن خیال جمہوری سلطنتیں نہ تو ایسے جارحانہ عزائم رکھتی ہیں اور نہ ان پر دھیان دیتی ہیں۔ نتیجتاً قادیانیوں کو عوامی اذہان کے ساتھ کھل کر کھیلنے کا بلا روک ٹوک موقع مل گیا۔ انہیں خوب سیاسی اثر و نفوذ حاصل ہو گیا۔ جس سے وہ ہر ایسے شخص یا تنظیم کو شکست دینے کے قابل ہو گئے، جو اُن کے منصوبوں یا خواہشات کے خلاف کام کرے۔''[1]

قادیانی خلیفہ مرزا محمود نے پشاور میں ڈاکٹر خان صاحب اور خدائی خدمت گار خان عبدالغفار خان سے بھی ملاقات کی۔ پشاور سے واپسی پر راولپنڈی میں ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے اُس نے مسئلہ کشمیر پر اہم کردار ادا کرنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔ مرزا محمود کی اِن تمام کوششوں اور کاوشوں کا اولین مقصد اپنے اور اپنی قادیانی جماعت کیلئے لوگوں کے دلوں میں نرم گوشے کے حصول کے ساتھ کرسیٔ اقتدار تک پہنچنا بھی تھا۔ اُس نے اپنے مریدین کو ہدایت جاری کی جو حکم کا درجہ رکھتی تھی کہ:

---

[1] روزنامہ ''دی مسلم'' اسلام آباد ۲۷ مئی ۱۹۸۴ء

"اقتدار حاصل کرو، اگر پُر امن ذرائع سے حاصل نہ ہوسکے تو قوت سے حاصل کرو۔"[1]

ساتھ ہی مرزا محمود نے قادیانیوں کو یہ ہدایت بھی جاری کی کہ وہ لوگوں کو مرزائی بنانے کیلئے بھرپور ارتدادی مہم شروع کر دیں۔ اُس نے اپنے سیاسی دوروں کے دوران اپنے پیروکاروں کو یہ نصیحت بھی کی کہ:

"وہ کم آبادی والے وسیع و عریض بلوچستان کی آبادی کو قادیانی بنانے پر توجہ دیں، تاکہ احمدی (قادیانی) اِس قابل ہوسکیں کہ کم از کم ایک صوبے کو تو اپنا کہہ سکیں۔"[2]

اِس سلسلے میں مرزا محمود کی کوئٹہ والی تقریر جو قادیانی اخبار الفضل میں ۱۳، اگست ۱۹۴۸ء کو شائع ہوئی، کے بارے میں منیر انکوائری رپورٹ کہتی ہے:

"اُس نے اپنی جماعت سے اپیل کی تھی کہ بلوچستان میں اپنے پروپیگنڈا کو تیز کر دیں تاکہ یہ صوبہ آئندہ سرگرمیوں کا مرکز بن جائے۔"[3]

مرزا محمود صوبہ بلوچستان کو قادیانی ریاست میں تبدیل کرنے کی شدید تمنا رکھتا تھا۔ اُس نے اِس منصوبے کو حقیقت کا روپ دینے کیلئے اپنے پیروکاروں کو ہدایت کی کہ:

"یہی علاقہ ہے جس کے متعلق میں نے کہا تھا بہت چھوٹا سا ہے۔ اگر تم کوشش کرو اور ہمدردی کے جذبات لے کر لوگوں کے پاس جاؤ تو یہ سارا علاقہ احمدی ہوسکتا ہے۔ اِس بات پر تین سال گزر گئے لیکن اِس کام کے کرنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ بے شک کتے بھونکتے رہیں گے۔ قافلہ چلتا رہے گا۔"[4]

اُس نے بلوچستان کو اپنی شکارگاہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ صوبہ بلوچستان (ابھی) ہمارے

---

[1] بشیر احمد، تحریک احمدیت یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ، ص: ۵۲۴، ادارہ اصلاح و تبلیغ، آسٹریلیا بلڈنگ ریلوے اسٹیشن لاہور
[2] اخبار الفضل، ۱۳، اگست ۱۹۴۸ء، مشمولہ تحریک احمدیت یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ، ص: ۵۲۶، ادارہ اصلاح و تبلیغ، آسٹریلیا بلڈنگ ریلوے اسٹیشن لاہور
[3] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۲۱۳
[4] اخبار الفضل، ۵، جولائی ۱۹۵۰ء، مشمولہ سازشوں کا دیباچہ، رائے محمد کمال، ص: ۲۱۱، کرم پبلی کیشنز مصطفیٰ آباد لاہور

ہاتھ سے نکلا نہیں ہے اور دنیا کی ساری قومیں مل کر بھی ہم سے علاقہ نہیں چھین سکتی ہیں۔

اُس نے بلوچستان کو قادیانی ریاست میں تبدیل کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ

''اپنا یا بیگانہ، کوئی اعتراض کرے، کوئی پرواہ نہیں۔ ہونا وہی ہے جو میں نے کہا ہے اور وہی ایک دن ہم کرکے رہیں گے۔''[1]

چنانچہ مرزا محمود نے اپنی دلی تمنا کو عملی جامہ پہنانے کیلئے جماعت کو حکمت عملی تبدیل کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے کہا کہ

''جماعت کو چاہیئے کہ وہ اپنے اندر ایک نئی تبدیلی پیدا کرے۔ ایک ایسی تبدیلی جو ایک قلیل ترین عرصے میں اُسے دوسری قوتوں پر غالب کردے۔''[2]

اس حوالے سے منیر انکوائری رپورٹ میں مذکور ہے کہ مرزا محمود نے ۱۹۵۱ء کے کرسمس کے موقع پر صدر انجمن احمدیہ ربوہ کے سالانہ اجلاس سے خطاب میں اپنے پیروؤں سے پرجوش اپیل کی کہ اپنی تبلیغی (یعنی ارتدادی) سرگرمیوں کو تیز تر کردیں تاکہ جو لوگ اب تک منکر (کافر) رہے ہیں۔ وہ ۱۹۵۲ء کے آخر تک احمدیت (قادیانیت) کے آغوش میں آجائیں۔[3]

مرزا محمود قادیانی نے کئی بار علی الاعلان اس بات کا اظہار بھی کیا کہ ایک باقاعدہ منظم کوشش کے ساتھ مختلف سرکاری محکموں میں قادیانیوں کو داخل کیا جائے اور پھر سرکاری عہدوں پر قبضہ کرکے حکومت کی مشینری کو قادیانی جماعت کے مفاد میں استعمال کیا جائے۔ اُس نے اپنی ذریت کو ایک یا دو محکموں میں بھیڑوں کی طرح جمع ہونے کی بجائے تمام کلیدی شعبوں میں پھیل جانے کی ترغیب دیتے ہوئے کہا کہ

۱۔ اخبار الفضل، ۲۹، ۳۰، جولائی ۱۹۵۲ء، مشمولہ سازشوں کا دیباچہ، راے محمد کمال، ص: ۲۱۲، کرم پبلیکیشنز مصطفیٰ آباد لاہور

۲۔ اخبار الفضل، ۲۲، جولائی ۱۹۴۹ء، مشمولہ سازشوں کا دیباچہ، رائے محمد کمال، ص: ۲۱۱، کرم پبلیکیشنز مصطفیٰ آباد لاہور

۳۔ اخبار الفضل، ۱۶، جنوری ۱۹۵۲ء، رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۲۱۳

"صرف ایک محکمے یعنی فوج ہی میں جمع نہ ہوں بلکہ تمام دوسرے محکموں میں پھیل جائیں۔"[1]

مرزا محمود کا اصل مقصد فوج کے علاوہ دیگر محکموں میں اپنے افراد کی موجودگی سے قادیانیوں کے معاشی استحکام کے ساتھ ساتھ اپنی جماعت کے سیاسی اثر ورسوخ میں اضافہ اور اقتدار کی دوڑ کو اپنے ہاتھ میں لے کر قادیانی مملکت کے خواب کو عملی شکل دینا تھا۔ چنانچہ وہ قیام پاکستان کے بعد سے مسلسل اپنے پیروکاروں کو دشمن (مسلمانوں) کے مقابلہ پر اُکساتا اور بھڑکاتا رہا اور اُن کے اندر جنگجویانہ ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اِس دوران اُس نے انتہائی شر انگیز بیانات دیئے۔ جیسے کہ

"لوگ (یعنی قادیانی) گھبراتے ہیں کہ اُن کی مخالفت کیوں کی جاتی ہے۔ لوگ جھنجھلا اُٹھتے ہیں کہ اُن کی عداوت کیوں جاتی ہے۔ لوگ چڑتے ہیں کہ انہیں دکھ کیوں دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر گالیاں دینے اور دکھ دینے کی یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارا شکار ہیں، تو پھر ہمیں گھبرانا نہیں چاہیے اور نہ کسی قسم کی فکر کرنا چاہیے۔ بلکہ ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ دشمن (مسلمان) یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر ہم میں کوئی نئی حرکت پیدا ہوئی تو ہم اُس کے مذہب کو کھا جائیں گے۔"[2]

قادیانیوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی اثر ورسوخ، مرکزی عہدوں پر قادیانی افسران کی تعیناتی اور کلیدی اداروں میں روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد نے مرزا محمود کو کامیابی کے خواب دکھانے شروع کر دیئے، جس سے اُس کے جنون میں اِس قدر اضافہ ہوگیا کہ اُس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور لہجے میں کرختگی عود کر آئی۔ اُس نے اشتعال انگیز انداز میں کھلم کھلا مسلمانوں کو دھمکیاں دیں اور پوری ملت اسلامیہ کو چیلنج کرتے ہوئے کہا

"ہم فتح یاب ہوں گے۔ ضرور تم (مسلمان) مجرموں کی طرح ہمارے سامنے پیش

---

1. اخبار الفضل، ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء، مشمولہ رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۲۱۳
2. اخبار الفضل، ۱۶ جنوری ۱۹۳۹ء، مشمولہ سازشوں کا دیباچہ، رائے محمد کمال، ص: ۲۰۸، کرم بجلی کیمشر مصطفیٰ آباد لاہور

ہو گے۔ اُس وقت تمہارا حشر بھی وہی ہوگا، جو فتح مکہ کے دن ابو جہل اور اُس کی پارٹی کا ہوا تھا۔"[1]

مرزا محمود نے قادیانی جماعت کو ہدایت جاری کی کہ

"۱۹۵۲ء کو گزرنے نہ دیجئے جب تک کہ احمدیت (قادیانیت) کا رعب دشمن اس رنگ میں محسوس نہ کرے کہ اب احمدیت (قادیانیت) مٹائی نہیں جا سکتی اور وہ مجبور ہو کر احمدیت (قادیانیت) کی آغوش میں آ گرے۔"[2]

مرزا بشیر الدین محمود قادیانی کے اِن بیانات اور خوفناک عزائم نے مسلمانانِ پاکستان اور محب وطن علماء و مشائخ میں شدید بے چینی کی فضا پیدا کر دی۔ دوسری طرف اس بے چینی کو مزید بڑھاوا دینے میں حکومت کا بھی اہم کردار رہا۔ حکومتی نوازشات کے نتیجے میں قادیانی لٹریچر کھلے عام تقسیم ہونے لگا۔ سرکاری دفاتر میں بانیٔ پاکستان کے بجائے مرزا قادیانی کی تصاویر آویزاں کی جانے لگیں۔ مرزا قادیانی پر تنقید و جرح قانوناً جرم قرار پائی۔ جس کی ذرا سی خلاف ورزی پر کوڑوں، بھاری جرمانے اور قید با مشقت کی سزائیں دی جاتیں۔ سفارت خانوں، پاک افواج اور ہر اہم محکمے میں کلیدی عہدوں پر قادیانی افسران براجمان ہو گئے۔ اور تو اور درسگاہوں میں قادیانی اساتذہ کی کھیپ مستقبل کے معماروں کے ذہنوں کو قادیانیت کے زہر سے پراگندہ کر رہی تھی۔

چنانچہ اِن نازک حالات کو دیکھتے ہوئے محب وطن اور درد مند مسلمان زعماء میں بے چینی کا پیدا ہونا ایک فطری عمل تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اسلام کے نام پر لاکھوں جانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کیا جانے والا ملک اب قادیانی ذریت کے رحم و کرم پر ہے۔ اِس تناظر میں عوام اور علماء و مشائخ کی جانب سے فطری ردِعمل قادیانیت کے رد اور محاسبے کی شکل میں سامنے آیا۔ جس کا عملی اظہار ۱۱ر اگست ۱۹۴۸ء کو مرزا محمود قادیانی کے دورہ کوئٹہ کے دوران ہوا

[1] اخبار الفضل، لاہور، ۳۔جنوری ۱۹۵۲ء، مشمولہ سازشوں کا دیباچہ، راے محمد کمال، ص: ۲۱۸، کرم چلی کیشنز مصطفیٰ آباد لاہور
[2] اخبار الفضل، لاہور، ۱۶۔جنوری ۱۹۵۲ء، مشمولہ سازشوں کا دیباچہ، راے محمد کمال، ص: ۲۱۸، کرم چلی کیشنز مصطفیٰ آباد لاہور

جب کوئٹہ کے غیور مسلمانوں نے ایک قادیانی فوجی افسر میجر محمود کو قتل کر دیا۔ جو مسلم ریلوے ایمپلائیز ایسوسی ایشن کے زیر انتظام ختم نبوت کے عنوان سے منعقدہ جلسہ عام کے پاس مشکوک حالت میں گھومتا ہوا پایا گیا تھا۔

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین نے پاکستان کی وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا اور ایک سابق بیورو کریٹ غلام محمد پاکستان کا گورنر جنرل بن گیا۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں مسلم لیگ کے برسر اقتدار آنے کے بعد پنجاب میں ممتاز دولتانہ وزیر اعلیٰ بنے۔ نوزائیدہ مملکت ابھی تک اپنے آئین کی تشکیل سے محروم تھی اور آئین ساز ادارہ قومی اسمبلی علاقائی دھڑے بندی کا شکار تھی۔ مرکز صوبوں سے اور صوبائی حکومتیں آپس میں دست و گریباں تھیں۔ پنجاب خاص طور پر سیاستدانوں کی سازشوں کا مرکز تھا۔ اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان کشیدگی بڑھ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے ہر طرف بے یقینی اور بے چینی کے اثرات نمایاں تھے۔

”۱۹۵۲ء میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے ملک کے آئین کے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی ایک رپورٹ تیار کروائی۔ جو بی۔ پی۔ سی رپورٹ ” Basic Principles Committee Report “ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس بنیادی اصولوں کی رپورٹ میں نظریہ پاکستان کے تحفظ کے تقاضے کے مطابق ملک کیلئے جداگانہ انتخاب تجویز کیا گیا تھا۔ جداگانہ انتخاب کی صورت میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کیلئے اقلیتوں کے واسطے صوبائی اور مرکزی حکومت میں نشستیں مخصوص کی گئیں، چنانچہ اس بی۔ پی۔ سی رپورٹ میں اقلیتوں کا ایک چارٹ بھی شائع کیا گیا، جس میں ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور اچھوت بطور اقلیت درج تھے۔ لیکن قادیانیوں کا جو کہ پورے عالم اسلام کے فیصلوں اور فتوؤں کی روشنی میں خارج از اسلام اور ایک نئی ذریت تھے۔ انہیں اقلیتوں کے چارٹ میں نہیں دکھایا گیا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ خواجہ ناظم الدین کی حکومت نے انہیں مسلمانوں میں شامل کر دیا تھا تاکہ وہ مار آستین بن کر

مسلمانوں کے حقوق پر ڈاکہ زنی کرتے رہیں۔ اونچے درجہ کی ملازمتیں اُن کے نوجوانوں کو ملتی رہیں۔ جہاں سے اُن کی مرضی ہو انتخاب لڑ کر اور عوام کو اسلام کے نام پر دھوکہ دے کر اسمبلیوں میں پہنچ جائیں اور جب نمائندگی اور خدمت کا موقع آئے تو صرف (اپنی) جماعت کی خدمت کریں اور اپنوں کے کام آئیں۔ جیسا کہ اُن کے ہاں رواج ہے۔"[1]

مرزا محمود قادیانی مسلسل اپنے خطبوں میں قادیانیوں کو اشتعال دلاتا رہا۔ اُس نے اپنے ایک خطبے میں قادیانیوں کو مشتعل کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ:

"ایسی صورت حال اختیار کرلو کہ تمہارے مخالفین ۱۹۵۲ء گزرنے سے پہلے پہلے تمہارے قدموں میں گرنے پر مجبور ہوجائیں۔"[2]

جولائی ۱۹۵۲ء میں قادیانی اخبار الفضل نے "خونی مُلّا کے آخری دن" کی سرخی کے تحت اپنے اداریئے میں علماء کرام کے خلاف اس قدر توہین آمیز الفاظ استعمال کیے کہ جسٹس منیر بھی اپنی انکوائری رپورٹ صفحہ ۲۱۱، پر یہ لکھنے پر مجبور ہوگئے کہ "یہ مضمون قطعی طور پر اشتعال انگیز ہے۔" الفضل نے اپنے اداریئے میں علماء کو دھمکی دیتے ہوئے لکھا:

"ہاں آخری وقت آن پہنچا ہے۔ اُن تمام علمائے حق (قادیانی رہنماؤں) کے خون کا بدلہ لینے کا، جن کو شروع سے لے کر آج تک یہ خونی ملا قتل کرواتے آئے ہیں۔ ان سب کے خون کا بدلہ لیا جائے گا۔ (۱) عطاء اللہ شاہ بخاری سے (۲) ملا (عبدالحامد) بدایونی سے (۳) ملا احتشام الحق (تھانوی) سے (۴) ملا (محمد) شفیع (دیوبندی) سے (۵) ملا مودودی پانچویں سوار سے۔"[3]

قادیانی جماعت کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود کی اشتعال انگیزی، ہر آنے والے دن

---

[1] اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۱۰۲۔ ۱۰۳، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

[2] ایضاً ص: ۱۰۴

[3] اخبار الفضل لاہور، مورخہ ۱۵، جولائی ۱۹۵۲ء۔ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۷، ۸۸، ۵۸۸، ۲۳، مولوی اللہ وسایا، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

کے ساتھ اُس کا اور قادیانی جماعت کا بڑھتا ہوا سیاسی اثر و رسوخ اور کردار، محب وطن عوام اور علماء کے لیے تشویشناک صورتحال اختیار کرتا جارہا تھا۔ عوام محسوس کرنے لگے تھے کہ ریاست کی جڑیں کھوکھلی کرنے کیلئے قادیانی سامراجیوں کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس لیے اب ضروری ہوگیا ہے کہ اُن کی حدود مقرر کی جائیں۔ ویسے بھی قادیانیوں کی کشمیر اور بلوچستان کے بارے میں سازشیں، قائد ملت نوابزادہ لیاقت علی خان کا قتل اور پنڈی سازش کیس میں ملوث ہونے سے پہلے ہی اُن کے مستقبل کے خطرناک عزائم اور حکمت عملی کا واضح تعین ہوگیا تھا۔

کراچی میں قادیانیوں کا احتجاجی جلسہ اور ظفر اللہ قادیانی کی شر انگیز تقریر

۱۷ اور ۱۸ مئی ۱۹۵۲ء کو قادیانی جماعت "انجمن احمدیہ" کراچی نے جہانگیر پارک میں ایک عوامی احتجاجی جلسہ منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ جس کے دوسرے مقررین کے علاوہ اہم اور بڑے مقرر کے طور پر پاکستانی وزیر خارجہ ظفر اللہ خاں قادیانی کا نام بھی شامل تھا۔ اگرچہ یہ جلسہ انجمن احمدیہ کے تحت منعقد کیا گیا تھا لیکن یہ ایک جلسہ عام تھا جس میں جمہور کا کوئی فرد بھی تقریریں سننے کیلئے شریک ہوسکتا تھا۔

اِس جلسے سے چند روز پہلے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے اِس اَمر کے خلاف اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ چوہدری ظفر اللہ خاں نے ایک فرقہ وارانہ جلسہ عام میں شرکت کا ارادہ کیا ہے، لیکن "چوہدری ظفر اللہ خاں نے خواجہ ناظم الدین سے کہا کہ میں انجمن سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اگر چند روز پہلے مجھے یہ مشورہ دیا جاتا تو میں جلسے میں شریک نہ ہوتا لیکن وعدہ کر لینے کے بعد میں اِس جلسے میں تقریر کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اور اگر اِس کے باوجود بھی وزیر اعظم اِس بات پر مصر ہوں کہ مجھے جلسے میں شامل نہ ہونا چاہیے تو میں اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کو تیار ہوں۔"[1]

ممتاز محقق و مصنف بشیر احمد نے بھی اپنی کتاب میں اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔[2]

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص:۷۶۔۷۷

[2] بشیر احمد، تحریک احمدیت، یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ، ص:۵۷۱، ادارہ اصلاح و تبلیغ، آسٹریلیا بلڈنگ ریلوے اسٹیشن لاہور

اِس جلسے کے پہلے روز عوام کی طرف سے سخت ناراضگی کا مظاہرہ کیا گیا اور اجلاس کی کارروائی میں مداخلت کرنے کی بھی کوششیں کیں۔ چنانچہ عوامی ردِعمل کو مدنظر رکھتے ہوئے ۱۸ مئی کے اجلاس کیلئے خاص حفاظتی انتظامات کئے گئے۔ چوہدری ظفراللہ خاں نے اِس اجلاس میں شرانگیز تقریر کرتے ہوئے قادیانیت کو زندہ اور اسلام کو مردہ قرار دیا۔ اُس نے اپنی تقریر میں کہا کہ

"احمدیت ایک ایسا پودا ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھوں سے لگایا ہے اور یہ پودا اِس قدر جڑیں پکڑ چکا ہے، جس سے اسلام کے تحفظ کی وہ ضمانت مہیا ہوگئی ہے، جس کا وعدہ قرآن میں ہے کہ اگر اِس پودے کو ختم کر دیا گیا تو اسلام مزید زندہ نہ رہ سکے گا، بلکہ اُس سوکھے ہوئے درخت کی طرح ہو جائے گا، جس کی دوسرے مذاہب پر کوئی قابل ذکر بالادستی نہیں ہوگی۔"[1]

آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس کراچی" کا انعقاد تحریک کا نقطۂ آغاز

کراچی اُن دنوں پاکستان کا دارالخلافہ ہونے کے ساتھ ساتھ ملک کا بھی اہم ترین شہر تھا۔ کراچی جیسے حساس شہر میں اسلام کے خلاف چوہدری ظفراللہ قادیانی کی اس زہریلی تقریر پر عوام نے شدید غم و غصے کا اظہار کیا اور کراچی سمیت ملک بھر میں قادیانیوں کے خلاف زبردست مظاہرے شروع ہو گئے۔ مسلمانوں کی ناراضگی اور برہمی نے پورے ملک میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اِس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ۲، جون ۱۹۵۲ء کو تھیوسوفیکل ہال کراچی میں علماء کرام کی ایک "آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس" منعقد ہوئی۔

کانفرنس کے دعوت نامے پر مجاہد تحریک پاکستان، فاتح سرحد علامہ عبدالحامد بدایونی کے علاوہ مولانا احتشام الحق تھانوی (دیوبندی) مولانا جعفر حسین مجتہد (اہل تشیع)، مولانا محمد یوسف

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۷۷۔ و۔ تحریک احمدیت یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ، بشیر احمد، ص: ۵۶۲۔ ۵۶۱۔ مزید، تاریخ احمدیت، جلد ۱۵، ص: ۱۲۳

(اہلحدیث) اور مولانا لال حسین اختر (مجلس احرار) کے دستخط بھی تھے۔

شرکاء کانفرنس کے حکومت سے متفقہ مطالبات

علامہ سید سلیمان ندوی کی زیر صدارت اس کانفرنس میں علماء کرام نے پہلی مرتبہ تین مطالبات متعین کر کے متفقہ طور پر حکومت کے سامنے رکھے۔ جن کی تفصیل یوں تھی۔

(۱) حکومت احمدیوں (قادیانیوں) کو غیر مسلم اقلیت قرار دے۔

(۲) چوہدری ظفر اللہ خاں کو وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کیا جائے۔

(۳) احمدیوں (قادیانیوں) کو تمام کلیدی آسامیوں سے برطرف کیا جائے۔

''علماء بورڈ'' کا قیام

اس اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کی خاطر ایک آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن طلب کیا جائے گا۔ چنانچہ حکومت کے مرزائیت نواز رجحانات کے باعث آئینی ذرائع سے پُر امن جدوجہد کا راستہ اختیار کرنے کیلئے اس کانفرنس میں اہم رہنماؤں پر مشتمل ایک ''علماء بورڈ'' بھی تشکیل دیا گیا۔ جس کے ذمہ آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کے اگلے اجلاس کے جملہ انتظامات تھے۔ اس علماء بورڈ میں

(۱) علامہ سید سلیمان ندوی صاحب (صدر)

(۲) علامہ عبد الحامد بدایونی صاحب

(۳) علامہ مفتی صاحب داد صاحب

(۴) مولانا شاہ احمد نورانی صاحب

(۵) مفتی محمد شفیع صاحب

(۶) علامہ سلطان احمد صاحب

(۷) علامہ محمد یوسف کلکتوی صاحب

(۸) مولانا لال حسین اختر صاحب

(۹) الحاج ہاشم گزدر صاحب

(۱۰) مولانا جعفر حسین مجتہد صاحب

(۱۱) مولانا احتشام الحق تھانوی (کنوینر)

شامل تھے۔ گیارہ رکنی اس بورڈ میں فاتح سرحد علامہ عبدالحامد بدایونی، مفتی صاحب داد خان اور حضرت علامہ شاہ احمد نورانی کا تعلق اہلسنت و جماعت کی مذہبی و سیاسی تنظیم جمعیت علماء پاکستان سے تھا۔[۱]

"آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی" کی تیاری

۱۳رجولائی ۱۹۵۲ء کو کراچی میں الحاج ہاشم گزدر کے گھر پر مندرجہ بالا علماء بورڈ کے اراکین کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں "آل پاکستان پارٹیز کنونشن" میں شرکت کیلئے جن چودہ مذہبی جماعتوں کو دعوت نامے جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اُن میں اہلسنت و جماعت کی نمائندہ جماعتوں "جمعیت علماء پاکستان، جمعیت اہل سنت اور پیر صاحب سرسینہ ابو صالح محمد جعفر صاحب کی جماعت "حزب اللہ (مشرقی پاکستان)" کے علاوہ دیگر مکتبہ فکر کی جماعتوں میں تنظیم اہلسنت والجماعت، جمعیت علماء اسلام، مجلس تحفظ ختم نبوت، مجلس احرار اسلام، جمعیت اہلحدیث، جماعت اسلامی، جمعیت الفلاح، موتمر اہل حدیث پنجاب، سفینۃ المسلمین، جمعیت العربیہ، ادارہ تحفظ حقوق شیعہ بھی شامل تھیں۔

۵راگست ۱۹۵۲ء کو کراچی میں علماء بورڈ کا اجلاس ہوا۔ جس میں مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، شیخ حسام الدین، اور ماسٹر تاج الدین انصاری خصوصی طور پر شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں بورڈ نے فیصلہ کیا کہ "کل پاکستان آل پارٹیز کنونشن" ۱۵تا۱۷رجنوری ۱۹۵۲ء کو منعقد کیا جائے گا۔

---

[۱] اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص:۱۱۵۔۱۱۴، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء۔ منیر انکوائری رپورٹ، ص:۱۲۶۔۱۲۵، نیاز ماڈل پبلی کیشنز لاہور

''لیکن ستمبر میں کنونشن کا انعقاد نہ ہوسکا اور ۱۵ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو علماء بورڈ کے اجلاس میں ۱۶، تا ۱۸ر جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں ''کل پاکستان آل پارٹیز کنونشن'' بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔''

آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن اور مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کا قیام

اسی دوران'' آل پاکستان مسلم پارٹیز'' کا ایک ہنگامی اجلاس ''۱۳، جولائی ۱۹۵۲ء کو لاہور کے برکت علی محمڈن ہال میں منعقد ہوا، جس میں تمام مکاتب فکر سمیت کم وبیش سات سو (۷۰۰) علماء ومشائخ اہلسنّت نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس میں شرکت کرنے والے چند علماء ومشائخ اہلسنّت کے نام یہ ہیں: حضرت پیر صاحب گولڑہ شریف، دیوان صاحب اجمیر شریف، صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ صاحب آلومہاروی، علامہ عبد الحامد بدایونی صاحب، مولانا غلام محمد ترنم، مولانا غلام دین (حزب الاحناف) وغیرہ''[1]

اِس اجلاس میں تمام مکاتب فکر کے علماء نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اجلاس میں پیش کیے گئے چار مطالبات کی متفقہ طور پر حمایت کی۔ ان چار مطالبات میں سے تین مطالبات (حکومت احمدیوں (قادیانیوں) کو غیر مسلم اقلیت قرار دے۔ چوہدری ظفر اللہ خاں کو وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کیا جائے اور احمدیوں (قادیانیوں) کو تمام کلیدی آسامیوں سے ہٹایا جائے) وہی تھے، جو اس سے قبل ۲، جون ۱۹۵۲ء کو تھیوسوفیکل ہال کراچی کے اجلاس میں منظور کیے جاچکے تھے۔ جبکہ چوتھا مطالبہ ایک نیا مطالبہ تھا جس میں کہا گیا تھا کہ

''ربوہ کی اراضی پر مہاجرین کو آباد کرتے ہوئے کھلا شہر قرار دیا جائے۔''[2]

کنونشن کا دوسرا اجلاس بعد از دوپہر حضرت مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری صاحب کی زیر صدارت منعقد ہوا۔

---

[1] منیر انکوائری رپورٹ، ص: ۱۴۸۔ ۱۴۷، نیاز ساز چلی کیشنز لاہور۔ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، مولوی اللہ وسایا، ص: ۷۸۔

[2] اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۷۹۔ ۷۸، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

''اس اجلاس میں وہی تین مطالبات متفقہ منظور کیے گئے، جو اس سے قبل ۲، جون ۱۹۵۲ء کو تھیوسوفیکل ہال کراچی کے اجلاس میں منظور کیئے جا چکے تھے۔ اس اجلاس میں علماء کرام (ومشائخ) اور پیران عظام نے قادیانیوں اور حکومت کے قادیانیت نواز رویئے کے خلاف زیادہ سخت رویہ اختیار کیا اور لگی لپٹی رکھے بغیر حکومت کو واضح الفاظ میں سمجھا دیا کہ یہ مطالبات ساری قوم کے مطالبات ہیں۔ اگر ان مطالبات کو تسلیم نہ کیا گیا تو حکومت کو رائے عامہ سے ٹکر لینا ہوگی۔''[1]

منظم جدوجہد کیلئے ''مجلس عمل تحفظ ختم نبوت'' کا قیام

اِس اجلاس میں پیش کردہ تجاویز کی روشنی میں قادیانیوں کے خلاف آئینی اور قانونی جدوجہد کیلئے ''مجلس عمل تحفظ ختم نبوت'' کا قیام عمل میں لایا گیا اور حضرت مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری (اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے خلیفہ) کو مجلس عمل کا صدر منتخب کیا گیا۔ باقی عہدیداران میں مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا محمد داؤد غزنوی، سید مظفر علی شمسی شامل تھے۔ ان عہدیداران کے علاوہ تمام جماعتوں سے دو دو نمائندے بھی لیے گئے۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) جمعیت علماء پاکستان سے مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری اور مولانا محمد بخش مسلم صاحب
(۲) انجمن سجادہ نشینان پنجاب سے صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ اور مولانا عبدالغفور ہزاروی صاحب
(۳) انجمن حزب الاحناف سے مولانا غلام دین اور مولانا غلام محمد ترنم صاحب
(۴) جمعیت العلمائے اسلام سے مولانا محمد طفیل اور مولانا عبدالحلیم صاحب
(۵) جمعیت اہلحدیث سے مولانا محمد داؤد غزنوی اور مولانا عطاء اللہ حنیف
(۶) ادارہ تحفظ حقوق شیعہ سے مظفر علی شمسی اور حافظ کفایت حسین صاحب
(۷) جماعت اسلامی سے مولانا نصر اللہ عزیز اور امین احسن اصلاحی صاحب

---

[1] ایضاً ص: ۱۸۲

(۸) تنظیم اہل سنّت والجماعت سے مولانا نورالحسن شاہ بخاری صاحب

(۹) مجلس احرار سے ماسٹر تاج الدین انصاری اور شیخ حسام الدین صاحب

مندرجہ بالا حضرات کے علاوہ اخبارات کی جانب سے مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش اور مولانا اختر علی خان کے علاوہ علامہ علاؤ الدین صدیقی (نامزد) بھی شامل تھے۔"[1]

کنونشن میں پیش کردہ قراردادیں

اس کنونشن میں پیش کردہ چھ قراردادوں میں سے چار قراردادیں اہلسنّت و جماعت کے اکابر علماء جن میں حضرت مولانا غلام محمد ترنم، مولانا محمد بخش مسلم، مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش اور مولانا محمد ذاکر صاحب نے پیش کیں۔ مولانا غلام محمد ترنم نے شیعہ عالم علامہ کفایت حسین کی تائید سے سب سے پہلی قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا:

☆ مرزا غلام احمد قادیانی نے چونکہ اسلام کے بنیادی اور اجتماعی عقیدۂ ختم نبوت کا انکار کر کے دعویٰ نبوت کیا ہے اور اپنے نہ ماننے والوں کو اس طرح کافر قرار دیا ہے جیسے محمد الرسول اللہ ﷺ کی نبوت کے منکر کافر ہیں۔

☆ غلام احمد قادیانی نے اپنی اُمت کو مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت تصور کیا ہے اور جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے نبی نہ ماننے کی وجہ سے عیسائی کافر ہیں اُسی طرح غلام احمد کو نبی نہ ماننے کی وجہ سے تمام اہل اسلام کو کافر قرار دیا ہے۔ گویا جس طرح عیسائی اور مسلمان ایک قوم نہیں اُسی طرح مسلمان اور مرزائی بھی ایک قوم نہیں۔ اس لیے کوئی مرزائی بڑے سے بڑے مسلمان کا جنازہ نہیں پڑھتے۔ چنانچہ چوہدری ظفر اللہ نے قائداعظم کا جنازہ نہیں پڑھا اور (وہ) مسلمانوں کے کسی معصوم بچہ تک کا بھی جنازہ نہیں پڑھتے۔

☆ جس طرح کسی مسلمان کے ہندو، سکھ یا عیسائی ہو جانے کو مسلمان مرتد تصور کرتے ہیں اُسی

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۸۱۔ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، مولوی اللہ وسایا، ص: ۱۸۴، عالمی مجلس ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

طرح مرزائی اُس شخص کو جو مرزائیت سے تائب ہو کر مسلمان ہو جائے مرتد قرار دے دیتے ہیں۔

☆ مسلمانوں کے تمام فرقے اِس بات پر متفق ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اُس کے ماننے والے کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

اسلام کا مدار عقیدۂ توحید اور ختم نبوت پر ہے اگر کوئی فرقہ توحید و رسالت کا اقرار کرے لیکن رسول کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر ختم نبوت ہونا تسلیم نہ کرے بلکہ تسلسل نبوت کا قائل ہو وہ اسلام سے خارج متصور ہوتا ہے۔ برہموسماج حضور نبی کریم ﷺ کو نبی تو مانتے ہیں لیکن آپ کے بعد تسلسل نبوت کے قائل ہونے کی وجہ سے خارج از اسلام سمجھے جاتے ہیں ایسے ہی غلام احمد اور اُس کی اُمت برہموسماج وغیرہ کی طرح تسلسل نبوت کے قائل ہونے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

☆ جب کسی مسلمان نے مرزا غلام احمد کی نبوت کو قبول کر لیا تو وہ مسلمان نہ رہا۔ اگرچہ حضرت محمد مصطفی ﷺ کو نبی مانتا ہو اسی لیے نقاش پاکستان علامہ اقبال مرحوم نے انگریزی دور میں مطالبہ کیا تھا کہ مرزائیوں کو اہل اسلام سے جدا غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ جس طرح ہندو سے سکھ جدا ہیں۔[1] چنانچہ حضرت علامہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کی رکنیت اور دیگر ذمہ داریوں سے مرزائیوں کو غیر مسلم ہونے کی وجہ سے خارج کر دیا تھا۔

بنابریں یہ کنونشن مرزا غلام احمد قادیانی اور اُس کے ماننے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے ہوئے حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اُن کو علیحدہ غیر مسلم اقلیت قرار دیتے ہوئے اُن کے حقوق مسلمانوں سے جدا کر کے مسلمانوں کے حقوق دستبرد سے محفوظ کرے۔"[2]

مولانا محمد بخش مسلم بی اے نے مولوی داؤد غزنوی صدر جمعیت اہلحدیث کی تائید سے دوسری قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا:

---

1. تفصیل حرف اقبال از لطیف شیرازی میں موجود ہے۔ ۱۴

2. اللہ وسایا، مولوی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء ص: ۱۹۴۔ ۱۹۲، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

"آل مسلم پارٹیز کنونشن پنجاب منعقدہ لاہور کا یہ اجلاس اس حقیقت کو پورے زور سے واضح کر دینا اپنا ایمانی، قومی، ملی اور ملکی فرض تصور کرتا ہے کہ ختم نبوت یا ردِ مرزائیت کے مضمون پر کسی فرد یا جماعت کا اظہار کرنا خواہ وہ مسجد میں ہو یا کسی جلسہ عام میں نہ صرف جائز بلکہ اسلام کا اہم ترین فریضہ ہے کہ مسلمان جماعت خواہ وہ احرار ہوں یا غیر احرار اس حق سے محروم کرنے کو صریحاً مداخلت فی الدین تصور کرتا ہے اور ہم اسے کسی صورت برداشت کرنے کو تیار نہیں۔"[1]

مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش نے اپنی پیش کردہ قرارداد میں کہا:

"آل مسلم پارٹیز کنونشن، مرزائی پارٹی کی گذشتہ تاریخ کے پیش نظر قادیان میں دن دہاڑے قتل کرانا، مکانات کا جلانا، مخالفین کو اخراج از شہر کی سزا، فوجداری مقدمات میں جرمانہ، قرقی جائیداد، سزائے بیدزنی دینا اور باوجود ان سب باتوں کے پولیس کا گواہ مہیا کرنے سے عاجز رہنا اور قانون کا شل ہو جانا، جس پر اُس انگریزی زمانہ کی عدالتوں کے فیصلہ جات گواہ ہیں۔ اِس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے کہ ربوہ کی آبادی جو اب صرف قادیانیوں کی بنائی جا رہی ہے۔ اب جس کے اردگرد کے بارہ مواضعات کی متروکہ اراضی جو مہاجرین کو الاٹ ہوئی تھی اُن سے چھین کر مرزائیوں کے حوالے کی جا رہی ہے جس میں کسی دیگر فرقہ کی کوئی آبادی نہیں ہوگی۔ گذشتہ حالات و واقعات کے اعادہ کا باعث بنتی جا رہی ہے۔ اِس لیے یہ کنونشن حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ (وہ) تعمیر شدہ عمارتوں کے علاوہ باقی خالی زمین واپس لے کر دیگر فرقوں کو آباد کر کے آنے والے خطرات کا سدباب کرے۔"[2]

مولانا محمد ذاکر صاحب نے اپنی پیش کردہ قرارداد میں فرمایا:

"آل مسلم پارٹیز کنونشن پنجاب کا یہ اجلاس پاکستان کی سالمیت کو اپنا ملکی و ملی فریضہ تصور

---

1. ایضاً ص: ۳۹۱
2. اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۱۹۵، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

کرتا ہے اور مملکت پاکستان سے اس دلی محبت کے پیش نظر مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو متنبہ کرتا ہے کہ چونکہ مرزائیوں کی وفاداری پاکستان کے ساتھ مشکوک ہے اور اُن کے مذہبی سیاسی رہنما مرزا محمود کے عزائم سے جیسا کہ اُن کے خطبات اور دیگر تدابیر سے عیاں ہے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ پاکستان پر اپنا تسلط جمانا چاہتے ہیں اور اسی کیلئے ممکن تیاریاں بھی کر رہے ہیں جن کی تکمیل کیلئے انہوں نے ربوہ کو مسلمانوں سے بالکل الگ مخصوص مرکز بنا رکھا ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمان بالعموم اور ملازم طبقہ بالخصوص اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر مرزائیوں کو پاکستان اور ملت اسلامیہ کیلئے غایت درجہ خطرناک تصور کرتا ہے۔

حکومت پاکستان کو چاہیئے کہ مرزائیوں پر کڑی نگرانی رکھے اور اُن کی خطرناک سرگرمیوں کی تفتیش و تحقیقات کیلئے ایک مجلس تحقیقات متعین کرے جس کے ارکان میں غیر سرکاری مسلمان عناصر بھی شامل ہوں۔ نیز جو مرزائی ذمہ دار عہدوں پر فائز ہیں اُن کو اپنے منصب کی آڑ میں تبلیغ مرزائیت سے روکنے کا فوری اقدام کرے۔"[1]

ان حضرات کے علاوہ ایک قرارداد مولانا بہاء الحق قاسمی (مشہور شاعر و ادیب عطاء الحق قاسمی کے والد اور معروف کالم نگار محمد یاسر علی پیرزادہ کے دادا) نے اور ایک قرارداد مولانا یوسف سیالکوٹی نے بھی پیش کی۔ جس کی تائید مولانا عبدالستار نیازی صاحب (جو اس وقت کے ممبر صوبائی اسمبلی تھے) نے کی۔ اس قرارداد میں کہا گیا کہ تمام مطالبات اور تجاویز جو کہ منظور کی گئی ہیں۔ ان کی تائید میں ۱۸، جولائی ۱۹۵۲ء کو "یوم مطالبات" منایا جائے اور تمام مساجد میں علماء کرام کنونشن کی منظور شدہ قراردادوں کی تائید عوام سے حاصل کر کے اپنے فیصلوں کی اطلاع ضلعی اور صوبائی حکام کے علاوہ وزیر اعظم کو بھیج دیں اور سر سے کفن باندھ کر اپنے آپ کو اس قربانی کیلئے پیش کریں کہ اگر جیلوں میں جانے کا سوال پیدا ہو تو ہم جیل بھرنے کیلئے تیار ہیں۔

یہ اجلاس اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت ہی نتیجہ خیز تھا اور اس اجلاس نے حکومت

---

[1] اللہ وسایا، مولوی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء ص: ۱۹۶، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

کے علماء کے بارے اِس تذبذب کو بھی ختم کر دیا کہ مختلف مکتبۂ فکر کے علماء ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور وہ کوئی فیصلہ کن تحریک نہیں چلا سکتے ۔ اس اجلاس کے بعد مسئلہ ختم نبوت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ مسلمانوں کا ایسا متفقہ بنیادی ،قومی اور مذہبی مسئلہ قرار پایا، جس کیلئے مختلف مکاتب فکر (سنی ،شیعہ ،دیوبندی و اہلحدیث) کے علماء یکجا و ہم آواز ہو کر میدان میں نکل آئے ۔

تحریک ختم نبوت اور علماء اہلسنت و جماعت

چنانچہ علماء اہلسنت و جماعت سمیت تمام مکاتب فکر کے علماء نے قادیانیوں کے خلاف مربوط اور منظم تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔اس مقصد کیلئے انہوں نے اپنے خطبات میں قادیانیوں کے عقیدہ ختم نبوت سے انحراف ،سامراج نوازی ،مملکت پاکستان کے وجود اور استحکام کے خلاف ان کی سازشیں اور قادیانی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ قادیانی کے شرمناک کردار کے حوالے سے اُس کی برطرفی کو موضوع بحث بنایا۔جس سے عوام میں قادیانیوں کے خلاف شدید نفرت آمیز جذبات کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔گوجرانوالہ میں عوام نے قادیانی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ کے علامتی جنازے نکالے ۔ملک کے دیگر حصوں میں عوام نے قادیانی مبلغین کے چہروں پر کالک ملی اور ان کو گدھوں پر سوار کرایا۔قادیانیوں کے تبلیغی (ارتدادی) جلسوں کو درہم برہم کر دیا۔مختلف مواقعوں پر قادیانی افراد عوام کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے ۔ ان واقعات کے خلاف قادیانی جماعت نے شدید صدائے احتجاج بلند کی اور اُس نے مرکزی حکومت کے پاس عرضداشتیں بھی بھیجیں ۔مرزا بشیر الدین محمود قادیانی نے اپنے پیروکاروں کو ہدایت کی کہ:

> ''ہماری جان و مال سخت خطرے میں ہیں ۔افراد جماعت کو چاہیے کہ اگر ضرورت پڑے تو اپنے دفاع کیلئے نہایت چست و مستعد رہیں ۔''[1]

علماء اہلسنت نے مختلف شہروں میں تحریک ختم نبوت کے کام کو منظم و فعال بنانے میں

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت ،برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء ،ص:۱۵

نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ لائل پور (فیصل آباد) میں خطیب اہلسنت صاحبزادہ افتخار الحسن شاہ صاحب، صاحبزادہ ظہور الحق صاحب سجادہ نشین دربار سراجیہ اور مولانا محمد یعقوب نورانی نے دیگر مکتبہ فکر کے علماء کے ساتھ مل کر ہر سطح پر تحریک کو منظم و فعال کیا اور ہزاروں مسلمانوں کے ساتھ گرفتاریاں پیش کیں۔

''میانوالی میں حضرت صوفی ایاز خان نیازی (صدر مجلس ختم نبوت میانوالی) نے حافظ شیر محمد خان نیازی، مولانا محمد رمضان، وغیرہ کے ساتھ مل کر تحریک ختم نبوت کے کام کو منظم و فعال کیا اور میانوالی میں تحریک کے حق میں رائے عامہ ہموار کی۔ صوفی صاحب بوری خیل پٹھان تھے (واضح رہے کہ صوفی ایاز خان نیازی کا بوری خیل علاقے سے تعلق تھا اور آپ شاہجہاں خیل قبیلے سے تعلق رکھتے تھے) آپ پہلے اسکول ٹیچر رہے اور آپ نے میانوالی میں کپڑے کی دکان کر رکھی تھی۔ مجاہد تحریک ختم نبوت صوفی ایاز خان نیازی اس تحریک کی قیادت کرتے ہوئے دیگر احباب کے ساتھ گرفتار بھی ہوئے۔''[1]

جہلم میں مولانا عبد اللطیف جہلمی، مولانا صادق حسین جہلمی نے دیگر علماء، جن میں حکیم سید علی شاہ، مولانا غلام حبیب شامل تھے، کے ساتھ مل کر تحریک کو منظم کیا اور گرفتاریاں دیں۔

ملتان میں علامہ سید احمد سعید کاظمی صاحب اور دیگر علماء اہلسنت نے دیگر مسالک کے اکابرین کے ساتھ اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور گرفتار ہوئے۔ حکومت نے ''مولانا محمد ذاکر (مہتمم جامع محمدی جھنگ جو بعد میں جمعیت علماء پاکستان کے ٹکٹ پر ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوئے) کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جس نے انہیں چھ ماہ قید کی سزا سنائی اور جھنگ جیل میں ڈال دیا گیا۔''[2]

''لاہور میں مولانا ابراہیم علی چشتی نے ۱۹۵۳ء کی تحریک میں پر جوش حصہ لیا، منیر

---

[1] اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۴۵۶۔ ۴۵۴، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

[2] ایضاً ص: ۸۷۴

انکوائری رپورٹ کے مطابق "آپ کے مقدمے کی رپورٹ سے آپ کے عزم و استقلال کا پتہ چلتا ہے"۔ خانوادہ اعلیٰ حضرت کے چشم و چراغ مفتی اعجاز ولی خاں بریلوی قدس سرہ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں حصہ لینے کی بناء پر سیفٹی ایکٹ کے تحت ایک سوایک دن تک نظر بند رہے۔ مولانا سید فتح علی شاہ قادری نے سیالکوٹ میں تحریک ختم نبوت کو کامیابی سے چلایا۔ مولانا فرید الدین کیمبلپوری نے بڑی تندہی سے اس تحریک میں حصہ لیا، تقریریں کیں، جلسے جلوسوں میں شریک ہوئے اور راولپنڈی میں گرفتار ہو کر سنٹرل جیل بھیجے گئے۔ ممتاز خطیب و عالم دین قاری احمد حسین فیروز پوری نے تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں پرجوش حصہ لیا۔"[1]

"راولپنڈی میں پیر آف گولڑہ شریف کے ساتھ مولانا سید عارف اللہ شاہ میرٹھی نے اس تحریک کی قیادت کی اور تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ راولپنڈی میں مولانا سید عارف اللہ شاہ نے نہایت ہی فعال کردار ادا کیا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔"[2]

مولانا سید عارف اللہ شاہ کے ساتھ مولانا محمد مسکین سمیت کئی علماء دوران تحریک گرفتار ہوئے۔ گوجرانوالہ میں صاحبزادہ فیض الحسن شاہ آلومہاروی، مولانا عبد الغفور ہزاروی مولانا عبد اللطیف صاحب چشتی اور مولانا ابو داؤد محمد صادق صاحب نے تحریک کے ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔

"شیخ القرآن علامہ عبد الغفور ہزاروی نے کفن بردوش مجاہد علماء کے ساتھ اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور جگہ جگہ تحریک کی کامیابی اور لوگوں کو متحرک رکھنے کیلئے تقریریں کیں جس کی پاداش میں آپ کو داخل زنداں کیا گیا اور آپ نے چھ سات ماہ کا عرصہ

---

[1] عبد الحکیم شرف قادری، علامہ، تذکرہ اکابر اہلسنت، ص: ۷۷، ۳۶۸، ۳، ۶۳، ۴۰، ۳۳، فرید بک اسٹال لاہور، اشاعت دوم، اگست ۲۰۰۰ء۔

[2] محمد صادق قصوری، اکابر تحریک پاکستان، ص: ۱۵۸، فضل نور اکیڈمی گجرات، ۱۹۷۰ء۔

راولپنڈی جیل میں بڑے صبر واستقلال کے ساتھ گزارا"[1]

صاحبزادہ فیض الحسن شاہ آلومہاروی نے تحریکی ہدایت کے مطابق گوجرانوالہ میں رضاکاروں کی تعلیم وتربیت کیلئے فوجی ٹریننگ کیمپ بھی قائم کیا اور اس ٹریننگ کیمپ کے ذریعے بے مثال خدمات انجام دیں۔آپ خاکی وردی میں ملبوس ایک فوجی جنرل معلوم ہوتے تھے۔ جب لاہور میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑنے والے قادیانی اُمیدواروں کی ناکامی پر مسلمانوں کی جانب سے ۲۵،اور ۲۶ مئی ۱۹۵۱ء کو یوم تشکر منایا گیا تو پہلے دن جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے صاحبزادہ فیض الحسن شاہ آلومہاروی نے اپنی تقریر میں مطالبہ کیا کہ احمدیوں (قادیانیوں) کو اقلیت قرار دیا جائے یا انہیں مجبور کیا جائے کہ اس ملک کو چھوڑ دیں اور بھارت میں آباد ہو جائیں۔[2]

شیخوپورہ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے صاحبزادہ فیض الحسن شاہ آلومہاروی نے حکومت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"ایک آدمی جو منصب ختم نبوت کا تحفظ نہیں کر سکتا، وہ اپنی ماں، بہن کی عزت کا بھی تحفظ نہیں کر سکتا۔ پھر اُس سے کیسے یہ اُمید رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اسلامی مملکت کا تحفظ کر سکے گا۔"[3]

جسٹس منیر انکوائری رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

"جو لوگ احمدیوں (قادیانیوں) کے خلاف برابر زہریلی تقریریں کرتے رہے، اُن میں محمد علی جالندھری، احسان احمد شجاع آبادی، اور صاحبزادہ فیض الحسن شاہ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔"[4]

---

1. ایضاً ص:۲۰۵
2. رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص:۳۰۔۲۹
3. محمد طاہر رزاق، ناموس محمد کے پاسبان، ص:۱۱۱، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت لاہور، مارچ ۲۰۰۰ء
4. رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص:۵۶

مولوی تاج محمود دیوبندی نے صاحبزادہ فیض الحسن شاہ آلومہاروی کی خدمات کو شاندار خراج تحسین پیش کیا۔ جسے نقل کرتے ہوئے مولوی اللہ وسایا تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۲۰، پر لکھتے ہیں کہ:

''صاحبزادہ سجادہ نشین آلومہار شریف بڑی خوبیوں کے مالک ہیں...... بہترین خطیب اور محبوب ترین پیر ہیں۔ آپ کے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ پیران عظام میں یہی ایک پیر ہیں جنہوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ ردِ مرزائیت کے سلسلے میں بارہا جیل گئے۔ صاحبزادہ صاحب بڑے ہی خوش خلق ،ملنسار اور احرار کے رہنماؤں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب نے حریت پسندی اپنے والد محترم سے ورثہ میں پائی ہے۔ ہم نے اُنہیں رضا کاروں کی وردی میں ملبوس اور فرش محمدی پر راتیں گزارتے اور رضا کاروں کے ہمراہ مظاہرہ کرتے دیکھا ہے۔ ہمیں اقرار ہے کہ صاحبزادہ صاحب کی احرار میں شمولیت سے ایک خاص مکتب خیال (اہلسنّت و جماعت) کے مسلمان گروہ در گروہ احرار میں شامل ہوئے اور احرار کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔''

منیر انکوائری رپورٹ کے مطابق:

''مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری اور مولانا محمد بخش مسلم نے احمدیوں (قادیانیوں) کے خلاف تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ ۱۴ مئی ۱۹۵۱ء میں قائم کردہ محکمہ اسلامیات کے تحت مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، مولانا محمد بخش مسلم، صاحبزادہ فیض الحسن شاہ، مولانا غلام محمد ترنم، مولانا ابراہیم علی چشتی سمیت گیارہ علماء نے اخبارات میں مضامین لکھے اور اسکولوں، کالجوں، اور جیلوں میں دینیات پر لیکچر دیئے اور مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، اور مولانا غلام محمد ترنم اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار بھی ہوئے۔''[1]

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص:۸۸

یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ

”جناب پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب کو تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں حصہ لینے اور قابل اعتراض تقریر کرنے کے جرم میں محکمہ جاتی کارروائی کی وجہ سے ”خطرناک“ قرار دے کر کوئٹہ ٹرانسفر کر دیا گیا اور وہاں کے پولیٹیکل ایجنٹ کو آپ کی خفیہ نگرانی پر مامور کیا گیا کیونکہ آپ ان دنوں محکمہ دفاع کے ملازم تھے۔“[1]

”کراچی میں تاج العلماء حضرت مولانا مفتی محمد عمر نعیمی صاحب نے جامع مسجد آرام باغ مسجد میں تحریک کا مرکز قائم کیا اور فعال کردار ادا کرتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ (مولانا جمیل احمد نعیمی، ناظم تعلیمات جامعہ نعیمیہ کراچی، آرام باغ کی تاریخی حیثیت اُجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پاکستان کے صوبہ سندھ کراچی میں اہلسنت کی دینی خدمات کی وجہ سے دو پارک بہت مشہور و معروف ہیں۔ ایک نشتر پارک اور دوسرا آرام باغ۔ نشتر پارک بارہ ربیع الاول کی شریف، عید میلاد النبی ﷺ کے جلسے و جلوس کی وجہ سے اور آرام باغ علماء و مشائخ اہلسنت کے سرخیل تاج العلماء مفتی محمد عمر نعیمی صاحب اشرفی محدث مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی دینی خدمات بالخصوص جامع مسجد آرام باغ کی تعمیر میں تعاون و مشورہ اور درس و خطابت جمعہ کی وجہ سے۔ یہی وہ آرام باغ ہے کہ جس کے وسیع و عریض میدان میں عاشقان مصطفیٰ اور جانثاران مجتبیٰ ختمی مرتبت محمد رسول ﷺ کی عظمت و ناموس پر ۱۹۵۳ء میں پورے صوبہ سندھ سے آ کر قربانیاں پیش کیں۔ آپ اپنی سوانح عمری ”حیات جمیل مع افکار جمیل“ جلد دوم، صفحہ ۲۳۱، پر لکھتے ہیں ”۱۹۵۳ء میں ملک گیر تحریک ختم نبوت کا آغاز ہوا اور بے شمار علماء و مشائخ اہلسنت کے علاوہ مختلف طبقہ ہائے زندگی کے مسلمانوں نے تحفظ ناموس رسالت ﷺ کیلئے بیش بہا قربانیاں دیں۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے کراچی کے آرام باغ میں یہ منظر دیکھا ہے کہ شمعِ رسالت کے پروانے جب نعرہ ہائے تکبیر اور رسالت بلند کرتے ہوئے نکلتے

---

[1] ماہنامہ لانبی بعدی، لاہور، تاریخ ساز مجاہدین ختم نبوت نمبر، ستمبر اکتوبر نومبر ۲۰۰۳ء، ص: ۱۹۶، جلد ۴

تھے تو کراچی کی سرزمین لرز جایا کرتی تھی۔اور کراچی کے درودیوار نعرہ ہائے تکبیرورسالت ﷺ سے گونج جایا کرتے تھے۔") بہاول نگر میں مولانا سید فیض الحسن تنویر دیگر علماء کے ساتھ تحریک کے جانباز رہنماء اور مجاہد تھے۔حافظ محمد عالم سیالکوٹی نے تحریک کے دوران فعال کردار ادا کیا۔جس کی پاداش میں انہیں گرفتار کرکے فوجی عدالت میں پیش کیا گیا۔بعد میں آپ کو شاہی قلعہ لاہور میں قید رکھا گیا اور تحریک کے خاتمے پر رہا کیا گیا۔علامہ سید محمود شاہ گجراتی فرزند حضرت پیر سید ولایت علی شاہ گجراتی نے تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور گرفتار ہو کر کئی ماہ گجرات و میانوالی جیل میں گزارے۔"[1]

"پیر محمد فضل شاہ جلال پوری (امیر جماعت حزب اللہ نے اپنی جماعت کے ساتھ) جہلم میں تحریک کو منظم و فعال کیا اور اپنے آپ کو کئی بار گرفتاری کیلئے پیش کیا لیکن ہر بار حکومت نے آپ کو گرفتار کرنے سے گریز کیا۔"[2]

"سید بشیر احمد سوہدروی تحریک میں بھرپور حصہ لیتے ہوئے قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کیلئے عوامی سطح پر جلسوں میں قراردادیں منظور کروائیں اور ختم نبوت کے مسئلے پر نہایت جرأت سے کام لیتے ہوئے ایمان افروز تقاریر کیں۔"[3]

"حضرت مولانا فقیر اللہ نیازی نے سیالکوٹ میں تحریک کو منظم کیا اور تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں چھ ماہ سے زائد عرصہ ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ میں گزارا۔"[4]

پیر سید غلام محی الدین گولڑوی، شیخ الاسلام خواجہ قمر الدین سیالوی، پیر سید انور حسین شاہ، علامہ سید ابوالبرکات قادری، پیر غلام مجدد سرہندی، مفتی صاحبداد صاحب، علامہ مفتی مظہر احمد نقشبندی،

---

1. محمد صادق قصوری، اکابر تحریک پاکستان، ص: ۳۰۳، فضل نور اکیڈمی گجرات، ۱۹۷۰ء
2. محمد صادق قصوری، اکابر تحریک پاکستان، ص: ۳۱۹، فضل نور اکیڈمی گجرات، ۱۹۷۰ء
3. ایضاً ص: ۳۸۰
4. ایضاً ص: ۵۱۴

مولانا مفتی سید مسعود علی قادری، مفتی غلام قادر کشمیری، صاحبزادہ سید فیض الحسن تنویر، مولانا ابراہیم علی چشتی، مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا سید محمود احمد رضوی، مولانا محمد عمر اچھروی، مولانا غلام معین الدین نعیمی، علامہ غلام علی اشرفی، مولانا مفتی محمد امین بدایونی، مولانا محمد سردار احمد لائلپوری، مولانا مفتی مظفر احمد دہلوی، مولانا غلام علی اوکاڑوی، مولانا سید جلال الدین نقشبندی، صاحبزادہ افتخار الحسن شاہ صاحب، صاحبزادہ ظہور الحق سجادہ نشین خانقاہ صابریہ سراجیہ لائل پور، صاحبزادگان امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب، جناب پیر سید حافظ محمد حسین شاہ اور پیر سید اختر حسین جیسے ہزاروں جید علماء ومشائخ اہلسنت وجماعت نے اس تحریک میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔

غرض کہ شہروں، قصبوں، گاؤں اور دیہاتوں ہر جگہ علماء اہلسنت وجماعت نے تحریک ختم نبوت کو منظم وفعال بنانے میں ہر ممکن کردار ادا کیا اور اس تحریک کے دوران علماء کرام نے قادیانیوں کے خلاف اور اپنے مطالبات کے حق میں وسیع پیمانے پر جلسے، جلوس اور کانفرنسوں کا سلسلہ جاری رکھا جس سے قادیانی مخالف تحریک پورے ملک میں زور پکڑ گئی اور قادیانیوں کے خلاف علماء کے مطالبات نے عوامی مطالبات کی شکل اختیار کرلی۔

مساجد میں دفعہ ۱۴۴، کا نفاذ حکومت کی بوکھلاہٹ

حکومت نے قادیانیوں کے خلاف احتجاجی جلسوں کو ناکام بنانے کیلئے کئی شہروں میں دفعہ ۱۴۴، نافذ کردی۔ قارئین کی دلچسپی کیلئے یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ دفعہ ۱۴۴، کا نفاذ انگریز دور میں بھی ہوتا رہا لیکن اس دور میں بھی اس دفعہ کا اطلاق اور دائرہ اثر ہمیشہ مسجد سے باہر ہی رہا لیکن پاکستان بننے کے بعد مسلمان کہلانے والے حکمرانوں کے دور حکومت میں یہ پہلا موقع تھا۔ جس میں دفعہ ۱۴۴، کا نفاذ مسجد کی حدود کے اندر بھی کیا گیا۔ پولیس نے کئی مقتدر علماء کرام جن میں بالخصوص صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ آلومہاروی صاحب کو اس دفعہ کے تحت مسجد کے اندر سے گرفتار کیا۔

مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب نے حکومت کے اس اقدام پر سخت برہمی کا

اظہار کیا اور اسے مداخلت فی الدین قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ

''ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں حتی المقدور کوشاں رہے۔ یہ اسلام کا بنیادی مسئلہ ہے اس میں کوئی اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ آپ نے مزید ارشاد فرمایا مسجد خدا کا گھر ہے۔ خدا کے گھر میں خدا کا قانون رائج ہوتا ہے۔ کوئی دنیاوی قانون مسجد میں نافذ نہیں ہو سکتا، دفعہ ۱۴۴، کو مسجد کے اندر نافذ کرنا قطعاً غیر اسلامی فعل ہے۔ حکومت اس قانون کو مساجد پر نافذ نہیں کر سکتی اور اگر وہ ایسا کرے گی تو وہ بلاوجہ ہم سے اُلجھے گی۔ ہم حکومت کی اس دھمکی سے مرعوب نہیں ہوں گے۔ آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے اسلامی تاریخ کا اہم واقعہ بیان فرمایا کہ خلیفہ ہارون رشید اپنی بیوی سے خفا ہو کر جذبات میں بہہ گیا اور اُس سے کہا کہ آفتاب غروب ہونے سے قبل تم میری سلطنت کی حدود سے باہر چلی جاؤ۔ ورنہ تم پر طلاق عائد ہوگی۔ جب ہارون رشید کا غصہ فرو ہوا، تو اُس کو افسوس ہوا اور دست تاسف ملنے لگا۔ کیونکہ وہ اپنی بیوی کو طلاق نہیں دینا چاہتا تھا۔ فوری طور پر بیوی کا سلطنت کی حدود سے باہر جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اسے سخت پریشانی لاحق ہوئی اور علماء کو دربار میں طلب کر کے اُن سے رائے طلب کی گئی۔ سب نے بے بسی کا اظہار کیا۔

یہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ تھا۔ آپ نے فرمایا خلیفہ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لوگ حیران ہوئے کہ سب علماء مایوس ہو چکے ہیں۔ طلاق سے بچنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ امام صاحب کس طرح بیگم ہارون رشید کو سلطنت کی حدود سے باہر بھیج سکیں گے۔ آپ نے بیگم ہارون رشید سے کہا فکر نہ کرو غروب آفتاب سے پہلے ڈولی میں بیٹھ کر تیار رہنا تمہیں ہارون الرشید کی سلطنت سے باہر پہنچا دیا جائے گا۔ سب حیران تھے کہ یہ فقیر منش عالم طلاق سے بچنے کی کون سی راہ نکالتا ہے۔ جب مغرب کا وقت آیا۔ ہارون رشید کی بیوی ڈولی میں بیٹھ کر امام صاحب کے پاس پہنچ گئی۔ آپ نے اُس کو اپنے ساتھ لیا اور مسجد میں لے گئے اور اُس سے کہا کہ اب تو

ہارون رشید کی سلطنت سے باہر آگئی ہے۔ اللہ کے گھر میں اللہ کی حکومت ہے یہاں
ہارون رشید کے احکامات کا کوئی دخل نہیں۔"[1]

اس واقعے کو بیان کر کے علامہ ابوالحسنات نے حکومت کو متنبہ کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی صحیح صورتحال سے آگاہ کیا۔ جس کے بعد علماء کرام نے بے خوف ہو کر قادیانیت اور حکومت کی قادیانیت نواز پالیسیوں کے خلاف کھل کر بولنے لگے۔ مولانا ابوالحسنات نے حزب الاحناف کے سالانہ جلسے میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ

"وہ مرزائیت کی بے جا حمایت اور اسلام دشمنی سے باز آجائے۔ ہم اس صورتحال کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتے۔" چنانچہ حکومت نے آپ کے مطالبے اور بگڑتی ہوئی صورتحال کو دیکھتے ہوئے ایک بیان جاری کیا کہ مساجد پر کوئی پابندی نہیں۔"[2]

مشائخ اہلسنت کی حمایت تحریک کی کامیابی کا نیا موڑ

علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ صاحب اور حضرت مولانا عبدالغفور ہزاروی جیسے اکابرین اہلسنت کی کوششوں کی بدولت پنجاب کے نامور مشائخ اہلسنت نے تحریک کی حمایت میں ہر ممکن تعاون کیا۔ ان مشائخ عظام نے تحریک کی حمایت میں مرزائیوں کے خلاف مضامین لکھے۔ اپنے دستخطوں سے مرزائیت کے خلاف تحریک ختم نبوت کی حمایت میں اشتہارات شائع کئے اور ساتھ ہی اپنے مریدین کو یہ ہدایات بھی جاری کیں کہ وہ اس تحریک میں بھرپور حصہ لیں اور تحفظ ختم نبوت کیلئے کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ ان مشائخ عظام میں حضرت دیوان سید آل رسول علی خاں، (سجادہ نشین اجمیر شریف)، حضرت سید غلام محی الدین شاہ صاحب (سجادہ نشین گولڑہ شریف) حضرت شیخ المشائخ خواجہ قمر الدین سیالوی صاحب (سجادہ نشین سیال شریف) حضرت شیخ طریقت ابو البرکات سید فضل شاہ صاحب (سجادہ نشین جلال پور شریف امیر حزب اللہ)، حضرت شیخ طریقت سید علی حسین شاہ صاحب (سجادہ نشین

---

[1] اللہ وسایا، مولوی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۱۲۳۔ ۱۲۱، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء۔
[2] اللہ وسایا، مولوی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۱۲۳، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء۔

ثانی صاحب علی پور سیداں شریف)، حضرت شیخ طریقت سید مخدوم سید شوکت حسین صاحب الحسنی الگیلانی (سجادہ نشین حضرت موسیٰ پاک شہید ملتان) شامل ہیں۔

اِن مشائخ اہلسنت کی تائید اور حمایت سے

"ماہ ستمبر میں تحریک نے نئی کروٹ لی۔ مجلس عمل نے پیران عظام کے دستخط حاصل کئے اور ان کو پوسٹر کی شکل میں شائع کر کے پاکستان بھر میں مشتہر کیا۔ ان پوسٹروں کا (تحریک کی حمایت میں) خاطر خواہ اثر ہوا اور حکومت منہ دیکھتی رہ گئی۔ حضرت دیوان آل رسول علی خاں اجمیر شریف سجادہ نشین سلطان الہند خواجہ غریب نواز نے ختم نبوت کے عنوان پر ولولہ انگیز مضمون تحریر فرمایا۔ جس میں آپ نے حضرت مولانا ابوالحسنات کی قیادت پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے تحریک کی کامیابی کیلئے دعا فرمائی۔ اسی طرح حضرت شیخ طریقت سید مخدوم سید شوکت حسین صاحب الحسنی الگیلانی (سجادہ نشین حضرت موسیٰ پاک شہید ملتان) نے بھی مفصل مضمون تحریر فرمایا اور حضرت مولانا ابو الحسنات کی قیادت پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے جملہ مریدین اور عام مسلمانوں کو اس تحریک کا بھر پور ساتھ دینے کی ہدایت کی۔ حضرات سجادہ نشینوں کے حمایت کے اعلان سے تحریک ختم نبوت اپنے پورے شباب پر آگئی۔"[1]

شہداء تحفظ ختم نبوت "ملتان"

تحفظ عقیدہ ختم نبوت کی یہ تحریک پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔ حکومت اس تحریک کو کچلنے کیلئے تمام ریاستی حربے آزما رہی تھی۔ علماء و مشائخ کو گرفتار کر کے دُور دراز کی جیلوں میں منتقل کر دیا گیا لیکن عوامی جوش و جذبوں کا سیل رواں جاری تھا۔ اِن ہی دنوں ملتان میں ۱۹، جولائی ۱۹۵۲ء کو مرزائیوں کی زیادتیوں کے خلاف ایک بہت بڑا جلوس نکالا گیا۔ جب یہ پُر امن جلوس "کپ" تھانہ پہنچا۔ تو وہاں رش کی وجہ سے تھانے کا جنگلا ٹوٹ گیا۔ جس پر وہاں موجود

---

[1] اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۴۷۸، ۴۷۳، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

پولیس اہلکاروں نے جلوس کے شرکاء پر فائرنگ شروع کر دی۔اس فائرنگ کے نتیجے میں چھ(۶)مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیااور بہت سے افراد زخمی ہوئے۔ ان شہادتوں نے پورے ملک میں کہرام مچادیا۔مسلمانوں میں غم وغصہ کا پیدا ہوناایک فطری عمل تھا۔ملتان میں ہڑتال کی گئی اور ان شہداء کی نماز جنازہ میں ایک لاکھ افراد نے شرکت کی ۔ملتان کے مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ اس واقعے کی ہائی کورٹ کے ججوں کی نگرانی میں تحقیقات کرائی جائے۔شہیدوں کے ورثاءکوخون بہادیاجائےاور تھانہ"کپ" کے انچارج کومعطل کیاجائے۔

ان مطالبات کی منظوری کیلئے جلسے،جلوس،مظاہروں اور ہڑتالوں نے طول پکڑاتو علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کی سرکردگی میں ایک وفد مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش ،صاحبزادہ فیض الحسن شاہ صاحب آلومہاروی ،اور مولانا محمد علی جالندھری کے ہمراہ ملتان پہنچا انتظامیہ کے طرزِعمل کی وجہ سے ملتان کے لوگ بہت ناراض تھے اور ان میں شدید غم وغصہ پایا جاتا تھا۔علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری اور صاحبزادہ فیض الحسن شاہ صاحب آلومہاروی ،اور مولانا مرتضیٰ احمد میکش نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے لوگوں کواس واقعے کا معقول اور قابل قبول حل نکالنے پر آمادہ کیا۔حکومت پنجاب نے ہائی کورٹ کے جج جسٹس ایم۔آر کیانی کو اس حادثے کی آزادنہ تحقیقات پر معمور کیا۔لیکن بدقسمتی سے جسٹس ایم۔آر کیانی نے رپورٹ میں جانب دارانہ رویئے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سانحہ کا ذمہ دار حکومت اور پولیس کے بجائے شمع رسالت کے پروانوں کوقرار دیا۔

ان دنوں ممتاز دولتانہ کی حکومت کے مرکز سے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ پنجاب اور مرکز کے درمیان پہلے ہی سخت کشیدگی موجود تھی۔ پنجاب حکومت کا تحریک کو کچلنے کیلئے ریاستی مشینری کا بے دریغ استعمال اور اس میں ناکامی اور صوبائی کابینہ کے رکن ملتان کے علی حسین گردیزی (جنھوں نے اس المناک سانحے سے متاثر ہوکر سب سے پہلے ممتاز دولتانہ کی کابینہ سے علیحدگی اختیار کی) کاوزارت سے مستعفی ہونے کے اعلان نے دولتانہ حکومت کی بنیادیں ہلادی تھیں۔ چنانچہ دولتانہ حکومت نے اپنے اقدامات سے پسپائی اختیار کرنے ہی میں عافیت جانی اور اس

نے ۱۵ر جولائی ۱۹۵۲ء کو باعزت پسپائی کا راستہ اختیار کیا۔عوام کی مخالفت اور تحریک کا زور توڑنے کیلئے حکومت نے ۷ر جولائی ۱۹۵۳ء کو علامہ صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ آلومہاروی سمیت دیگر گرفتار شدگان کو رہا کر دیا گیا۔

ہم یہاں ظفراللہ کے بندے سے ملاقات کرنے نہیں آئے تھے

ملتان میں فائرنگ کے واقعے نے مسلمانوں میں تحفظ ختم نبوت کا جذبہ اور تیز کر دیا۔ حضرت شیخ طریقت سید مخدوم سید شوکت حسین صاحب الحسنی الگیلانی (سجادہ نشین حضرت پیر پیراں موسیٰ پاک شہید ملتان) کی زیر صدارت ایک فقید المثال جلسہ عام منعقد کیا گیا جس میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں نے شرکت کی۔حضرت ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب کی قیادت میں مجلس عمل کی عظیم الشان کانفرنسیں منعقد ہونے لگیں۔جس میں خاص طور سے علماء حضرت صاحبزادہ فیض الحسن قادری،مولانا غلام نبی ترنم،مولانا محمد بخش مسلم،مولانا ابراہیم چشتی وغیرہ کی شرکت قابل ذکر ہیں۔مسلمانوں کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ حکومت مسلمانوں کے اس متفقہ مطالبے کو تسلیم کرے۔

”اسی دوران خواجہ ناظم الدین نے صدر مجلس عمل ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب کو ملاقات کیلئے بلایا۔یہ ملاقات کراچی میں ہوئی،جس میں ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کے ساتھ مولانا عبدالحامد بدایونی بھی موجود تھے۔اس ملاقات میں دونوں علماء کرام نے خواجہ ناظم الدین سے پُرزور مطالبہ کیا کہ وہ ظفراللہ خان کو حکومت سے علیحدہ کریں۔ جس پر خواجہ صاحب نے کہا کہ آپ مطالبہ تو کر رہے ہیں کہ ظفراللہ خان کو علیحدہ کر دیا جائے۔مگر آپ اس مشکل کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اگر ہم ظفراللہ خان کو علیحدہ کر دیتے ہیں ،تو ہمارے کتنے کام بگڑ جائیں گے۔اُن کے بغیر ہم کن کن مشکلات میں گرفتار ہوں گے، آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہے۔خواجہ ناظم الدین کی اس بات پر حضرت مولانا ابوالحسنات نے فرمایا کہ خواجہ صاحب ہم تو اللہ کے نیک بندے سے ملنے اور اپنی آرزو بیان کرنے

آئے تھے۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہم یہاں ظفر اللہ کے بندے سے ملاقات کر رہے ہیں۔ مولانا ابوالحسنات نے بگڑ کر مولانا عبدالحامد بدایونی سے فرمایا، چلئے یہاں ظفر اللہ خان ہیں، تو سب ٹھیک ہے، ورنہ سب کام چوپٹ ہو جائیں۔"[1]

۱۳/اگست تا۱۶/اگست ۱۹۵۲ء تک خواجہ ناظم الدین نے مجلس عمل کے صدر ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کے ہمراہ مولانا مرتضیٰ احمد میکش، مولانا عبدالحامد بدایونی، ماسٹر تاج الدین انصاری، اور شیخ حسام الدین سے ملاقاتیں کیں۔ ان ملاقاتوں میں علماء کے وفد نے تحریری طور پر اپنے مطالبات وزیر اعظم کو پیش کئے۔ لیکن ان تمام ملاقاتوں میں حکومت کی جانب سے کوئی خاص پیش رفت دیکھنے میں نہیں آئی۔ بلکہ خواجہ ناظم الدین نے مطالبات ماننے سے معذوری کا اظہار کیا۔ اس کے باوجود علماء کو اُمید تھی کہ یوم آزادی ۱۴/اگست ۱۹۵۲ء کے موقعے پر خواجہ ناظم الدین صاحب دینی غیرت و حمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قادیانیوں کے خلاف مسلمانوں کا مطالبہ منظور کرنے کا اعلان کریں گے۔ جس کا انہوں نے پہلے مجلس عمل کے علماء سے وعدہ کیا تھا۔

"اور کہا تھا کہ ۱۴/اگست کو ختم نبوت کے مسئلہ کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور وہ فیصلہ ایسا ہو گا، جو مسلمانوں کی اُمنگوں اور انصاف کے مطابق ہو گا اور حکومت مرزائیوں سے متعلق اپنی واضح پالیسی کا اعلان کر دے گی۔ ساتھ ہی اُنہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس فیصلے سے مسلمان مطمئن ہو جائیں گے لیکن خلاف توقع وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کی ۱۴/اگست کو ریڈیو سے کی گئی تقریر مایوس کن اور حوصلہ شکن تھی۔ اس تقریر میں اُنہوں نے قادیانیوں کے خلاف کوئی اعلان نہیں کیا بلکہ اُنہوں نے اپنی تقریر میں مجلس عمل کے علماء پر شدید تنقید کی اور تحریک کو شر و فساد سے تعبیر کرتے ہوئے تحریک کے رہنماؤں کو دھمکیاں بھی دیں۔"

خواجہ ناظم الدین کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ مجلس عمل کے جلسے، جلوس اور مظاہرے اس

---

[1] اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۱۵۵، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

بات کو ظاہر نہیں کرتے کہ عوام کی اکثریت بھی قادیانیوں کے خلاف مطالبات میں اُن کے ساتھ شامل ہے۔ خواجہ ناظم الدین کے اِس طرزِ عمل کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جذبات و احساسات میں تیزی آ گئی۔ اور عوام مختلف شکوک وشبہات کا شکار ہونے لگے۔ وہ یہ سمجھے کہ ملک کی اصل قوت محاکمہ مسلم لیگ یا اُس کے رہنما نہیں بلکہ اصل پس پردہ قوت کوئی اور ہی ہے جو تمام اسلامی قدروں اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو روند کر قادیانیوں کے مفادات کا تحفظ کر رہی ہے۔ دراصل حکومت اپنی بدتدبیری سے اِس مسئلے کو اُلجھا رہی تھی۔ خواجہ ناظم الدین کی کوشش تھی کہ علماء کو چند رعایتیں دے کر خاموش کرا دیا جائے۔

"وہ علماء کی بے چینی پر خوش نہیں تھا۔ چنانچہ وزیر اعظم نے چیدہ چیدہ علماء کو اپنے گھر بلایا اور اس مسئلے پر اُن کے ساتھ تفصیلی گفت وشنید کی۔ اُس نے اُمید کا اظہار کیا کہ دوسرے معاملات میں دی گئی رعایتوں کو علماء اس کے بدلے قبول کر لیں گے۔ اُس نے کراچی اور لاہور کے علماء کو تقسیم کرنے اور ایک دوسرے کے خلاف کرنے کی بھی کوشش کی۔ علماء کی دو تنظیموں کے اختلافات کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔"[1]

۱۵ / اگست ۱۹۵۲ء کو حکومت نے گورنمنٹ سروس رولز (قواعد کردار ملازمین) میں ترمیم کا اعلان جاری کیا۔ جس کے مطابق تمام مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے افسران پر پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ فرقہ وارانہ عقائد کی تبلیغ کیلئے اپنی سرکاری حیثیت کا استعمال نہ کریں اور اس ضابطے کی سختی سے پابندی کریں۔ اس اعلان کا مقصد مسلمانوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنا اور مجلس عمل کو کچھ تسلی وتشفی دینا تھا۔ ۱۶ / اگست کی شام خواجہ ناظم الدین کی دعوت پر مجلس عمل کا وفد ایک بار پھر اُن سے ملا۔ اس ملاقات میں سردار عبدالرب نشتر بھی موجود تھے۔ وفد کو ایک بار پھر اُسی مایوس کن صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ یہ مسئلہ میری ذات کے دائرہ اختیار میں نہیں، بلکہ دستور ساز اسمبلی کے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔ اِس لیے میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا

---

[1] بشیر احمد تحریک احمدیت یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ، ص: ۵۶۳، ادارہ اصلاح وتبلیغ، آسٹریلیا بلڈنگ ریلوے اسٹیشن لاہور

اور میں چوہدری ظفر اللہ کو بھی وزارت سے علیحدہ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اُسے قائداعظم محمد علی جناح نے وزیرخارجہ بنایا تھا۔ باقی رہا" ربوہ" کی زمین کا مسئلہ تو یہ صوبائی حکومت سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ لوگ اِس سلسلے میں صوبائی حکومت سے رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔

وزیراعظم کا یہ رویہ مجلس عمل اور پاکستان کے مسلمانوں کیلئے بہت بڑا سانحہ تھا۔ پہلے ہی ۱۴/ اگست کو قادیانیوں کے خلاف متوقع اعلان نہ کرنے پرعوام اور علماء کو شدید مایوسی میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ دوسری جانب جسٹس کیانی رپورٹ نے جلتی پرتیل کا کام کیا۔ عوام جو شدید ناراض تھے، حکومت کے رویے نے انہیں اور بھی زیادہ مایوس کردیا اور بعد میں سامنے آنے والے واقعات اِس سانحہ کے ردِعمل میں ہوتے چلے گئے اور یوں وہ تحریک جو اِس سے قبل قادیانیوں کے خلاف چل رہی تھی اور جس کا مرکز و محور صرف قادیانی ذریت تھی، حکومتی طرزِعمل کی وجہ سے اب اُس کے مقاصد میں حکومت وقت کی مخالفت بھی شامل ہوچکی تھی۔

۲۳/ اگست ۱۹۵۲ء کو آل مسلم پارٹیز کے زیراہتمام مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب کی زیرصدارت بیرونِ دہلی دروازہ لاہور میں ایک عظیم الشان جلسہ عام منعقد کیا گیا، جس میں ایک لاکھ سے زائد شمع رسالت کے پروانوں نے شرکت کی۔ مولانا ابوالحسنات نے قرآن مجید کی آیت "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ" کے حوالے سے تقریر کرتے ہوئے کہا:

> "آج سے کچھ ماہ پیشتر اِس خطہ ارضی پر ختم نبوت کا نام لینا جرم قرار دیا گیا تھا اور اِس جرم کی پاداش میں بہت سارے فرزندان توحید اور شمع رسالت کے پروانوں کو جیل کی کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا۔ میں نے آج اِس آیت کو پڑھ کر پھر اِسی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ آپ حضرات ہمارے کراچی جانے اور واپس آنے کے حالات سننے کیلئے بے تاب ہیں۔ مسلمان فخر انبیاء خاتم النبیین ﷺ کی عزت و ناموس کی خاطر جان قربان کرنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے ہیں۔ اِس معاملے میں مولوی ہی پیش پیش نہیں بلکہ میرے نزدیک تو جنہیں پنجابی اصطلاح میں ماجے اور گامے کہا

جاتا ہے، وہ شاید محمد عربی ﷺ کی عزت وناموس کی خاطر سب سے زیادہ قربانی دے جائیں۔ اِس معاملے میں پڑھے لکھے آدمی کی طرح اگر مگر کی پالیسی ٹھیک نہیں۔ جب تاج وتخت ختم نبوت پر کوئی گستاخانہ حملہ ہو تو عشق ومحبت کا یہی تقاضہ ہوتا ہے کہ

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

اگر آج یہاں انگریز کی حکمرانی ہوتی تو اِس سلسلہ میں ہمارا قدم جو اُٹھتا وہ اِس سے بالکل مختلف ہوتا۔ مگر آج حکومت کے عہدیدار ہمارے اپنے ہیں۔ آج مسند اقتدار پر وہ لوگ براجمان ہیں، جو گنبد خضریٰ کے مکین کے نام لیوا ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو محمد عربی ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لیے اِن کے مقابلے میں ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہے۔ ہم بے چینی، اضطراب اور ہیجان پھیلا کر اِن کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن ہم یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ ایک اسلامی ملک کے خارجہ معاملات ایک ایسے آدمی کے سپرد کر دیئے جائیں جو محمد عربی ﷺ کا باغی اور ملک و ملت کا دشمن ہو اور جس کی وفاداریاں پاکستان کے بجائے ہندوستان سے وابستہ ہوں۔ جو قادیان کی رسالت سے ہندوستان کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کر کے مسلمانان پاکستان کے ساتھ غداری کر رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں ہمارے ارباب اقتدار سوچیں، سمجھیں اور خطرہ محسوس کریں۔ یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ مرزائیت کے خلاف تحریک میں صرف لاہور، ملتان اور لائل پور (فیصل آباد) کے لوگ ہیں۔ ارباب اقتدار کان کھول کر سن لیں کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے اور ظفر اللہ خان قادیانی کی علیحدگی کا مطالبہ پورے پاکستان کا مطالبہ ہے۔ ہم نے وزیر اعظم سے کہہ دیا ہے کہ اب مسلمان زیادہ دیر صبر نہیں کریں گے۔ پانچ سال انہی پریشانیوں میں گزر گئے۔ اب وقت آگیا ہے کہ آپ لوگ منظم ہو کر مجلس عمل کی ہدایات پر عمل کریں تو بہت جلد ہماری تحریک کامیاب ہو جائے گی"۔[1]

---

[1] اللہ وسایا، مولوی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص:۱۵۹/۱۵۶، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

مجلس عمل کے وکیل مولانا مرتضیٰ خاں میکش نے بھی اس کانفرنس سے خطاب کیا جس میں انہوں نے کہا کہ:

''ہم نے وزیر اعظم سے مطالبہ کیا ہے کہ مرزائی پاکستان کی کلیدی آسامیوں پر قابض ہو کر اُس کو لوٹ رہے ہیں۔ اور مسلمانان پاکستان کا حق غصب کر رہے ہیں۔ (آپ کا) مرزائی وزیر خارجہ اپنے عہدہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے ماتحت عملہ کو مرتد بنا رہا ہے۔ (لہٰذا مسلمانان پاکستان کا مطالبہ ہے کہ) اُنہیں اقلیت قرار دیا جائے۔''[1]

مولانا مرتضیٰ خاں میکش نے مجلس عمل کے وفد اور وزیر اعظم سے کراچی میں ہونے والی ملاقات کی تفصیل سے بھی حاضرین اجتماع کو آگاہ کیا۔

اس صورتحال کے بعد مجلس عمل نے مناسب سمجھا کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں محمد خاں دولتانہ سے بھی ملاقات کی جائے اور انہیں اس مسئلے کی اہمیت اور قادیانی ریشہ دوانیوں سے آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کی قیادت میں ایک وفد نے میاں ممتاز دولتانہ سے اُن کی کوٹھی پر ملاقات کی۔ اور مجلس عمل کے شائع شدہ مطالباتی فہرست پیش کرتے ہوئے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ آپ نے وزیر اعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ پر واضح کر دیا کہ:

''ان مطالبات میں تنسیخ و ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرار داد مقاصد کی موجودگی میں حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان مطالبات کو تسلیم کرلے۔ ہماری تحریک نہایت پُرامن ہے۔ اور ہمارا مقصد امن عامہ میں خلل اندازی ہرگز نہیں ہے۔''[2]

میاں ممتاز دولتانہ نے وفد کی باتیں بہت غور سے سننے کے بعد کہا کہ:

''میری ذمہ داری ہے کہ میں امن کو بحال رکھوں اور کسی صورت بدامنی نہیں ہونے

---

[1] ایضاً: ص ۱۵۸، ۱۵۹

[2] اللہ وسایا، مولوی: تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۱۶۴، ۱۶۵، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

دوں۔ بحیثیت مسلمان مجھے آپ کے مطالبات سے ہمدردی ہے۔“[1]

ماسٹر تاج الدین انصاری بیان کرتے ہیں کہ اس ملاقات میں:

”حضرت مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، اور مولانا داؤد غزنوی نے قادیانیوں کے بارے میں گفتگو اور تبادلہ خیالات میں زیادہ حصہ لیا۔[2]

اور مجلس عمل کے وفد نے وزیر اعلیٰ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کے سامنے مسلمانوں کے موقف کی بھرپور ترجمانی کی۔

مسئلہ ختم نبوت پر اراکین مسلم لیگ کا موقف

مجلس عمل کے علماء کی جہد مسلسل اور رابطوں کے نتیجے میں مسئلہ ختم نبوت اب پاکستان کے عوام کا ہی مطالبہ نہیں تھا بلکہ اس مطالبے کی حمایت حکمران جماعت مسلم لیگ کے اراکین بھی علی اعلان کرنے لگے تھے۔ چنانچہ اراکین مسلم لیگ کے دستخط سے پوسٹر اور اشتہارات جاری ہونے لگے۔ اور ختم نبوت کے جلسوں کی صدارت بھی مسلم لیگیوں نے شروع کر دی۔ اس صورتحال کو دیکھ کر پنجاب مسلم لیگ کے صدر نے تمام مسلم لیگی اراکین پر دوسری جماعت کے جلسے اور جلوسوں میں شرکت اور صدارت کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ اور اس سلسلے میں:

”۳ اپریل ۱۹۵۲ء کو ایک گشتی مراسلہ تمام ضلعی اور شہری مسلم لیگیوں کے نام بھی بھیجا گیا۔ جس میں مسلم لیگ کے ممبروں کو غیر مسلم لیگی جلسوں کی صدارت سے منع کیا گیا۔ اور اس امر پر زور دیا گیا کہ مسلم لیگیوں کو ایسی سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہ لینا چاہیے جس سے پاکستانی شہریوں کے مختلف طبقات کے درمیان بیگانگی یا عداوت پیدا ہونے کا احتمال ہو یا جن کا رخ پاکستانی رعایا کے کسی خاص گروہ یا طبقے کے خلاف ہو۔“[3]

---

[1] ایضاً: ص ۱۶۵

[2] ایضاً: ص ۱۶۵، ۱۶۶

[3] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۹۳۔ ۹۴

لیکن اِس واضح ہدایت کے باجود اضلاع اور شہروں میں مسلم لیگ کی شاخیں اِس تحریک کی معاون بننے لگیں۔ جو نہایت سرعت سے پھیل رہی تھی۔

یہ خالصتاً ایک دینی معاملہ تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ کے اراکین اور ذمہ دارانِ نے پنجاب مسلم لیگ کے صدر کی اس ہدایت کو نظر انداز کر دیا۔ اور ۱۷، جولائی ۱۹۵۲ء کو سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ نے ایک جلسہ منعقد کر کے مسئلہ ختم نبوت کی حمایت اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے حق میں بھی قرار دادیں منظور کیں اور حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ ملک و ملت کو مزید انتشار سے بچانے کی خاطر اس نازک مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے عملی اقدام کرے۔ سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ کی منظور شدہ قرار دادوں میں مطالبہ کیا گیا کہ:

''عقیدہ ختم نبوت مسلمانوں کا بنیادی حق ہے۔ سٹی مسلم لیگ اِس امر کی سخت مذمت کرتی ہے کہ احکام زیر دفعہ ۱۴۴، کا اطلاق مساجد پر کیا گیا اِس قسم کے احکام نہ صرف غیر ضروری بلکہ عوام کے فرائض مذہبی کی بجا آوری میں مداخلت خیال کرتی ہے۔ اور پرُ زور مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت ایسے احکام اور مقدمات واپس لے اور جو لوگ اِس خلاف ورزی کی بنا پر مساجد کے اندر جمع ہونے کی وجہ سے گرفتار ہوئے ہیں اُن کو رہا کر دے۔''[1]

اس کے تین دن بعد ۲۰، جولائی ۱۹۵۲ء کو سٹی مسلم لیگ سرگودھا نے بھی اپنی منظور شدہ قراردادوں میں مطالبہ کیا کہ:

''سٹی مسلم لیگ اتفاق رائے سے اِس مطالبہ کی تائید کرتی ہے کہ احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اور صوبہ مسلم لیگ اور آل پاکستان مسلم لیگ سے استدعا کرتی ہے کہ وہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے لیں تا کہ ملت میں مزید انتشار پیدا نہ ہو۔''[2]

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۹۳

[2] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۹۳

دوسری طرف سٹی مسلم لیگ کامونکی نے بھی اپنی ایک منظور شدہ قرارداد میں صوبائی حکومت سے مطالبہ کیا کہ:

''چونکہ پنجاب کے علماء نے اتفاق رائے سے احمدیوں (قادیانیوں) کو خارج از اسلام قرار دے دیا ہے، اس لیے اب احمدی (قادیانی) مسلم لیگ کے ممبر نہیں بن سکتے۔ لہٰذا مسلم لیگ سے احمدی ممبروں کو خارج کر دیا جائے اور آئندہ کوئی احمدی مسلم لیگ کی ممبری کا مستحق نہ سمجھا جائے۔''[1]

مجلس عمل کے مطالبات کی تائید میں گوجرانوالہ، سرگودھا اور کاموںکی سٹی مسلم لیگ کی منظور شدہ قراردادوں نے صدر پنجاب مسلم لیگ میاں ممتاز دولتانہ کو صورتحال کی سنگینی کا احساس دلایا۔ چنانچہ ۱۸، جولائی ۱۹۵۲ء کو ان کا ایک بیان روزنامہ ''آفاق'' میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے مسلم لیگ کے ممبروں سے اپیل کی کہ

''وہ ان مذہبی وسیاسی مسائل کے حل میں لیگ کی امداد کریں جو مسئلہ ختم نبوت کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔ انہوں نے مسلم لیگیوں کو صبر وسکون کی تلقین کی تاکہ صوبہ لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل ان مسئلوں پر غور کر سکے۔ کیونکہ یہی دو تنظیمات ہیں جو صوبہ لیگ کے آئندہ اجلاس میں جمہور کی صحیح رہنمائی کر سکتی ہیں۔''[2]

۲۸، جون ۱۹۵۲ء کو مسلم لیگ صوبہ پنجاب کی مجلس عاملہ نے لاہور میں ۲۶ اور ۲۷، جولائی کو لیگ کا آئندہ اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کیلئے یکم جولائی ۱۹۵۲ء کو اجلاس کا ایک عارضی ایجنڈا بھی مرتب کیا گیا جس میں حیرت انگیز طور پر مسئلہ ختم نبوت جو کہ سب سے اہم اور بنیادی اہمیت کا حامل تھا، منیر انکوائری رپورٹ کے مطابق شامل نہ تھا۔ یہ ایجنڈا کونسل کے تمام ممبروں کے نام بھیج کر ان سے استدعا کی کہ وہ جو قرارداد پیش کرنا چاہیں، ۱۵، جولائی تک صوبائی مجلس عاملہ پنجاب مسلم لیگ کو ارسال کر دیں۔ چنانچہ مرزائیوں کو علیحدہ غیر مسلم اقلیت

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۹۴

[2] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۹۵،۹۴

قرار دینے، چوہدری ظفر اللہ قادیانی کی برطرفی، اور قادیانیوں کے حوالے سے حکومت سے واضح، ٹھوس اور عملی اقدامات اختیار کرنے کیلئے بھی قرار دادیں پیش کی گئیں۔ یہ قرار دادیں ممبر صوبائی مسلم لیگ کونسل ملتان علامہ سید احمد سعید کاظمی، کونسلر پنجاب مسلم لیگ صاحبزادہ سید محمود شاہ گجراتی، قاضی مرید احمد کونسلر پنجاب مسلم لیگ اور محمد ابراہیم قریشی جنرل سیکرٹری سٹی مسلم لیگ جھنگ نے پیش کیں۔ علامہ سید سعید احمد شاہ کاظمی نے ۱۲، جون ۱۹۵۲ء کو قرارداد پیش کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ:

(۱) کہ چونکہ قادیانی بالاتفاق خارج از اسلام سمجھے جاتے ہیں اس لیے اُن کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور حکومت کو اس اعلان میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

(۲) کہ چونکہ چوہدری ظفر اللہ خان قادیانی ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے نمائندے نہیں ہیں اس لیے صوبہ پنجاب کی مسلم لیگ کونسل کو حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے عہدے سے برطرف کر دیئے جائیں اور اُن کی جگہ کوئی قابل اعتبار مسلمان (وزیر خارجہ) مقرر کیا جائے۔"[1]

واضح رہے کہ علامہ کاظمی کی پیش کردہ قرارداد کے مؤیدین خواجہ عبدالحکیم صدیقی، صدر سٹی مسلم لیگ ملتان اور صوفی محمد عبدالغفور لدھیانوی، اعزازی آفس سیکرٹری ضلع مسلم لیگ ملتان، کونسلر صوبہ مسلم لیگ تھے۔

علامہ سید احمد سعید احمد شاہ کاظمی صاحب کی پیش کردہ قرارداد کے حوالے سے پندرہ روزہ "ندائے اہلسنّت" لاہور یکم تا پندرہ، اپریل ۱۹۹۲ء کے شمارے میں لکھتا ہے:

"اگر یہ قرارداد اُس وقت منظور کرلی جاتی تو قادیانیت کا مسئلہ اُسی وقت حل ہو جاتا، قادیانی عناصر نے بعد کے اَدوار میں جس طرح قوت پکڑ کر اِس مملکت کو جن عظیم نقصانات سے دو چار کیا وہ پیش نہ آتے، مگر افسوس کہ آپ کی پیش کردہ قرارداد کو مسلم

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص:۹۶

لیگی زعماء نے خاطرخواہ پذیرائی نہ بخشی۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگیا کہ یہ مسلم لیگ وہ نہیں رہی جو حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں اسلامی نظام کے نفاذ کا پروگرام لے کر چلی تھی۔ چنانچہ یہی دل برداشتگی آپ کی مسلم لیگ سے علیحدگی کا باعث بنی۔ عظمت و شان رسول ﷺ کے تحفظ کیلئے آپ نے قادیانیوں کا تعاقب جاری رکھا۔ جمعیت علماء پاکستان، جماعت اہلسنت پاکستان، تنظیم المدارس اور دوسری متحدہ تنظیموں کی وساطت سے آپ نے ختم نبوت کے مسئلے کی عظمت و اہمیت کو واضح کیا تا آنکہ حکومت نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔"[1]

۱۴رجولائی ۱۹۵۲ء کو قاضی مرید احمد، ایم ایل اے کونسلر پنجاب مسلم لیگ نے صاحبزادہ سید محمود شاہ گجراتی کی تائید سے اپنی قرارداد میں مطالبہ کیا کہ:

"پنجاب مسلم لیگ کونسل کا یہ اجلاس حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہے کہ مرزائی ایک علیحدہ غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جائیں اور مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ جلد از جلد پنجاب اسمبلی میں ایک قرارداد منظور کرے جس میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ کیا گیا ہو کہ مرزائی ایک علیحدہ غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جائیں۔"[2]

اسی تاریخ کو صاحبزادہ سید محمود شاہ گجراتی، کونسلر پنجاب مسلم لیگ نے قاضی مرید احمد کونسلر پنجاب مسلم لیگ کی تائید سے ایک قرارداد میں یہ مطالبہ بھی کیا کہ:

"چوہدری ظفر اللہ خان مملکت کے وفادار نہیں ہیں اور یہ اجلاس یقین کرتا ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خان نے وزیر خارجہ کے عہدے سے فائدہ اٹھا کر عقیدۂ مرزائیت کی تبلیغ کی ہے اور سرکاری عہدوں پر مرزائیوں کو مقرر کیا ہے۔ اِس جلسے کی رائے میں کشمیر کے مسئلے کے حل میں ہماری ناکامی کا باعث صرف چوہدری ظفر اللہ خان کی ناقابلیت ہی نہیں بلکہ برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ اُن کی جماعت کی روایتی وفاداری بھی اِس

---

[1] صادق علی زاہد، علمائے حق اور رد فتنہ مرزائیت، ص: ۴۰، گنبد خضرا پبلی کیشنز لاہور، جنوری ۲۰۰۱ء

[2] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۹۵

ناکامی کی ذمہ دار ہے۔لہٰذا پاکستان ،ممالک اسلامی اور کشمیر کے مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ چوہدری ظفراللہ خان کو حتی الامکان جلد سے جلد اُن کے عہدے سے برطرف کر دیا جائے۔"[1]

۱۴رجولائی ہی کو محمد ابراہیم قریشی ،جنرل سیکرٹری سٹی مسلم لیگ جھنگ ،کونسلر پنجاب مسلم لیگ نے اپنی پیش کردہ قرارداد میں مطالبہ کیا کہ:

''کونسل کو یہ اعلان کرنا چاہیے کہ احمدیوں کو ان کے اپنے اظہارات اور تحریرات کی بنا پر ایک علیحدہ غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے،اور کونسل کو پیغمبر اسلام ﷺ پر ختم نبوت کے عقیدے کی حفاظت کیلئے ضروری تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اور آئندہ جماعت احمدیہ کے کسی ممبر کو کسی کلیدی عہدے پر مقرر نہ کرنا چاہیے۔مسلم لیگ کو عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے تاکہ آئندہ کوئی ظلی یا بروزی اِس عقیدے کے خلاف کوئی نظریہ پیش کر کے مملکت کی سالمیت کو خطرے میں ڈال سکے۔''[2]

۱۵رجولائی ۱۹۵۲ء کو محمد اسلام الدین،ایم ایل اے وہاڑی ضلع ملتان نے اپنی قرار داد میں مطالبہ کیا کہ:

''چونکہ مرزائی پیغمبر اسلام کی خاتمیت پر یقین نہیں رکھتے بلکہ اس کے برعکس اس خاتمیت کے ماننے والوں کو کافر خیال کرتے ہیں۔ اس لیے اُن کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ یہ مطالبہ مذہبی ،جمہوری اور دستوری اصولوں کا تقاضا ہے کہ پنجاب صوبہ مسلم لیگ مرکزی حکومت پر عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت واضح کرے اور اس حکومت سے مطالبہ کرے کہ اس عقیدے کے مخالفین کو اقلیت قرار دے۔''[3]

۲۵رجولائی ۱۹۵۲ء کو مجلس عاملہ کا دوسرا اجلاس میاں ممتاز دولتانہ صدر پنجاب مسلم لیگ

---

[1] ایضاً،ص ۹۵

[2] رپورٹ تحقیقاتی عدالت،برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء،ص:۹۶

[3] رپورٹ تحقیقاتی عدالت،برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء،ص:۹۵،۹۶

کی زیرِ صدارت منعقد ہوا جس میں میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ نے اعلان کیا کہ میں نے اور دوسرے عہدے داران نے ۱۵، جولائی تک موصول ہونے والی قرار دادوں کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ کونسل میں صرف آٹھ قرار دادیں پیش کی جائیں گی ۔اور منظور شدہ قرار دادوں کی فہرست میں قرار داد نمبر ۳، "قرار داد ختم نبوت" سید مصطفیٰ شاہ خالد گیلانی پیش کریں گے ۔ چنانچہ ۲۷، جولائی کے اجلاس میں مشہور مسلم لیگی رہنما سید مصطفیٰ شاہ خالد گیلانی کی مسئلہ ختم نبوت کی تائید وحمایت میں پیش کردہ مندرجہ ذیل قرارداد ۸، کے مقابلے میں ۲۸۴ ووٹوں کی بھاری اکثریت سے منظور ہوئی ۔

"پنجاب مسلم کونسل اس صداقت کا پورا شعور رکھتی ہے کہ ختم نبوت دین اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے جس نے مسلمانان عالم کو ایک روحانی اخوت کے رشتے میں جکڑ رکھا ہے اور جو پاکستان میں ملت مسلمہ کے اتحاد و سالمیت کی مستحکم بنیاد کا حکم رکھتا ہے ۔ اس صداقت کا یہ واضح اور طبعی نتیجہ ہے کہ عقیدۂ ختم نبوت کے نہ ماننے والے اسلام کے دینی عقائد سے بنیادی اختلاف رکھتے ہیں ۔ اس موقف کی بنیاد پر جس کے متعلق نہ کوئی اختلاف موجود ہے، نہ ہوسکتا ہے ۔ایک تجویز پیش کی گئی ہے جو سیاسی اقدام اور دستوری قانون سازی کے دائرے سے تعلق رکھتی ہے کہ احمدی جو ایک دینی مسئلے پر اساسی اختلافی رویہ رکھتے ہیں، دستور پاکستان میں ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جائیں ۔کونسل کی رائے میں یہ تجویز کسی حد تک مسلمانوں کے اُس ردعمل کو ظاہر کرتی ہے جو احمدیوں کے رویے سے پیدا ہوا ہے کیونکہ احمدیوں نے نہ صرف مذہبی معاملات میں بلکہ شہری اور مجلسی زندگی میں بھی اکثر علیحدگی کے قوی رجحانات کا اظہار کیا ہے ۔"[۱]

تحریک ختم نبوت کا فیصلہ کن مرحلہ

۷، ستمبر ۱۹۵۲ء کے آخری ہفتے میں یہ افواہ پھیل گئی کہ قادیانی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ کو

---

[۱] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۹۶، ۹۷

وزارت خارجہ سے علیحدہ کر کے حکومت اُسے مرکزی وزیر صنعت وحرفت بنا رہی ہے۔ مسلمانوں کو یہ بات قطعی گوارہ نہ تھی کہ چوہدری ظفر اللہ قادیانی کو ایک جگہ سے ہٹا کر کسی اور وزارت پر مقرر کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک بار پھر ملک بھر میں احتجاج اور ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ حکومت کے اِس متوقع اقدام کے خلاف مجلس عمل نے ۳، اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ملک بھر میں یوم احتجاج منانے کا فیصلہ کیا۔ اُس روز پاکستان کے طول وعرض میں حکومت اور چوہدری ظفر اللہ قادیانی کے خلاف بھرپور یوم احتجاج منایا گیا۔ جلسے جلوسوں اور مظاہروں کا اہتمام کیا گیا۔ مذمتی قراردادیں منظور کی گئیں اور حکومت کے اِس مجوزہ اقدام کے خلاف بھرپور عدم اطمینان کا اظہار کیا۔

دوسری طرف وزیر اعظم سے مایوس کن ملاقات کے بعد مجلس عمل کے رہنماؤں نے تحریک کو اپنے منطقی انجام تک پہنچانے کیلئے تحریک کو مزید منظم اور فعال بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران اِن رہنماؤں کی یہ کوشش بھی رہی کہ ہر قسم کے تصادم اور ہنگامہ آرائی سے گریز کرتے ہوئے تحریک کو جاری رکھا جائے اور تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کیا جائے۔ خواہ اس راہ میں کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ دینا پڑیں۔ چنانچہ ۱۱، دسمبر ۱۹۵۲ء کو مجلس عمل کے تمام علماء کرام اور دینی جماعتوں کو کنونشن کے دعوت نامے جاری کر دیئے گئے اور کراچی میں آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کا اجلاس ۱۶، ۱۷ اور ۱۸، جنوری ۱۹۵۳ء کو طلب کر لیا گیا۔

آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کا انعقاد اور آخری معرکے کی تیاری

۵ اگست ۱۹۵۲ء کو کراچی میں علماء بورڈ کے مشترکہ اجلاس کے طے شدہ پروگرام کے مطابق" آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن" کے اجلاس ۱۶، ۱۷ اور ۱۸، جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں منعقد ہوئے۔ اس کنونشن میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان سے کثیر تعداد میں کم بیش ایک سو پچھتر (۱۷۵) سے زائد علماء ومشائخ نے شرکت کی۔

اہلسنّت وجماعت کے جن اکابرین نے اِن اجلاسات میں شرکت کی۔ اُن میں مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری (صدر جمعیت علماء پاکستان وصدر مجلس عمل)، مولانا عبد الحامد بدایونی

صاحب، مولانا مفتی صاحب داد صاحب، پیر سر سینہ ابو صالح محمد جعفر صاحب امیر حزب اللہ (مشرقی پاکستان) کے علاوہ مسلم لیگی رہنماء جناب الحاج ہاشم گزدر کے نام نمایاں تھے۔ اِن کے علاوہ دیگر علماء میں جناب عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی احمد علی لاہوری، مولانا محمد یوسف بنوری، سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا سلطان احمد، حاجی محمد امین وغیرہ بھی شامل ہیں۔

۱۸، جنوری ۱۹۵۳ء کو منعقدہ اجلاس کی دوسری نشست میں حکومت پاکستان کے قادیانیت نواز رویے کے پیش نظر شرکاء اجلاس نے حسب ذیل قراردادیں بھی منظور کیں:

(۱) چونکہ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان کے رویے کے پیش نظر اس اَمر کی کوئی امید نہیں (چنانچہ) مرزائیوں کے متعلق مطالبات کو تسلیم کرانے کی غرض سے "راست اقدام" ناگزیر ہوگیا ہے۔

(۲) چونکہ حکومت قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے پر آمادہ نہیں ہے، اِس لیے ایسی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہوگیا ہے کہ فرقہ مرزائیہ کو ملت اسلامیہ سے خارج کر دیا جائے۔ اِن تدابیر میں سے ایک یہ ہے کہ اس فرقہ کا کامل مقاطعہ کیا جائے۔

(۳) چونکہ مرزائی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ کی برطرفی کا مطالبہ اب تک منظور نہیں کیا گیا۔ اس لیے کنونشن خواجہ ناظم الدین سے استعفیٰ کا مطالبہ کرتی ہے تاکہ مسلمانان پاکستان اپنے دینی عقائد پر عمل کرنے اور اسلامی روایات کی حفاظت کرنے کے قابل ہوجائیں۔"[۱]

ابوالحسنات سید محمد احمد قادری تحریک کے پہلے قائد مقرر

مندرجہ بالا مطالبات کو عملی شکل دینے کیلئے کنونشن نے مختلف مذہبی جماعتوں کے سربراہوں پر مشتمل ایک کونسل آف ایکشن "مجلس عمل" بھی قائم کی۔ جس کے ممبران کی تعداد آٹھ تھی۔ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کو کونسل آف ایکشن "مجلس عمل" کا سربراہ (صدر) منتخب

---

[۱] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۱۴۳

کیا گیا۔ مجلس عمل کے دیگر ممبران میں مولانا ابوصالح محمد جعفر پیر صاحب سرسینہ شریف (مشرقی پاکستان) اور مولانا عبدالحامد بدایونی کا تعلق اہلسنّت و جماعت سے تھا جبکہ دیگر مکتبہ فکر کے نمائندوں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، حافظ کفایت حسین، محمد یوسف کلکتوی اور مولانا احتشام الحق تھانوی شامل تھے۔

یہ بات پیش نظر رہے کہ مولانا احتشام الحق تھانوی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دن میں مجلس عمل کے اجلاسوں میں شرکت کرتے تھے اور رات میں خفیہ ایجنسیوں اور حکومتی اہلکاروں کو مجلس عمل اور علماء کی دن بھر کی سرگرمیوں کے بارے میں مخبری کیا کرتے تھے۔ مولانا جمیل احمد نعیمی "حیات جمیل مع افکار جمیل" صفحہ ۲۳۲۔۲۳۱، پر لکھتے ہیں کہ:

"۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں جب تمام مکاتب فکر کے علماء اِس تحریک میں شریک تھے ایسے میں دیوبندی مکتب فکر کے مشہور و معروف خطیب مولوی احتشام الحق تھانوی دن میں علماء کے ساتھ مختلف اجلاس میں شریک ہوتے اور رات میں حکام وقت کو پورے دن کی رپورٹ فراہم کرتے تھے۔"

جبکہ مولوی اللہ وسایا بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دلائل و شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ:

"بعض علمائے کرام کا خواجہ ناظم الدین کے ساتھ اُس وقت خفیہ رابطہ قائم ہو چکا تھا..... حکومت تحریک شروع ہونے سے پہلے ہی تحریک کے لیڈروں کے درمیان فرق پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی ..... (اور) مجلس عمل کے کچھ ممبران پارٹی مفاد کے خلاف خواجہ ناظم الدین سے راز و نیاز رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ خواجہ ناظم الدین نے منیر انکوائری کمیشن کے سامنے مولانا مظہر علی اظہر کے ایک سوال کے جواب میں اِس اَمر کو تسلیم کیا ہے۔"[1]

یہی وجہ تھی جو ۲۲ فروری ۱۹۵۳ء کو جو مجلس عمل کے وفد کی وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کا ایجنڈا طے کرتے ہوئے مولانا عبدالحامد بدایونی نے وزیر اعظم کے سامنے یہ شرط

---

[1] اللہ وسایا، مولوی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص:۷۶۔۷۵، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

رکھی تھی کہ اِس ملاقات میں کل والے علمائے کرام میں سے کسی کو شامل نہ کیا جائے۔ تفصیل کیلئے منیر انکوائری رپورٹ صفحہ ۱۳۸،اور تحریک ختم نبوت صفحہ ۲۷۶، دیکھئے۔

اسی طرح مولانا اختر علی خاں جو مولانا ظفر علی خاں جیسے نامور فرد کے بیٹے تھے، کو مولانا غلام محمد ترنم اور حافظ خادم حسین کے ساتھ گرفتار ہونے کے چند گھنٹوں بعد تحریک سے لاتعلقی کے اعلان اور معافی نامہ لکھنے کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا تھا، کے بارے میں مولوی اللہ وسایا اپنی کتاب ''تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء'' کے صفحہ ۳۴۴، پر لکھتے ہیں کہ:

''مولانا اختر علی خان کے متعلق ماسٹر تاج الدین انصاری خود تسلیم کرتے ہیں کہ اُن کا قصہ عجیب ہوا وہ اب مرحوم ہو گئے ہیں۔ اُن کے متعلق کیا کہا جائے۔ بس عجیب طبیعت کے رہنماء تھے۔ اگر چہ مولانا ظفر علی خاں جیسے بہادر اور مجاہد لیڈر کے بیٹے تھے لیکن بڑی ہی جذباتی اور غیر مستقل قسم کی طبیعت پائی تھی۔''

بہرحال کونسل آف ایکشن ''مجلس عمل'' کے نو منتخب آٹھ ارکان نے ۱۸، جنوری شام کے اجلاس میں ممبران کی تعداد میں مزید سات افراد کا اضافہ کیا اور اپنی پندرہ رکنی جنرل کونسل مکمل کی۔ جن سات نئے ممبران کو جنرل کونسل میں شامل کیا گیا۔ اُن میں پیر غلام مجدد سرہندی، صاحبزادہ فیض الحسن شاہ آلومہاروی صاحب، مولانا سید نور الحسن شاہ، مولانا تاج الدین انصاری، مولانا اختر علی خاں مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالوی، اور حاجی محمد امین سرحدی شامل تھے۔ واضح رہے کہ اوّل الذکر دونوں علماء کرام کا تعلق اہلسنت و جماعت سے تھا۔ ساتھ ہی کونسل آف ایکشن کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ حسب ضرورت تحریک کا صدر مقام اور مطالبات تسلیم کروانے کیلئے مناسب لائحہ عمل منتخب کر سکتی ہے۔

مجلس عمل نے اپنے پروگرام کو عملی شکل دینے سے پیشتر یہ بھی طے کیا کہ منتخب نمائندوں پر مشتمل علماء کا ایک وفد مرکزی حکومت سے ملاقات کر کے انہیں اپنے آخری فیصلے سے آگاہ کرے گا۔ اِس وفد کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ کابینہ کو آخری جواب دینے کیلئے مزید وقت دے سکتا ہے۔ چنانچہ فاتح سرحد مولانا عبد الحامد بدایونی صاحب کی قیادت میں ایک چار رکنی وفد

تشکیل دیا گیا۔جس میں مولانا عبدالحامد بدایونی کے علاوہ پیر صاحب سرسینہ شریف ابوصالح محمد جعفر صاحب (ڈھاکہ، بنگال)،ماسٹر تاج الدین انصاری (مجلس احرار) اور سید مظفر علی شمسی (تحفظ حقوق شیعہ) شامل تھے۔اس وفد نے ۲۲.جنوری ۱۹۵۳ء کو وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کر کے انہیں مجلس عمل کے مطالبات سے آگاہ کیا۔

''خواجہ ناظم الدین نے وفد کے مطالبات سے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں اِن مطالبات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہوں۔''[1]

مطالبات کی منظوری کیلئے حکومت کو ایک ماہ کا نوٹس

چنانچہ مجلس عمل کی تکمیل کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق ۲۲.جنوری کو مجلس عمل کا ایک وفد وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو آل پارٹیز مسلم کنونشن کا ریزولیشن اور مجلس عمل کا ایک ماہ کا نوٹس دینے کیلئے شام کے وقت پیر صاحب سرسینہ شریف کی سرگردگی میں ملا۔اس دن چونکہ اِس حوالے سے ملاقات کا آخری موقع تھا۔اس لیے وفد اور خواجہ صاحب کے درمیان گفتگو شروع ہوئی اور:

وفد نے خواجہ صاحب کو متعدد ملاقاتوں کا حوالہ دے کر بتایا کہ ہم کب کب حاضر ہوئے اور کیا کچھ عرض کیا۔مرزائی کس طرح آگے بڑھے۔اور ظفر اللہ خان کی وساطت سے وہ کلیدی اسامیوں پر کس طرح چھاگئے مسلمانوں نے کتنی بار احتجاج کیا۔آپ کے پاس طرح فریاد کی مگر آپ نے سنی اَن سنی کر دی۔جب بھی بات ہوئی آپ نے مطالبات کو درست تسلیم کیا مگر اِن مطالبات میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی ایسا قدم نہ اٹھایا جس سے تسلی ہوتی اور ہم مسلمانوں سے کہہ سکتے کہ مطالبات کو پورا کرنے میں کچھ وقت لگے گا،حکومت کو مہلت ملنا چاہیے۔اِس کے برعکس خلیفہ محمود اور اُس کے حواری ربوہ کو زیادہ سے زیادہ محفوظ اور ریشہ دوانیوں کا قلعہ بناتے جارہے ہیں۔اخبار الفضل میں

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت،برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء،ص:۱۳۵

آئے دن اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اور مرزائیوں کے حق میں فضا بنائی جارہی ہے۔ جبکہ مسلمانوں کو تبلیغ حق کیلئے مسجدوں تک میں روکا گیا ہے۔ اسلامی ملک میں جس کے سربراہ آپ جیسے متدین وزیراعظم ہوں مسلمانوں پر طرح طرح کی پابندیاں ہیں مگر مرزائیوں کو من مانی کرنے کی کھلی چھٹی ہے...... اس صورتحال نے مسلمانوں کو مایوس کر دیا ہے۔"[1]

اس موقع پر پیر صاحب سرسینہ شریف ابو صالح جعفر صاحب نے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین سے آل پاکستان پارٹیز مسلم کنونشن کا ریزولیشن اور مطالبات کی منظوری کیلئے حکومت کو مجلس عمل کی جانب سے ایک ماہ کا نوٹس دیا اور ان پر واضح کر دیا کہ یہ آخری موقع ہے کہ وہ مسلمانوں کے مطالبات مان لیں۔ بصورت دیگر آنے والے حالات کی ذمہ دار حکومت ہوگی۔ مگر خواجہ ناظم الدین نے اپنے پرانے مؤقف کا اعادہ کیا اور پیر صاحب سرسینہ شریف سے کہا کہ:

"میں اگر قادیانیوں کے خلاف آپ کا مطالبہ مان لوں تو امریکہ ہمیں ایک دانہ گندم کا نہیں دے گا اور دوسرا یہ کہ وہ کشمیر کے مسئلے میں ہماری کوئی مدد نہیں کرے گا۔"[2]

خواجہ ناظم الدین نے مطالبات کی منظوری سے معذوری کا اظہار کر کے عوام کے غیض و غضب میں اضافہ کر دیا۔ عوام اچھی طرح سمجھتے تھے کہ پُرامن رہتے ہوئے حکومت آسانی سے یہ مطالبات تسلیم نہیں کرے گی۔ لہٰذا ضروری ہوگیا ہے کہ اب پُرامن جدوجہد کا راستہ ترک کر کے براہ راست تصادم کا راستہ اپنایا جائے۔ جبکہ مجلس عمل کے رہنماؤں کی خواہش تھی کہ یہ مسئلہ پُرامن طریقے سے حل کر لیا جائے۔

چنانچہ مجلس عمل کے رہنماؤں نے احتجاجی جلسے اور جلوسوں میں عوام کو پُرامن رہتے ہوئے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کی تلقین کی۔ انہوں نے عوام کو یہ ہدایت بھی دی کہ وہ اپنی صفوں میں امن شکن عناصر پر کڑی نظر رکھیں۔ مجلس عمل کے رہنما نہیں چاہتے تھے کہ کسی گڑبڑ اور اشتعال

---

[1] اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۲۴۹ـ۲۴۸، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

[2] ایضاً، ص ۲۴۹

انگیزی کی وجہ سے تحریک اور تحریکی مقاصد کو نقصان پہنچے۔

ہزاروں کروڑوں پاکستان نبی پاک ﷺ کی ناموس پر قربان

۵ ،فروری ۱۹۵۳ءکو لاہور کے بیرون موچی دروازہ میں حضرت مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب کی زیر صدارت عظیم الشان جلسہ عام منعقد کیا گیا۔جس میں مشہور سنّی علماء مولانا غلام محمد ترنم ،مولانا عبدالغفور ہزاروی ،مولانا غلام دین محمد ،مولانا محمد بخش مسلم سمیت متعدد حضرات نے شرکت کی ۔مولانا عبدالغفور ہزاروی نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

''ایسا دستور ،جس میں نبوت محفوظ نہیں اور جس میں ناموس ختم رسالت ﷺ کے تحفظ کا بندوبست نہیں کیا گیا ،اسے دستور کہنا دستور کی توہین ہے۔مسلمان اس دستور میں صرف ایک بات مانگتے ہیں ۔محمد عربی ﷺ کی شخصیت ،اُن کے مقام و منصب کی عزت و ناموس کا تحفظ کیا جائے اور منصب ختم نبوت پر ڈاکہ نہ پڑنے دیا جائے۔آپ نے فرمایا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ کے جوتوں کے طفیل پاکستان ملا ہے اور ایسے ہزاروں کروڑوں پاکستان نبی پاک ﷺ کے نعلین مبارک کے صدقے میں مل سکتے ہیں ۔بشرطیکہ اُن کے اُمتی کہلانے والے ناموس رسالت ﷺ پر دنیا کا مال و متاع حتیٰ کہ سلطنتیں تک قربان کرنے کو تیار ہوں ۔حکومت نے کراچی میں طلباء پر فیس میں کمی کے مطالبے پر فائرنگ کر کے انہیں گولیوں کا نشانہ بنایا ہے ۔اِن طلباء نے ہمیں یہ درس دیا ہے کہ جب وہ فیس میں کمی کے مطالبے پر جام شہادت نوش کر سکتے ہیں تو کیا ہم ناموس رسالت ﷺ کے تحفظ کی خاطر قربانی نہیں دے سکتے ۔حکومت کو عوام کی طاقت کے آگے جھکنا ہی پڑے گا۔ہم ملک میں بدامنی نہیں چاہتے لیکن ۲۲ ،فروری کے بعد صورتحال کی ذمہ داری ارباب اقتدار پر ہوگی ۔سول نافرمانی ہو یا بغاوت ،نتائج کی ذمہ داری خواجہ ناظم الدین اور اُن کی کابینہ پر ہوگی ۔اِس موقعے پر آپ نے عوام سے ہاتھ اٹھا کر عہد لیا کہ

ناموس مصطفی ﷺ کے تحفظ کیلئے خون کا آخری قطرہ تک بہادیں گے۔"[1]

اس جلسہ عام کے آخر میں مشہور خانقاہوں کے سجادہ گان سیال شریف، گولڑہ شریف، دیوان شریف، علی پور شریف کی طرف سے تحریری طور پر تحفظ ختم نبوت کیلئے ہر قسم کی قربانی پیش کرنے کا حلف اٹھایا گیا اور مرزائیوں کے سوشل بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا۔ اس جلسہ عام میں واضح اعلان کیا گیا کہ اگر حکومت نے مسلمانوں کے مطالبات تسلیم نہیں کئے تو ارباب اقتدار کو کرسیاں خالی کرنا ہوں گی۔

فدایان ختم نبوت "رضا کاروں" کی بھرتی

چنانچہ اس جلسے کے بعد رضا کاران ختم نبوت کی بھرتی کا کام شروع ہوگیا۔ ہر ضلع میں رضا کاروں کی بھرتی کے دفتر کھل گئے اور مجلس عمل نے صاحبزادہ فیض الحسن آلو مہاروی کو رضا کاروں کا سربراہ مقرر کردیا گیا۔ صاحبزادہ صاحب نے رضا کاروں کی تنظیم اور ترتیب کا کام شروع کردیا۔ چنانچہ آپ نے گوجرانوالہ میں رضا کاروں کی تربیت کیلئے ایک ٹریننگ کیمپ قائم کیا اور رضا کاروں کی تربیت میں مصروف ہوگئے۔ پورے ملک سے ہزاروں کی تعداد میں فدایان ختم نبوت نے تحریک میں حصہ لینے کیلئے اپنے اپنے ناموں کا اندراج کرایا۔ تحریک ختم نبوت میں اپنا حصہ ڈالنے کیلئے ان فدایان ختم نبوت کے جوش اور جذبوں کا یہ عالم تھا کہ وہ بھرتی کے مراکز پر حلف ناموں پر اپنے خون سے دستخط یا انگوٹھا ثبت کرتے تھے۔ مولوی اللہ وسایا، مولوی تاج محمود سے روایت کرتے ہوئے تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، صفحہ ۲۶۵، پر لکھتے ہیں:

> "رضا کاروں کا وہ جذبہ گفتنی نہیں دیدنی تھا۔ بس ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے ان نوجوانوں کے سینوں میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے دل دھڑکنے لگ گئے ہیں اور یہ دنیا و مافیہا سے منہ موڑ کر اپنے آقا ﷺ کی حرمت پر قربان ہوجانا چاہتے ہیں۔"

دوسری طرف مجلس عمل کے رہنماء ملک کے کونے کونے میں مطالبات کے حق میں

---

[1] اللہ وسایا، مولوی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۲۶۲، ۲۶۳، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

تقریریں کر رہے تھے۔ حکومت کو دیئے گئے نوٹس کی معیاد تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ صورتحال اس قدر کشیدہ تھی کہ نہ تو حکومت مطالبات ماننے پر تیار تھی اور نہ ہی مجلس عمل پیچھے ہٹنے پر آمادہ تھی۔ دونوں جانب سے اس قدر سخت مؤقف اپنانے کے باوجود مجلس عمل کے رہنما نہیں چاہتے تھے کہ مفاہمت کے راستے بند ہو جائیں اور تحریک پُرتشدد راستوں پر جا نکلے۔ چنانچہ انہوں نے آخری وقت تک اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اور اتمام حجت کا کوئی پہلو خالی نہ چھوڑا۔

علماء اپنا اٹھایا ہوا قدم واپس ہرگز نہیں لیں گے

۶ر فروری ۱۹۵۳ء کو مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب نے مسجد وزیر خان میں جمعہ کی تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''ہمارا پروگرام تخریبی نہیں، اگر خواجہ ناظم الدین وقت کی نزاکت کے پیش نظر ملت کے مطالبات تسلیم کرلیں تو ہم سے زیادہ اس حکومت کا خیر اندیش اور بہی خواہ اور کون ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا، میں پوچھتا ہوں کہ خواجہ ناظم الدین صرف ظفر اللہ کو وزارت سے نکالنے میں اتنے خوفزدہ کیوں ہیں۔ آخر انہیں کھوڑو کو وزارت سے علیحدہ کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ انہیں بنگال کے لیڈر فضل الرحمٰن کو نکالنے کا حوصلہ کہاں سے مل گیا۔ خواجہ صاحب ظفر اللہ کو نکالنے سے پہلے ملت سے قربانیاں کیوں مانگ رہے ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر خواجہ ناظم الدین کو دعوت فکر دیتا ہوں کہ وہ اپنے ضمیر سے پوچھیں کہ کیا ملت اسلامیہ ختم نبوت کے مسئلے کیلئے ہر قربانی کیلئے تیار نہیں ہے۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ علماء کرام اپنا اٹھایا ہوا قدم ہرگز واپس نہیں لیں گے جب تک کہ مطالبات کو تسلیم نہیں کرلیا جاتا۔''[1]

۱۶ر فروری ۱۹۵۳ء کو وزیر اعظم کی لاہور آمد کے موقع پر لاہور میں زبردست ہڑتال کی گئی اور دہلی دروازے کے باہر مجلس عمل کا عظیم الشان احتجاجی جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کے اختتام پر

---

[1] روزنامہ زمیندار ۸ر فروری ۱۹۵۳ء، مشمولہ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء ص: ۲۸۷، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

شام میں مجلس عمل کا ایک وفد مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کی سربراہی میں گورنر ہاؤس میں خواجہ ناظم الدین سے ملنے گیا۔لیکن حسب سابق خواجہ صاحب کی طرف سے وہی معذرت اور معذوری کا اظہار پایا گیا۔ اس ملاقات کے نتائج سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ آنے والے دنوں میں تصادم ناگزیر ہو گیا ہے۔جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، مسلمانوں کے اضطراب اور بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اُن دنوں کراچی پاکستان کا مرکز اور دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے اپنی علیحدہ شناخت رکھتا تھا۔مجلس عمل نے طے کیا کہ الٹی میٹم کے خاتمے کے قریب تین دن کیلئے آرام باغ کراچی میں جلسۂ عام منعقد کئے جائیں۔ چنانچہ مولانا عبدالحامد بدایونی نے جلسہ عام کی اجازت حاصل کی۔

۲۱رفروری ۱۹۵۳ء کو مجلس عمل کے ایک وفد جس میں مولانا عبدالحامد بدایونی، سید سلیمان ندوی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مفتی محمد شفیع دیوبندی اور مولانا اختر علی خاں وغیرہ شامل تھے، کراچی میں خواجہ ناظم الدین سے ملا۔ سردار عبدالرب نشتر بھی ملاقات کے وقت موجود تھے۔وفد نے وزیراعظم کو یاد دلایا کہ:

> ''آج ۲۱رفروری ہے۔دیئے گئے نوٹس کو ایک ماہ گزر چکا ہے۔لہٰذا مطالبات کے متعلق کوئی دوٹوک فیصلہ کریں۔خواجہ صاحب نے وہی پرانی باتیں دہرائیں اور وفد سے ایک بار پھر معذرت چاہی۔''

علامہ عبدالحامد بدایونی کی مومنانہ بصیرت

اِس مقام پر منیر انکوائری رپورٹ کے اُس اہم اقتباس کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے، جس میں جسٹس منیر نے مندرجہ بالا ملاقات کا حوالے دیتے ہوئے لکھا کہ:

> ''گفتگو کے دوران مولانا احتشام الحق تھانوی نے کاغذ کے ایک پُرزے پر کچھ لکھ کر دوسروں کو دکھایا۔جس پر مولانا عبدالحامد بدایونی کے سوا باقی سب نے قبولیت کے

اظہار کے طور پر سر ہلائے۔"[1]

کاغذ کے ٹکڑے پر لکھی ہوئی وہ بات کیا تھی جس پر ماسوائے مولانا عبدالحامد بدایونی کے مجلس عمل کے سارے رہنما، راضی تھے۔ آیئے مولوی اللہ وسایا سے جاننے کی کوشش کرتے، جو لکھتے ہیں کہ:

"اگر چہ اِس راز سے آج تک کسی رہنماء نے پردہ نہیں اٹھایا کہ (احتشام الحق تھانوی نے) پُرزے پر کیا لکھا تھا، جو مولانا بدایونی مرحوم کے علاوہ باقی لوگوں نے قبول کرلیا تھا۔ (لیکن روایت کے مطابق) خواجہ ناظم الدین اِس بات پر رضامند ہو گئے تھے کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے متعلق وہ غور کرنے کو تیار ہو جائیں گے، البتہ سر ظفراللہ خاں کو نکالنا اُن کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اِس لیے مجلس عمل کے رہنماء سر ظفراللہ خاں کی برطرفی کے مطالبہ سے دستبردار ہو جائیں لیکن مولانا بدایونی اِس کے لیے رضامند نہ ہوئے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ تمام خرابیوں کی جڑ سر ظفراللہ خاں کو سمجھا جاتا تھا۔" اِس واقعہ کو درست قرار دیتے ہوئے مولوی اللہ وسایا آگے لکھتے ہیں کہ "یہ واقعہ نظر بہ ظاہر درست ہی معلوم ہوتا ہے۔"[2]

منیر انکوائری رپورٹ اور مولوی اللہ وسایا کی عبارتوں کو سامنے رکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ مولوی احتشام الحق تھانوی نے حکومتی ایماء پر کاغذ کے ٹکڑے پر جو تجویز لکھ کر مجلس عمل کے وفد کے سامنے پیش کی، وہ یہ تھی کہ مجلس عمل اگر قادیانی وزیر خارجہ ظفراللہ خاں کی برطرفی کے مطالبے سے دستبردار ہو جائے تو حکومت قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے پر غور کر سکتی ہے، جس پر سوائے مولانا عبدالحامد بدایونی کے سب نے اظہار آمادگی ظاہر کیا۔

یہاں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ جب وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین، سردار عبدالرب نشتر یا کسی اور حکومتی ذمہ دار اور مجلس عمل کے رہنماؤں کے درمیان اِس اجلاس سے قبل مندرجہ بالا تجویز کے

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۱۳۸

[2] اللہ وسایا، مولوی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۲۷۵، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

حوالے سے کوئی گفت وشنید نہیں ہوئی۔اور نہ ہی دوران اجلاس ایسی کوئی تجویز حکومتی ذمہ داران کی جانب سے سامنے آئی۔تو پھر مولوی احتشام الحق تھانوی کو یہ تجویز کب،کہاں اور کس حکومتی ذمہ دار نے دی۔؟اور یہ کہ اس تجویز کے پس پردہ اصل اسباب ومحرکات کیا تھے۔؟

یہی اس واقعہ کا وہ اصل اور پس پردہ پہلو ہے جس سے مولوی اللہ وسایا نے اس لیے صرف نظر کیا کہ اُن کے ہم مکتبہ فکر لوگ اس سازش میں ملوث تھے۔گو اُنہوں نے گول مول انداز میں یہ ضرور تسلیم کیا(جیسا کہ پچھلے صفحات میں بھی نظر سے گزر چکا ہے)کہ"بعض علمائے کرام کا خواجہ ناظم الدین کے ساتھ اُس وقت خفیہ رابطہ قائم ہو چکا تھا اور مجلس عمل کے کچھ ممبران پارٹی مفاد کے خلاف خواجہ ناظم الدین سے راز ونیاز رکھے ہوئے تھے۔"مگر اُنہوں نے حکومت سے راز ونیاز رکھنے والے اصل کرداروں کو قوم کے سامنے لانے کی بجائے"بعض"کے پردے میں چھپانے کی دانستہ کوشش کی جو کہ صریحاً تاریخی بدیانتی پر مبنی عمل ہے۔

یہی وہ حقیقت تھی جو مولوی احتشام الحق تھانوی کے طرز عمل سے اُس وقت مولانا عبدالحامد بدایونی پر منکشف ہو چکی تھی۔اور آپ پر اُن کے حکومت سے خفیہ رابطوں کی قلعی کھل چکی تھی۔آپ بھانپ گئے تھے کہ مولوی احتشام الحق تھانوی کے ذریعے پیش کردہ یہ حکومتی تجویز اُن کی رات کے اندھیرے میں کسی ایسی خفیہ ملاقات کا شاخسانہ ہے جو مجلس عمل کے ذمہ داران کی لاعلمی میں خواجہ ناظم الدین یا کسی اور حکومتی ذمہ دار سے کی گئی ہے۔

مولانا عبدالحامد بدایونی جانتے تھے کہ حکومت اب اپنے ایجنٹوں کے ذریعے تحریکی مقاصد کو سبوتاژ کرکے ناکام بنانا چاہتی ہے۔چنانچہ آپ نے اُس وقت نہ صرف اس تجویز سے عدم اتفاق کا اظہار کیا بلکہ اگلے روز(۲۲ فروری ۱۹۵۳ء کو)وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین سے مجلس عمل کے وفد کی ملاقات کا ایجنڈا طے کرتے ہوئے یہ شرط بھی عائد کی کہ اس ملاقات میں اُن علماء کو طلب نہیں کیا جائے گا جو گزشتہ کل یعنی ۲۱ فروری ۱۹۵۳ء کی ملاقات میں موجود رہے تھے۔

یہ واقعہ مولانا عبدالحامد بدایونی کی معاملہ فہمی،دور اندیشی،مومنانہ بصیرت اور خداداد

صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ جسے تسلیم کرتے ہوئے مولوی اللہ وسایا نے لکھا:

''مولانا بدایونی کراچی میں بریلوی حضرات کے صف اوّل کے رہنماء مانے جاتے تھے۔ وہ عوام میں کام کرنا جانتے تھے اور بہت ہی باہمت بزرگ تھے اور بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ تحریک ختم نبوت میں مولانا بدایونی پیش پیش تھے۔''[1]

ادھر لاہور میں مجلس عمل کے صدر مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب نے کراچی روانگی سے قبل تحریک کے رضاکاروں اور کارکنوں کو آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا کہ:

''تمام حلف نامے پُر کرنے والے رضا کار سر بکف تیار رہیں۔ قافلے میں ہر ضلع سے شریک ہونے والے رضاکاروں کی تعداد پانچ اور ہر قصبے سے دو ہو گی۔ عہدیداران اِن رضاکاروں کیلئے زادِ راہ کا انتظام کریں گے۔ ہنگامہ آرائی اور اشتعال انگیزی سے پرہیز کریں گے اور مقدس تحریک کو کامیاب بنانے کیلئے نظم و ضبط اور صبر و تحمل سے کام لیں گے۔ اور مزید ہدایات کا انتظار کریں گے۔''[2]

۲۲ فروری کو حکومت کو دیئے گئے نوٹس کی میعاد ختم ہو گئی۔ اِسی دن مجلس عمل کے صدر مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب کی سربراہی میں ایک وفد نے خواجہ صاحب سے ملاقات کی لیکن افسوس کہ اِس ملاقات کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور وفد ایک مرتبہ پھر ناکام واپس آگیا۔ چنانچہ صورتحال پر غور کرنے کیلئے مجلس عمل کے اراکین نے ۲۶، فروری ۱۹۵۳ء کو اپنا آخری اجلاس مجلس عمل کے صدر مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب کی زیرِ صدارت کراچی میں منعقد کیا۔

''اِس اجلاس میں مولانا عبدالحامد بدایونی، صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب، مولانا احتشام الحق تھانوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا محمد یوسف کلکتوی، مولانا سلطان احمد، سید نور الحسن شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین انصاری اور سید مظفر علی شمسی شامل تھے۔ اِس اجلاس

---

1. اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۲۶۰، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء۔
2. اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۲۷۶، ۲۷۷، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء۔

میں مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب نے شرکاء اجلاس کو بتایا کہ گزشتہ اجلاس منعقدہ ۱۸، جنوری کو ہم نے حکومت کو آخری نوٹس دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ جسے مجلس عمل کے وفد نے باضابطہ طور پر حکومت کو پہنچایا۔ اس نوٹس کی آخری تاریخ ۲۲، فروری کو ختم ہو چکی ہے اور آج اس نوٹس کی میعاد گزرے تین دن ہو چکے ہیں۔ آج ہمیں آخری فیصلہ کرنا ہے کہ راست اقدام کی تحریک کو پُر امن کس طرح رکھا جائے۔ اراکین کے باہمی صلاح و مشورے سے طے پایا کہ تحریک کو پُر امن رکھنے کیلئے پانچ رضا کار ایسے پلے کارڈ لے کر جن پر مطالبات درج ہوں۔ وزیر اعظم اور گورنر جنرل کی کوٹھی پر جا کر مظاہرہ کریں گے اور وزیر اعظم سے مطالبات ماننے کا مطالبہ کریں گے، اگر یہ رضا کار گرفتار کر لیے جائیں تو کونسل آف ایکشن روزانہ پانچ پانچ رضا کاروں کا دستہ اس وقت تک بھیجتی رہے گی، جب تک کہ حکومت ہماری بات مان نہیں لیتی۔ اجلاس کے اراکین نے باہمی مشورے سے حضرت مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب کو اس تحریک کا نگران اعلیٰ مقرر کیا اور اُن کو اس بات کا بھی اختیار دیا کہ اپنی گرفتاری پر وہ جس رفیق کو مناسب سمجھیں تحریک کا نگران اعلیٰ مقرر کر سکتے ہیں۔''[1]

اِسی اجلاس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ رات میں ہونے والے آرام باغ کے جلسے میں شرکت کرنے والی عوام سے دورانِ تحریک پُر امن رہنے اور اِس دوران اپنے کاروبار جاری رکھنے کی اپیل بھی کی جائے گی۔ ایک طرف مجلس عمل عوام کو پُر امن رکھنے کے منصوبے بنا رہی تھی تو دوسری طرف حکومت نے اسی رات کابینہ کے اجلاس میں مجلس عمل کی پُر امن تحریک کو تشدد اور طاقت کی بنیاد پر کچلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

۲۴، فروری تا ۲۶، فروری ۱۹۵۳ء کو آرام باغ کراچی میں آل پارٹیز مجلس عمل کے تین روزہ عظیم الشان جلسے مجلس عمل کے صدر مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری صاحب کی زیر صدارت منعقد ہوئے۔ جس میں تحریک سے وابستہ صاحبزادہ سید فیض الحسن آلو مہاروی، مولانا

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۱۳۹۔۱۳۸

عبدالحامد بدایونی، مولانا عبدالرحیم جوہر جہلمی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا احتشام الحق تھانوی، ماسٹر تاج الدین، مولانا لال حسین اختر نے شرکت کی۔ ان تمام جلسوں میں مقررین نے اپنے مطالبات پر روشنی ڈالی اور حکومت کے مایوس کن کردار اور رویئے کا ذکر کیا۔ ان جلسوں میں ہزاروں کی تعداد میں فدایان ختم نبوت نے شرکت کی۔ واضح رہے کہ ۲۶ فروری کا تیسرا اور فیصلہ کن تاریخی جلسہ وقت مقررہ پر اس وجہ سے شروع نہ ہوسکا کہ جلسے سے قبل مجلس عمل کا آخری اجلاس مولانا احتشام الحق تھانوی کے تذبذب اور جماعت اسلامی کے نمائندے مولانا سلطان احمد کے اعتراضات کی وجہ سے بہت طول کھینچ گیا۔ مولوی اللہ وسایا لکھتے ہیں اس اجلاس میں:

''مولانا احتشام الحق تھانوی تذبذب کا اظہار فرمارہے تھے وہ پروگرام کے ہر پہلو پر غور فرمانے کے اعتراضات کرتے تھے۔ اس طرح بحث ومباحثہ میں بہت وقت گزر گیا۔ جماعت اسلامی کے نمائندے سلطان احمد اپنے دلی جذبات کو کچھ دیر چھپاتے رہے مگر بالآخر وہ کھل کر سامنے آگئے اور فرمانے لگے اگر آپ اب بھی پروگرام ملتوی کردیں اور ۹ مارچ کو ہمیں پروگرام بنانے کا موقع دیں تو ہم ذمہ داری لیتے ہیں کہ ہم ۹ مارچ کو اسمبلی ہال میں ایسا ہنگامہ کردکھائیں گے کہ باید و شاید۔ کم از کم پچیس ہزار لوگ اس ہنگامے میں شمولیت کرسکتے ہیں اور یہ ہنگامہ تاریخی یادگار رہے گا۔ (جس پر) شرکاء نے ان کے خیالات پر تعجب کا اظہار کیا...... اور عرض کیا ہم ہرگز ہنگامہ نہیں چاہتے ہم تو تحریک کو پرامن طریقے پر چلانا چاہتے ہیں اور اب تاریخ کا مزید التوا بھی میرے یا آپ کے اختیار سے باہر ہے۔ جب پروگرام بننے لگا اور طے ہوا کہ پانچ پانچ رضا کار غیر آباد راستوں سے وزیراعظم اور گورنر جنرل کی کوٹھیوں پر جائیں تو جماعت اسلامی کے نمائندے مولانا سلطان احمد نے فرمایا یہ طریقہ درست نہیں میں مشورہ دوں گا کہ رضا کار بارونق سڑکوں پر سے جانا چاہئیں اور ان کا جلوس شہر کے آباد حصوں سے گزرنا چاہیے۔ ہم نے عرض کیا کہ اس طرح ہنگامہ اور بدامنی کا اندیشہ ہے عوام کو کس طرح سنبھالا جائے گا اور اگر پولیس نے خود ہی اپنے آدمیوں کو

جلوس میں داخل کر کے فساد کرا دیا تو تحریک کو دھچکا لگے گا۔ مولانا سلطان احمد صاحب تنہا شخص تھے جو اُس وقت بھی ہنگامہ پسندی کا اظہار فرماتے تھے مگر وہ کسی کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکے اور بالآخر انہیں مجلس عمل کے مجوزہ پروگرام کی تائید کرنا پڑی......(انہوں نے) آخری اجلاس پر مہر تصدیق ثبت کر کے گھر کی راہ لی اور اپنے جانشین ساتھیوں میں آرام سے جا بیٹھے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انہیں گرفتار کرنے کوئی نہیں آیا حالانکہ پولیس اُن کا گھر جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ یہ مجلس عمل کے رکن ہیں جب کہ تحریک کے دیگر راہنمارات ہی کو دھر لیے گئے تھے۔"[1]

تحریک ختم نبوت کے مرکزی رہنماؤں کی گرفتاری

دوسری طرف خواجہ صاحب کی حکومت نے طے کیا کہ مجلس عمل کے رہنماؤں کو جیل میں بند کر دیا جائے تا کہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔ خود خواجہ ناظم الدین نے یہ تاثر دینے کی بھی کوشش کی کہ "با اثر علماء اُن کے ساتھ ہیں۔"[2] حکومت نے یہ کوشش بھی کی کہ کچھ علماء کو ڈرا دھمکا کر اپنی ہمنوائی پر راضی کیا جائے۔ جس میں اُسے اس حد تک کامیابی ضرور ملی کہ مولانا اختر علی خان جیسے لوگ اپنی گرفتاری کے ڈر سے حکومت کو معافی نامہ لکھ کر دینے پر آمادہ ہو گئے۔ اس حوالے سے جسٹس منیر اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں:

"اِس ذلت انگیز معافی نامہ کی بناء پر مولانا اختر علی خان گرفتار نہ کیے گئے، نہ اُن کے اخبار "زمیندار" کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی۔"[3]

جبکہ مولوی اللہ وسایا کہتے لکھتے ہیں کہ:

"اُن کے متعلق کیا کہا جائے۔ بس عجیب طبیعت کے راہنماء تھے۔ اگر چہ مولانا ظفر علی

---

1. اللہ وسایا، مولوی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۲۸۱، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء
2. ایضاً ص: ۲۸۰
3. رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۱۵۳

خان جیسے بہادر اور مجاہد لیڈر کے بیٹے تھے لیکن بڑی ہی جذباتی اور غیر مستقل قسم کی طبیعت پائی تھی۔"[1]

دوسری طرف ۲۶ ،اور ۲۷ فروری کی رات کو کراچی میں حکومت نے مجلس عمل کے صدر مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری سمیت نو (۹) رہنماؤں کو جن میں صاحبزادہ سید فیض الحسن آلو مہاروی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا عبدالرحیم جوہر جہلمی، عطاء اللہ شاہ بخاری، لال حسین اختر، وغیرہ شامل تھے، گرفتار کرلیا اور تحریک کو مرکزی قائدین سے محروم کردیا۔ جو لوگ گرفتاری سے بچ گئے اُن میں جماعت اسلامی کے علاوہ وہ لوگ بھی شامل تھے جنھیں خواجہ ناظم الدین نے گرفتار نہ ہونے دیا۔ اِس موقع پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی اللہ وسایا کہتے ہیں:

"باہر رہنماؤں میں سے کون تھا، جماعت اسلامی جس نے "شرعی دھنیا" پی رکھا تھا۔ یا وہ چند بزرگ جنھیں خواجہ ناظم الدین نے گرفتار نہ ہونے دیا۔"[2]

حکومت نے مرکزی قائدین کے علاوہ کراچی میں مولانا مہرالٰہی، میاں محمد سجادہ نشین داتا گنج بخش اور مولانا عبدالرحمن کو بھی گرفتار کرلیا۔ ان گرفتاریوں کے خلاف کراچی میں ہڑتال کی گئی اور پہلے ہی دن چار ہزار فدایان ختم نبوت نے خود کو گرفتاریوں کیلئے پیش کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں کارکنان گرفتار ہوئے اور بے شمار نوجوانوں کو انتظامیہ نے شہر سے باہر دُور دراز جنگل اور بیابان علاقوں میں لے جا کر چھوڑ دیا۔ یہ صورتحال دس پندرہ دن تک جاری رہی اس کے بعد انتظامیہ نے کراچی کے حالات پر قابو پالیا۔

یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ گرفتاری کے بعد مجلس عمل کے صدر اور نگران اعلیٰ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری نے جیل میں نہایت صبر استقامت کا مظاہرہ کیا۔ مولانا تاج محمود قائد تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کے کردار کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

---

[1] اللہ وسایا، مولوی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۳۴۴، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

[2] اللہ وسایا، مولوی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۲۹۱، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

"بعض بلند پایہ شخصیتیں ایسی ہیں جو خود کو شہرت سے دور رکھتی ہیں، دنیا اُن کی خوبیوں سے کماحقہ واقفیت نہیں رکھتی۔ زیادہ تر قریب رہنے والے لوگ اِن بزرگوں کی عظمت کو جانتے ہیں، مگر عوام بے خبر ہوتے ہیں، آپ کو انہی بلند پایہ حضرات میں حضرت مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری خطیب جامع مسجد وزیر خان کا نام نامی سرفہرست نظر آئے گا۔"[1]

مولانا سید خلیل احمد قادری تحریک کے کنوینر نامزد

مجلس عمل کے مرکزی رہنماؤں کی گرفتاری کی خبر نے سارے ملک میں حکومت کے خلاف تحریک کا آغاز کر دیا۔ پنجاب میں بھی ہڑتالیں شروع ہوگئیں۔ لاہور، راولپنڈی، سیالکوٹ، ملتان سرگودھا، گوجرانوالہ، گجرات، جہلم، فیصل آباد سے قائدین جن میں مولانا غلام محمد ترنم، حافظ خادم حسین، مولانا غلام دین محمد سمیت ہزاروں کارکنوں کو بھی حکومت نے گرفتار کر لیا۔ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں رضا کاروں کے دستے کراچی کیلئے روانہ ہوتے، جنہیں حکومت راستے ہی میں گرفتار کر لیتی ہے۔

چنانچہ اِس صورتحال کے پیشِ نظر مرکزی اراکین کی موجودگی میں باہمی مشورے سے مولانا عبد الستار خان نیازی، مولانا سید خلیل احمد قادری، مولانا بہاء الحق قاسمی، مولانا احمد علی لاہوری اور مولانا محمد طفیل پر مشتمل ایک انتظامی کمیٹی بنائی گئی۔ جسے حالات کے مطابق مناسب اقدامات کرنے کا اختیار بھی دیا گیا۔ اِس کمیٹی کا کنوینر مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کے صاحبزادے مولانا سید خلیل احمد قادری کو نامزد کیا گیا۔ مولانا سید خلیل احمد قادری اُس وقت طبیہ کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ اراکین کے فیصلے کے مطابق آپ نے تحریک کی قیادت سنبھال لی اور مسجد وزیر خان کو تحریک کا مرکز بنالیا۔ جس میں ہر وقت ہزاروں کی تعداد میں رضا کار موجود ہوتے تھے۔ یہ رضا کار پہلے روزانہ پچاس پچاس کی ٹولیوں میں اور بعد میں سو سو کی ٹکڑیوں

---
1. اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۱۲۱،۱۲۰، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

میں گرفتاریاں پیش کرتے رہے۔ اسی دوران مولانا عبدالغفور ہزاروی بھی لاہور پہنچ کر دیگر علماء کرام کے ساتھ تحریک ختم نبوت میں شامل ہو گئے۔

قائد تحریک ختم نبوت مولانا ابوالحسنات کا صبر و استقامت

تحریک ختم نبوت کے مرکزی قائد مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کی گرفتاری کے بعد تحریک کی قیادت مولانا عبدالستار خان نیازی اور آپ کے اکلوتے بیٹے مولانا سید خلیل احمد قادری نے سنبھالی تھی۔

> ''جنھیں ۹۔ مارچ ۱۹۵۳ء کو گرفتار کر کے شاہی قلعہ لاہور لے جایا گیا اور آپ کے خلاف ۲۹ مختلف دفعات کے تحت مقدمات قائم کیے گئے۔ جن میں قتل و غارت اور فوج میں بدامنی پیدا کرنے کے علاوہ مولانا عبدالستار خان نیازی کے ساتھ ڈی ایس پی فردوس شاہ کے قتل کا الزام بھی عائد کیا گیا۔ مگر ۱۹ روزہ عدالتی کارروائی کے بعد فوجی عدالت نے مولانا سید خلیل احمد قادری کو ڈی ایس پی فردوس شاہ کے مقدمہ قتل سے بری کر دیا۔ لیکن رہائی کے فوراً بعد دوبارہ آپ کو گرفتار کر کے سینٹرل جیل پہنچا دیا گیا۔ جہاں ایک ماہ کی عدالتی کارروائی کے بعد فوجی عدالت نے سات سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ ابھی اس سزا کو سنائے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ فوجی عدالت نے مقدمہ بغاوت کی سماعت شروع کر دی اور سرسری سماعت کے بعد مولانا سید خلیل احمد قادری کو سزائے موت کا حکم دے دیا۔ جسے تین روز بعد فوجی عدالت نے چودہ (۱۴) سال قید سے تبدیل کر دیا۔''[1]

اسی دوران جیل میں مولانا ابوالحسنات کو یہ اطلاع ملی کہ مولانا سید خلیل احمد قادری کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور فوجی عدالت نے انہیں پھانسی کی سزا دے دی ہے۔ مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے مرکزی رہنما سید مظفر علی شمسی لکھتے ہیں:

---

[1] انٹرویو سید خلیل احمد قادری، ماہنامہ فیضان فیصل آباد، شمارہ اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۸ء

''آپ کو ایک روز اچانک یہ اطلاع ملی کہ مولانا سید خلیل احمد قادری خطیب مسجد وزیر خان لاہور کو مارشل لاء حکومت نے پھانسی کی سزا دے دی ہے۔ اپنے اکلوتے فرزند کے بارے میں یہ رُوح فرسا خبر سن کر سجدے میں گر گئے اور عرض کی الٰہی........! میرے بچے کی قربانی منظور فرما۔''[1]

مولانا سید خلیل احمد قادری کی پھانسی اور شہادت کی خبر پر مولوی اللہ وسایا اپنی کتاب'' تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء'' میں مولانا تاج محمود اور ماسٹر تاج الدین انصاری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''ہم سب کو حیرت ہوئی کہ مولانا کی پیشانی پر بل تک نہیں آیا۔ مولانا نے کبھی ذکر تک نہیں کیا۔ گھر سے بھی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ کچھ معلوم نہیں کہ خلیل پر کیا گزری۔ خلیل زندہ بھی ہے یا نہیں، مگر مولانا ابوالحسنات نہ گھبراتے ہیں نہ الگ بیٹھ کر آنسو بہاتے ہیں اور نہ اُن کی زبان پر خلیل صاحب کا تذکرہ آتا ہے۔ ہم سب اِس صورتحال کو دیکھ کر حیران تھے۔ حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری نے بارہا فرمایا کہ اگر میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آتا تو خدا جانے میرا کیا حال ہوتا، مگر بھئی مولانا ابوالحسنات صاحب تو بڑی کوہ وقار شخصیت ثابت ہوئے، مولانا ہم میں بیٹھ کر خوش گپیاں اُڑاتے یا الگ بیٹھ کر تسبیح و وظائف میں مصروف رہتے۔ اللہ جسے حوصلہ دے اور صبر عطا کرے جیل خانہ فخر و غرور کا مقام نہیں یہاں بڑے بڑوں کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں۔ مولانا اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جس کے نام پر آج تک روٹیاں توڑتے رہے، اُس کے نام کی لاج رکھنے کا وقت آیا تو گھبرانا کیا۔ نمک حرام تو نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے حضرت مولانا کو صبر و استقامت کا پہاڑ اور شرافت و خلق کا بہترین نمونہ پایا......حضرت مولانا ابوالحسنات فرماتے ہیں، بھئی بات تو ٹھیک ہے، خلیل میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ مجھے اُس سے بے پناہ محبت ہے، اس لیے کہ میں ہی اُس کا باپ ہوں اور میں ہی اُس کی ماں بھی۔ یوں بھی

---

[1] روزنامہ مشرق، لاہور، ۵ نومبر ۱۹۶۷ء، ص: ۳

اولاد سے کسے محبت نہیں ہوتی۔ مگر اس مقام پر صبر کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے۔ پھر اس نیک کام میں خلیل قربان بھی ہوتا ہے۔ تو سعادت دارین ہے۔ وہ بھی تو ماؤں کے لخت جگر تھے جو سرکار مدینہ ﷺ کی آبرو پر شہید ہوئے اُن میں خلیل بھی ہے، تو میرے لیے فخر کی بات ہے۔ اللہ ہماری حقیر قربانی کو قبول فرمائے۔

سر عشق از عالم ارحام نیست

او ز سام و حام روم و شام نیست

مولانا کا صبر اور بے نظیر حوصلہ دیکھ کر ہمارے حوصلے بھی دُگنے ہو گئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُس روز کے بعد ہم سب آپ کی اور بھی زیادہ عزت کرنے لگے۔ مولانا نے نہایت صبر و استقامت سے جیل کاٹی۔ آپ کے دل میں دوہرا جذبہ موجزن تھا۔ آپ عالم دین بھی تھے اور سید زادے بھی، آپ آخر دم تک صحیح مقام پر ڈٹے رہے اور آپ کے پاؤں میں لغزش نہیں آئی۔ اللہ جسے توفیق دے۔"[1]

سید عطاء اللہ شاہ بخاری آپ کی جراتِ اظہار اور مشکلات و مصائب پر صبر و استقلال سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جیل میں آپ کی خدمت بجالانے میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ مولوی مجاہد الحسینی اپنی کتاب "تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء ناقابل فراموش مشاہدات" (مطبوعہ ختم نبوت پبلی کیشنز لاہور، جنوری ۲۰۱۳ء) کے صفحہ ۲۷، پر لکھتے ہیں کہ ایک سال کے عرصۂ جیل میں مولانا ابوالحسنات کو بیت الخلاء جاتے وقت کبھی لوٹا اُٹھانے کا موقع نہ دیا بلکہ پانی بھر دروازے تک خود چھوڑ کر آتے اور اس خدمت کی بجا آوری میں کسی اور کی شرکت ہرگز گوارا نہ کرتے۔ اور آپ کے بارے میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کہتے:

> "ہم لوگ تو مختلف تحریکوں میں حصہ لے کر مصائب برداشت کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ قید و بند کی صعوبتیں ہمارے لیے نئی اور انوکھی بات نہیں...... لیکن مولانا ابوالحسنات جس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں وہ اس وادی کے لوگ نہیں ہیں۔ انہوں

---

[1] اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۲۹۵۔ ۲۹۳، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

نے جس صبر اور استقامت کا مظاہرہ کیا اور پاداشِ حق میں زینت زنداں بنے ہیں ۔ لائق صد تحسین و آفریں ہے ...... دونوں باپ بیٹا یہاں جیل خانے کی سلاخوں میں جکڑے ہوئے ہیں، اُن کے سینے میں ناموس رسالت اور عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کا جذبۂ صادق موجود ہے ۔ ہم اس کا نہ تو حق ادا کر سکتے ہیں اور نہ ہی زبان و الفاظ سے اُس کے صحیح عکاس ہو سکتے ہیں ۔ قلبی کیفیات گفتنی نہیں ہوا کرتیں ۔ میرے دل میں مولانا کی بڑی قدر و منزلت ہے ۔"

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب اس واقعہ پر مولانا سید ابوالحسنات محمد احمد قادری کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

"مولانا ابوالحسنات کو جیل میں یہ خبر دی گئی کہ اُن کے اکلوتے جواں سال صاحبزادے خلیل احمد کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا ہے ۔ جیل میں بوڑھے باپ پر کیا گزری ہوگی، یہ کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی ہم لکھ سکتے ہیں ۔ اس کیفیت کو وہ محسوس کر سکتے ہیں جو ان حالات میں کسی اُصول کی خاطر نبرد آزما ہوتے ہیں ۔ علامہ مرحوم نے سیدنا یعقوب علیہ السلام کی سنت میں صبر جمیل کا مظاہرہ کر کے اپنے کردار کو ہمارے لیے مشعل راہ بنا دیا ۔"[1]

جبکہ خود مولانا سید خلیل احمد قادری بیان کرتے ہیں کہ:

"ایک روز میں نے سکھر جیل کے پتے پر والد محترم کو اپنی خیریت کا خط لکھا، جس کا جواب پندرہ روز کے بعد موصول ہو گیا ۔ والد صاحب نے اپنے خط میں لکھا کہ مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ تم رتبۂ شہادت حاصل نہیں کر سکے لیکن بہر حال یہ جان کر اطمینان ہوا کہ تم ناموس مصطفیٰ ﷺ کی خاطر لڑ رہے ہو ۔ خط کے آخر میں لکھا" کاش اللہ

---

[1] اقبال احمد فاروقی، تذکرہ علماء اہلسنت و جماعت لاہور، ص: ۳۳۵، فرید بک اسٹال لاہور، اشاعت دوم اگست ۲۰۰۰ء

تعالیٰ میرے بیٹے کی قربانی قبول فرمالیتا۔"[1]

ڈی ایس پی کا قتل اور قرآن مجید کی المناک شہادت

۴،مارچ ۱۹۵۳ء کو رضا کاروں کے پُر امن جلوس پر پولیس نے سٹی مجسٹریٹ سید حسنات احمد، ڈی ایس پی سید فردوس شاہ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس ملک خان بہادر کی سرکردگی میں پُر امن جلوس پر سخت لاٹھی چارج کیا اور انہیں زدوکوب کر کے گرفتار کیا۔ پولیس کے تشدد سے ایک بچہ ہلاک ہوگیا جس کی لاش پولیس نے غائب کرادی۔ اِس تمام کارروائی کے دوران ایک بوڑھے رضا کار کے گلے میں حمائل شریف میں پڑا قرآن مجید نکل کر زمین پر گرگیا اور شہید ہوگیا۔ بعض عینی گواہوں کے مطابق ڈی ایس پی فردوس شاہ کی ٹھوکر سے قرآن مجید پارہ پارہ ہو کر گندی نالی میں گرگیا تھا۔ قرآن مجید کی بے حرمتی اور معصوم بچے کے قتل کی خبر آناً فاناً پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور اس واقعے کے خلاف عوام میں شدید غم وغصہ پایا جاتا تھا۔ لوگ بے قابو تھے اور مسجد وزیر خان کے باہر لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم موجود تھا۔

اِسی دوران ڈی ایس پی فردوس شاہ وہاں آگیا۔ لوگوں نے اُس کو پہچان لیا۔ پھر کیا تھا سارے کا سارا ہجوم فردوس شاہ پر پل پڑا اور فردوس شاہ مارا گیا۔ فردوس شاہ کے قتل کے بعد حکومت نے تحریک کو تشدد کے ساتھ کچلنے کا فیصلہ کیا اور جگہ جگہ پُر امن مظاہرین پر فائرنگ کی۔ جس کے نتیجے میں ہزاروں مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

حکومت کی جانب سے ۴، اور ۵، مارچ کو فدایانِ ختمِ نبوت پر ہونے والے ظلم وتشدد کے ردِعمل میں سرکاری ملازمین نے ہڑتال کردی۔ تمام حکومتی دفاتر سمیت ریلوے ورکشاپس، کارخانے اور تعلیمی ادارے بند ہوگئے اور حکومتی دفاتر اور سرکاری اداروں کے ملازمین بھی فدایانِ ختمِ نبوت کے ساتھ احتجاجی مظاہروں میں شامل ہوگئے۔ اُن سب کا مطالبہ تھا کہ بے گناہ مسلمانوں کے قاتل سرکاری افسروں کو گرفتار کر کے اُن کے خلاف کارروائی کی

---

[1] انٹرویو سید خلیل احمد قادری، ماہنامہ فیضان فیصل آباد، شمارہ اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۸ء

جائے اور تحریک کے مطالبات کو تسلیم کیا جائے۔ اس ہڑتال میں بجلی کے محکمے کے ملازمین بھی شامل ہو گئے اور انہوں نے گورنمنٹ ہاؤس کی بجلی منقطع کر دی۔ فون ناکارہ بنا دیئے گئے۔

صورت حال اِس قدر بے قابو ہوگئی کہ پولیس کے سربراہ نے ہتھیار ڈال دیئے اور مظاہرین پر مزید ظلم وتشدد کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ہڑتال میں حکومتی اداروں کے ملازمین کی شمولیت نے ممتاز دولتانہ کو مجبور کر دیا کہ وہ فوری طور پر اپنے اقدامات واپس لے لیں۔ چنانچہ انہوں نے مظاہرین پر فائرنگ بند کر دینے اور حکومت پنجاب کی جانب سے مطالبات کی تائید کرنے کا بیان جاری کر دیا جس سے عوام کے اشتعال میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی۔

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے دوران ایک محتاط اندازے کے مطابق کئی سو مسلمان شہید، ہزاروں گرفتار اور لاتعداد اِس تحریک سے متاثر ہوئے۔ لاہور شہر میں کرفیو نافذ ہونے کے باوجود ہڑتال، مظاہرے اور رضا کاروں کی گرفتاریاں جاری تھیں۔ حالات دن بدن قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔ بگڑتے ہوئے حالات کو دیکھ کر حکومت نے لاہور میں ۶، مارچ ۱۹۵۳ء کو صبح ساڑھے دس بجے ملک میں پہلا مارشل لاء نافذ کر دیا۔ یہ مارشل لاء جزوی تھا جو صرف لاہور تک محدود تھا اور اِس کے نفاذ کا مقصد تحریک ختم نبوت کو کچلنا تھا۔ لیکن قابل توجہ امر یہ ہے کہ یہ مارشل لاء لگانے کا حکم کابینہ کے مشورے اور وزیر اعظم کی اجازت کے بغیر اس وقت کے سیکرٹری دفاع میجر جنرل سکندر مرزا نے دیا تھا۔

یہ مارشل لاء مئی ۱۹۵۳ء تک نافذ رہا۔ لاہور شہر کو فوج کے حوالے کر دیا گیا اور لاہور کے ایریا کمانڈر اور چیف مارشل لاء منتظم جنرل اعظم خان جس کے منہ کو خون لگ چکا تھا نے ۶، مارچ کو مارشل لاء لگا دیا اور اُس کے ضابطوں کی خلاف ورزی پر سزاؤں کیلئے فوجی عدالتیں قائم کر دیں۔ مارشل لاء کے نفاذ اور شہر میں فوج کی موجودگی کے باوجود مولانا سید خلیل احمد قادری، مجاہد ملت مولانا عبد الستار خان نیازی، اور مولانا بہاء الحق قاسمی کی جرأت اور ولولہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تحریک کے مرکز مسجد وزیر خان میں ہزاروں مسلمان موجود ہوتے اور وہاں صبح و شام ولولہ انگیز تقریریں ہوتیں اور گرفتاری کیلئے قافلے روانہ کئے جاتے۔

۷ اور ۸ ؍مارچ کو مولانا عبدالستار خان نیازی نے مارشل لاء، دفعہ ۱۴۴ اور کرفیو کے باوجود گرفتاریاں دینے کیلئے چار، چار افراد کی ٹولیاں روانہ کیں۔ ۸ ،مارچ کو فوج نے مسجد کو گھیرے میں لے لیا۔ اُس وقت مسجد میں مولانا سید خلیل احمد قادری اور مولانا بہاء الحق قاسمی موجود تھے۔ جنہیں فوج نے مسجد میں موجود رضا کاروں کے ساتھ گرفتار کرلیا۔ دوران قید پیش آنے والے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سید خلیل احمد قادری کہتے ہیں کہ:

''اندھیری کوٹھڑی میں میرے سامنے سانپ چھوڑا گیا۔ نماز پڑھنے سے روکا گیا۔ سارا سارا دن ہاتھ اوپر کر کے کھڑا رکھا گیا۔ دوران تفتیش گالیوں سے نوازا گیا، مجھے سونے نہ دیا گیا، ہر ممکن اذیتیں دی گئیں، میرے پیٹ اور سینے میں شدید درد اُٹھا اور میں کراہنے لگا لیکن ان لوگوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا......(ایک دن) مغرب کی نماز کے بعد میں بیٹھا ہوا تھا کہ معاً دل میں خیال آیا کہ یہاں خشک روٹی اور چنے کی دال کے سوا کچھ نہیں مل رہا اگر اپنے گھر میں ہوتے تو حسب منشا کھانا کھاتے، لیکن دوسرے ہی لمحہ ضمیر نے ملامت کی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی قربانیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آگیا، میں نے سربسجود ہو کر توبہ کی اور اس وسوسے کا ازالہ چاہا لیکن خدا کی قدرت دیکھئے کہ چند لمحے بعد اندھیرے میں ایک ہاتھ آگے بڑھا اور آواز آئی۔ ''شاہ جی! یہ لے لو'' اور پھر ایک لفافہ مجھے دیا گیا جس میں کچھ پھل اور مٹھائی تھی، میں حیران رہ گیا کہ اتنے سخت پہرے کے باوجود یہ سب کچھ مجھ تک کیسے پہنچ گیا۔ لیکن میرے دل کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ غیبی دعوت جناب قاسم عالم ﷺ کے صدقے میں ملی ہے۔ وہ پھل اور مٹھائی تین روز تک میں استعمال کرتا رہا۔''[1]

تحریک کے آخری قائد مولانا نیازی بھی گرفتار

مولانا سید خلیل احمد قادری اور مولانا بہاء الحق قاسمی کے گرفتار ہونے کے بعد مولانا

---

[1] انٹرویو سید خلیل احمد قادری، ماہنامہ فیضان فیصل آباد، شمارہ اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۸ء

عبدالستار خان نیازی نے تحریک کی قیادت سنبھال لی جو اُس وقت صوبائی اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ آپ نے تحریک کو از سرِ نو منظم کرنے کا فیصلہ کیا اور اعلان کیا کہ:

''آج تک یہ مذہبی تحریک تھی، اب یہ سیاسی تحریک بھی ہے۔'' آپ نے واضح کیا کہ'' مسلمان کا دین اُس کی دنیا سے جدا نہیں، مسلمان کی سیاست اُس کی عبادت سے منقطع نہیں۔''[1]

آپ نے مسجد وزیر خان کو تحریکی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور وہاں سے پُر امن طریقے سے تحریک کو آگے بڑھانے کا کام جاری رکھا۔ مولانا نیازی کی پوری کوشش تھی کہ تحریک ختم نہ ہونے پائے۔ لوگ پنجاب اور سرحد سے قافلہ در قافلہ مسجد وزیر خان آرہے تھے۔ محمد صادق قصوری لکھتے ہیں:

''مولانا نیازی نے لاہور میں اجتماعات کیلئے دو مرکز بنا رکھے تھے۔ ایک دہلی دروازہ، جہاں دن کو جلسہ ہوتا اور دوسرے مسجد وزیر خان، جہاں نماز ظہر کے بعد جلسہ ہوتا تھا۔''[2]

۶۔مارچ ۱۹۵۳ء کو پنجاب کے گورنر آئی آئی چندریگر نے خلیفہ شجاع الدین، بیگم سلمیٰ تصدق حسین اور چند دوسرے لوگوں کے ذریعے مولانا نیازی کو پیغام بھیجا کہ صوبائی حکومت آپ سے صلح کرنا چاہتی ہے اور مطالبات سے اتفاق کرتی ہے اور یہ کہ صوبائی حکومت نے ایک وزیر اور ایک اعلیٰ افسر کو مرکزی حکومت سے بات چیت کیلئے کراچی بھیج دیا ہے۔ چنانچہ آپ بھی اب بات چیت کیلئے آمادہ ہو جائیں۔ جس پر مولانا عبدالستار خان نیازی نے وفد پر واضح کر دیا کہ ہماری صلح اور بات چیت صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ:

''ہمارے گرفتار شدہ آدمیوں کو رہا کر دیا جائے۔ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا

---

[1] ۲۵۹/۱، ئی تحریک تحفظ ختم نبوت اور مولانا عبدالستار خاں نیازی ص: ۱۰۔۹، جاری کردہ، مرکزی شعبہ نشر و اشاعت جمعیت علماء پاکستان، لکی چیمبر برنس روڈ کراچی

[2] محمد صادق قصوری، مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی حیات خدمات تعلیمات ص: ۱۳۴، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، مئی ۲۰۰۲ء

مطالبہ تسلیم کرو۔ مرکزی حکومت کو قائل کرنے کیلئے ایک آدمی ہمارا اور ایک پنجاب گورنمنٹ کا مرکزی حکومت کے ساتھ اس سلسلے مذاکرات کرے۔ اِس پر انہوں نے بتایا کہ سینٹرل گورنمنٹ خود اپنا ایک وفد بنا کر بھیج رہی ہے تاکہ اس مسئلے پر مذاکرات کیے جائیں۔ آپ تحریک ختم کر دیں ہم آدمی رہا کر دیں گے اور پنجاب حکومت آپ کے مطالبات تسلیم کرلے گی۔"[1]

قبل اِس کے کہ مولانا نیازی کی پیش کردہ تجاویز پر کوئی مثبت پیش رفت ہوتی، لاہور میں مارشل لاء لگا کر فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ اِس مارشل لاء کے نفاذ میں سب سے زیادہ ہاتھ وزیر داخلہ سکندر مرزا کا تھا۔ مگر لاہور میں مارشل لاء اور دفعہ ۱۴۴، کے نفاذ کے باوجود مولانا نیازی نے تحریک جاری رکھی اور کارکنان کے حوصلے بلند رکھے۔ ۷، اور ۸، مارچ کو آپ نے چار چار افراد کی ٹولیاں گرفتاری دینے کیلئے روانہ کیں۔ ۹، مارچ کو پنجاب اسمبلی کا سیشن شروع ہو رہا تھا۔

مولانا عبدالستار خان نیازی چاہتے تھے کہ کسی طریقے سے ۹، مارچ کو شروع ہونے والے اسمبلی سیشن میں "ختم نبوت ریزولیشن" پیش کر کے ارکان اسمبلی کو قائل کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن بدقسمتی سے ۹، مارچ کو شروع ہونے والا پنجاب اسمبلی کا اجلاس پہلے ۱۶، مارچ پھر ۲۲، مارچ تک کیلئے ملتوی کر دیا گیا۔

مولانا نیازی کیلئے پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنا اتنا آسان کام نہ تھا۔ حکومت مولانا نیازی کے خلاف ڈی ایس پی فردوس شاہ کے قتل اور حکومت کے خلاف بغاوت کا مقدمہ درج کر چکی تھی اور وہ انہیں گرفتار کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اُسے نیازی صاحب کی تلاش تھی۔ فوج نے سارے شہر کی ناکہ بندی کی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ چوکیاں قائم تھیں۔ مگر اِن تمام اقدامات کے باوجود وہ انہیں گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ مولانا عبدالستار خان نیازی لاہور سے اوکاڑہ، اوکاڑہ سے پاک پتن، پھر پاک پتن سے لاہور واپسی کے خیال سے قصور میں اپنے دوست شیخ فضل دین کے یہاں پہنچے اور دن میں وہاں قیام کیا۔ تحریک کا ایک

---

[1] اشرف جاوید، میں مولانا عبدالستار خاں نیازی ہوں: ۳۲، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور، جنوری ۱۹۹۱ء

سرگرم کارکن بشیر مجاہد بھی نیازی صاحب کے پیچھے قصور پہنچ گیا۔

مولانا نیازی کا ارادہ تھا کہ ۲۲، مارچ کی صبح بذریعہ بس اسمبلی ہال پہنچیں اور اجلاس میں شرکت کر کے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنائیں۔ مگر صد افسوس کہ:

''شیخ فضل دین کے لڑکے محمد اسلم نے مخبری کر دی کہ مولانا نیازی ہمارے ہاں موجود ہیں۔ چنانچہ پولیس پہنچ گئی اور ہمیں گرفتار کر لیا۔ اس پر شیخ فضل دین کے لڑکے نے پولیس سے کہا کہ اس کے ساتھ ایک دوسرا آدمی بھی موجود ہے۔ چنانچہ بشیر مجاہد کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔''[1]

مولانا عبدالستار خاں نیازی کیلئے سزائے موت

مولانا عبدالستار خاں نیازی کی گرفتاری سے ۱۹۵۳ء کی تحریک نے دم توڑ دیا اور رفتہ رفتہ حکومت نے حالات پر قابو پالیا۔ ۱۶، اپریل ۱۹۵۳ء کو مولانا عبدالستار خاں نیازی کے خلاف فوجی عدالت میں ڈی ایس پی فردوس شاہ کے قتل اور حکومت کے خلاف بغاوت کے مقدمے کا آغاز ہوا۔ جس کی کارروائی ۲۵، اپریل ۱۹۵۳ء کو صرف دس دن میں مکمل کی گئی اس مقدمے میں مولانا پر دو الزامات عائد کئے گئے ایک یہ کہ آپ نے مجمع کو پولیس کے خلاف یہ کہہ کر اکسایا کہ ''پولیس کے کتے آگئے ہیں، اب جانے نہ پائیں''[2] جس کی وجہ سے مجمع نے مشتعل ہو کر ڈی ایس پی فردوس شاہ کو قتل کر دیا۔

دوسرا الزام ''مملکت سے بغاوت'' قتل سے بھی زیادہ سنگین اور خطرناک تھا۔ استغاثہ کا الزام تھا کہ آپ کی باغیانہ اور اشتعال انگیز تقاریر کی وجہ سے عوام مشتعل ہوئے اور انہوں نے تشدد اور تخریب کاری کے ذریعے ملکی سالمیت کو نقصان پہنچایا۔ اس لیے حکومت آپ کو مملکت کا باغی قرار دے کر آپ کے خلاف مقدمہ بغاوت قائم کرتی ہے۔ اس خود ساختہ مقدمے میں آپ کے

---

[1] ایضاً گزشتہ ص: ۳۴۔ و۔ مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی حیات خدمات تعلیمات، ص: ۱۳۲، صادق قصوری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، مئی ۲۰۰۲ء۔

[2] اشرف تحریر، میں مولانا عبدالستار خاں نیازی ص: ۳۵۰، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور، جنوری ۱۹۹۱ء۔

خلاف ایک بھی الزام ثابت نہ ہونے کے باوجود فوجی عدالت نے جانب داری کا مظاہرہ کیا۔ اور ۷، مئی ۱۹۵۳ء کو ڈی ایس پی فردوس شاہ کے قتل کے الزام سے باعزت بری کرتے ہوئے آپ کو بغاوت کے الزام میں پھانسی کی سزا سناتے ہوئے حکم دیا کہ:

You will be hanged by neck till you are dead

''تمہاری گردن پھانسی کے پھندے میں اُس وقت تک لٹکائی جائے جب تک تمہاری موت نہ واقع ہو جائے۔''

سزا سن کر آپ نے سزا سنانے والے اہلکار سے کہا۔

In that? I was prepared to take more that, if i would have got one hundred thousand lives, I would have laid down those for the cause of holy Prophet Muhammad May peace & glory of God be upon him.

''یہی کچھ سزا لائے ہو۔ اے کاش! میری لاکھ جانیں ہوتیں تو میں اُن سب کو محمد مصطفی ﷺ کی ذات پر قربان کر دیتا۔''

آرڈر سنانے والے افسر نے جب مولانا نیازی سے آرڈر پر دستخط کرنے کیلئے کہا تو آپ نے جواب دیا: میں جب پھانسی کے پھندے کو بوسہ دوں گا اُس وقت سائن کروں گا۔ آفیسر نے انگریزی میں دوبارہ کہا: تمہیں اِس پر دستخط کرنے ہوں گے۔ مولانا نیازی نے انگریزی میں ہی اُسے جواب دیتے ہوئے کہا:

I have already told you that I will sign it when i kiss the Rope. I am clutched and am behind the bars take me to the gallows and hanged me.

میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ جس وقت پھانسی کے پھندے کو بوسہ دوں گا اُس وقت دستخط کروں گا۔ میں جیل میں ہوں اور آپ کے چنگل میں ہوں مجھے لے جاؤ اور پھانسی دے دو۔ آفیسر نے آپ سے اپنی ڈیوٹی کی مجبوری بیان کرتے ہوئے درخواست کی:

Mr.Niazai! Our Officers will enquire from us whether

you were serve with the notice of death warrant.

مسٹر نیازی! ہمارے آفیسر ہم سے پوچھیں گے کہ تم نے موت کے وارنٹ کا نوٹس دے دیا ہے یا نہیں، تو میں کیا جواب دوں گا۔ جس پر نیازی صاحب نے اُسے جواب دیتے ہوئے کہا:

If you sofear from your officers well I sign it for you

اگر آپ کو اپنے افسران ہی کا خوف ہے تو میں آپ کی خاطر اس پر دستخط کئے دیتا ہوں۔"[1]

چنانچہ آپ نے بے خوف موت کے پروانہ پر ۷، مئی ۱۹۵۳ء کی تاریخ درج کر کے دستخط کر دیئے۔ جس کے بعد آپ کو پھانسی کی کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔

مولانا عبدالستار خان نیازی ۷، مئی سے ۱۴، مئی ۱۹۵۳ء تک اس کال کوٹھڑی میں رہے۔ اِس دوران آپ کا حوصلہ قابل دید تھا۔ آپ کو ذرہ برابر بھی سزا کا خوف نہ تھا۔ فوجی حکام آپ کی بے خوفی پر حیران تھے۔ جبکہ مولانا نیازی کا یہ حال تھا کہ بار بار وجد میں یہ شعر پڑھتے اور جھومتے

کشتگان خنجر تسلیم را

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

۱۴، مئی ۱۹۵۳ء کو مولانا نیازی کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا اور ایک حکومتی آرڈر کے ذریعے آپ کو سزا کے خلاف اپیل کرنے کا حق بھی دے دیا گیا لیکن آپ نے اپیل نہ کی۔ چنانچہ جسٹس محمد شریف نے از خود سارا کیس دیکھا اور آپ کی سزا کم کر کے تین سال کر دی۔ چنانچہ:

"مولانا نیازی پہلے جون ۱۹۵۴ء میں راولپنڈی جیل پھر فروری ۱۹۵۵ء میں لاہور جیل منتقل کر دیئے گئے۔ جس کے بعد مولانا نیازی نے عدالت عالیہ ایک رٹ داخل کی، جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ انہیں جس قانون کے تحت سزا دی گئی ہے وہ

---

[1] محمد صادق قصوری، مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی حیات خدمات تعلیمات، ص: ۱۳۷، ۱۳۶، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، مئی ۲۰۰۲ء

قانون، قانون ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اُسے گورنر جنرل کی منظوری اس لیے حاصل نہ ہوسکی کہ مجلس آئین ساز پہلے توڑ دی گئی تھی۔ یوں ۲۹، اپریل ۱۹۵۵ء کو دو سال سے زائد عرصہ جیل میں گزارنے کے بعد مولانا نیازی کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ بعد ازاں مئی ۱۹۵۵ء میں آپ کو اس کیس سے باعزت بری کر دیا گیا۔"[1]

مولانا عبدالستار نیازی صاحب کی سزا کے حوالے سے "دی نیشن" لاہور لکھتا ہے کہ:

"مولانا عبدالستار نیازی کو فوجی عدالت سے سزائے موت کا حکم مارشل لاء کی حدود سے سراسر تجاوز تھا۔ یہ ایک مذموم فعل تھا جسے کوئی قانونی جواز حاصل نہ تھا اور اس سے قوم دہشت زدہ اور وزیر اعظم سخت برہم ہوا تھا۔ فوج کو پہلی دفعہ سول انتظامیہ کی "مٹھاس" کا مزہ چکھنے کا موقع ملا۔ اُسے قومی بحران میں اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا اور بعد میں بھی قومی سیاست و معاملات میں اپنا کردار ادا کرنے کا شوق پیدا ہوا"۔[2]

مولانا نیازی نے سات دن اور آٹھ راتیں پھانسی کی کوٹھری میں گزاریں۔ رہائی کے بعد پریس والوں نے جب آپ کی عمر پوچھی تو آپ نے فرمایا:

"میری عمر وہ سات دن اور آٹھ راتیں ہیں جو میں نے ناموس مصطفیٰ ﷺ کے تحفظ کی خاطر پھانسی کی کوٹھری میں گزاری ہیں۔ کیونکہ یہی میری زندگی ہے اور باقی سب شرمندگی۔ مجھے اپنی اس زندگی پر ناز ہے۔"[3]

ہر حال میں حق بات کا اظہار کریں گے
منبر نہیں ہوگا تو سر دار کریں گے
جب تک بھی دہن میں ہے زباں سینے میں دل ہے
کاذب کی نبوت کا ہم انکار کریں گے

---

1. محمد صادق قصوری، مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی حیات خدمات تعلیمات، ص:۱۴۰، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، مئی ۲۰۰۲ء
2. دی نیشن، لاہور، ۲۳ ستمبر ۱۹۸۷ء، مشمولہ بحوالہ تحریک احمدیت، ص:۵۷۱، ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلیا بلڈنگ ریلوے اسٹیشن لاہور
3. اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص:۵۵۰-۵۴۹، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

یوں تمام مرکزی قائدین کی گرفتاری سے تحریک نے دم توڑ دیا اور وقتی طور پر یہ تحریک ختم ہوگئی، بعد میں حکومت نے تحریک کے مرکزی قائدین مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ صاحب، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، سید مظفر علی شمسی، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا لال حسین اختر وغیرہ کو ہائیکورٹ کے حکم پر فروری ۱۹۵۴ء میں رہا کر دیا۔

آفتاب عالم مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی

یہ مسلمہ اصول ہے کہ دنیا میں عظمت کی منزلیں عزیمت کی راہ سے گزرنے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہیں۔حق کے راستے میں مصائب وآلام اور مخالفت و مزاحمت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا نام عزیمت ہے۔تاریخ دعوت وعزیمت کا ایک ایک ورق ہمارے اسلاف کے کارناموں سے بھرا پڑا ہے۔جنھوں نے نیکی اور بدی کی معرکے میں اپنے عہد کی یزیدی اور طاغوتی قوتوں کے خلاف جنگ جاری رکھی اور وہ اس راہ میں جان کی بازی لگا کر قیامت تک کیلئے امر ہوگئے۔رخصت کے بجائے عزیمت کے دشوار گزار راستوں کا انتخاب کرنے والے یہ لوگ ہواؤں کے رخ کے ساتھ نہیں چلتے۔بلکہ ان کے عزم، حوصلے اور قوت ارادی کو دیکھ کے طوفان بھی اپنا رخ بدلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

یہ دین اسلام کی تعلیمات ہی ہیں کہ جس کی وجہ سے ہمیشہ تاریخ انسانی میں اہل حق، کفر و منافقت اور باطل قوتوں کے خلاف نہ صرف سینہ سپر رہے۔بلکہ انھوں نے ان طاغوتی قوتوں کا ڈٹ کر مردانہ وار مقابلہ کیا اور اسلام کے پرچم کو کبھی بھی کسی یزیدی دربار میں سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ان کی نظریں ہمیشہ منزل مقصود پر ہوتی ہیں۔کارواں میں کون شامل ہوا اور کون چلا گیا۔کس نے کس موڑ پر مجبوریوں کا بہانہ بنایا، مصائب وآلام سے گھبرا کر یا خار دار راہوں میں تھک کر ساتھ چھوڑ دیا۔نادان دوستوں کی مخالفت، دانا دشمنوں کی تباہ کن سازشیں یا جماعت کی آستینوں میں بت۔

وہ ان تمام باتوں اور اندیشوں سے مستغنی ہوتے ہیں۔وہ الزامات کے خارزاروں،

مخالفت کی پر خطر گھاٹیوں اور بغض اور حسد کے کانٹوں کی پرواہ کئے بغیر عازم سفر رہتے ہیں۔ انھیں وقت کی کوئی بھی رکاوٹ ،اذیت ناک ماحول ،حوادث اور ناخوشگوار واقعات لمحے بھر کیلئے بھی بے چین نہیں کرتے ،وہ خنداں پیشانی کے ساتھ مسکراہٹیں تقسیم کرتے ہوئے دلوں کو فتح کرتے ہیں اور دنیا کے نقشے بدلتے چلے جاتے ہیں ۔ایسے مردان حق روز روز پیدا نہیں ہوتے بلکہ بقول حضرت اقبال رحمۃ اللہ علیہ

تجھے معلوم بھی ہے کچھ کہ صدیوں کے تفکر سے
کلیجہ پھونک کر کرتی ہے فطرت اک بشر پیدا

صدیوں کے الٹ پھیر اور افلاک کی ہزاروں گردشوں کے بطن سے ایک ایسا دانائے راز پیدا ہوتا ہے ،جس کی جہد مسلسل سے ریگستانوں کو سیراب کرنے والے ہزاروں چشمے پھوٹتے ہیں ۔اُس کے نفس شعلہ بار سے سحر نو کا پیغام لے کر لاکھوں آفتاب طلوع ہوتے ہیں ۔

بیسویں صدی کا آغاز اُمت مسلمہ کیلئے جن بدترین حالات میں ہوا ۔اُس کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ۔لیکن اِس تاریک دور میں اللہ رب العزت نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے ایسے منتخب افراد سے اُمت کو نوازا ۔جنھوں نے ہر میدان میں چومکھی لڑائی لڑی اور ظلم و استحصالی نظام کا سینہ چیر کر شمعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی کو اس طرح سے پھیلایا کہ غفلت ،غلامی اور ناامیدی کے سائے چھٹ گئے اور احیائے اسلام اور اُمت مسلمہ کی اجتماعی وحدت و عالمگیر قوت کی حیثیت سے ابھرنے کے آثار نو پیدا ہونے لگے ۔موجودہ صدی میں جن نفوسِ قدسیہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ کام لیا ۔اُن میں حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کو ایک ممتاز حیثیت اور منفرد مقام حاصل ہے ۔

علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کی ذات مبارکہ صرف پاکستان ہی کیلئے نہیں بلکہ اُمت مسلمہ اور پوری دنیا کے مسلمانوں کیلئے سرمایہ افتخار ہے ۔آپ ایک نادر روزگار مفکر ،بے باک قائد ،زمانہ ساز مدبر ،ایک حیات آفریں شخصیت کے مالک ،انقلاب نظام مصطفی کے نقیب اور سب سے بڑھ کر تسلیم و رضا کے پیکر اور سچے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے ۔آپ کی کم و بیش اٹھہتر (۷۸) سالہ زندگی دین اسلام کے عملی نفاذ ،دینی قوتوں اور جمہوری اداروں کی فروغ اور بقاء ،پاکستان کے

استحکام و سالمیت اور مسلم وحدت کی مسلسل جدو جہد، احیائے اسلام اور کفر کے خلاف عالم اسلام کی بیداری سے عبارت ہے۔

علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی ایسے ہی منتخب مجاہدین میں سے ہیں، جنھوں نے عصر حاضر میں علمی فکری اور روحانی و مذہبی محاذ پر بھرپور جہاد کیا۔ آپ زوال آشنا ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی علامت اور عصر حاضر میں قوت و اقتدار کے بدلتے ہوئے معیاروں کو سامنے رکھتے ہوئے زندگی بھر اسلام کے عادلانہ سیاسی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی نظام کے قیام کیلئے مصروف جہاد رہے۔

آپ کی تکبیر مسلسل دشت و صحرا، شہر اور بیابانوں میں زندگی بھر صدائے حق بلند کرتی رہی۔ آپ کی ساری زندگی طاغوتی نظام کے علمبرداروں کے خلاف ایک چیلنج، بھٹکے ہوئے کارواں کی نقیب، بھولے ہوئے نغموں کی ایک صدا، ملت کے درد کا درماں، بے قرار دلوں کی دھڑکن اور صدیوں کی حرماں نصیبی کے بعد ایک اُمید کی کرن کی مانند رہی۔ آپ نے تشکیک و اضطراب کے اس پرفتن دور میں لاکھوں قلوب و اذہان کو ایمان اور یقین کی لازوال دولت سے سرفراز کیا۔

عہد حاضر میں آپ نظام مصطفی ﷺ کی اصطلاح کے نہ صرف خالق بلکہ قافلۂ انقلاب نظام مصطفی ﷺ کے میر کارواں بھی رہے، آپ اُمت کو ماسکو اور واشنگٹن کے بجائے گنبدِ خضراء کا راستہ دکھانے والے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے:

"ہماری منزل اسلام آباد نہیں بلکہ اسلام ہے۔ ہمارے سفر کی منتہائے معراج لندن، پیرس اور واشنگٹن نہیں بلکہ مکۂ مکرمہ اور مدینہ منورہ ہے۔"

اس لیے آپ نے اقتدار کے بجائے ہمیشہ حزب اختلاف کی سیاست کی۔ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۱، دسمبر ۲۰۰۳ء تک حزب اختلاف کی سیاست کا اتنا طویل، حوصلہ شکن، اور صبر آزما سفر کوئی مرد قلندر صاحب عزیمت و استقامت ہی کرسکتا ہے۔ جہاں تاریخ نے لیلائے اقتدار کی بھول بھلیوں میں وقت کے نامی گرامی افراد کو گم ہوتے، اسلام کو اپنی منزل قرار دینے والوں کو اسلام سے جفا کر کے اسلام آباد کے اسٹیشن پر اُترتے، اور فوجی آمروں کی

آغوش میں وزارتوں کے مزے لوٹتے دیکھا ہے۔

وہیں تاریخ اِس بات کی بھی گواہ ہے کہ علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی وہ واحد دیدہ ور، حق پسند وحق آگاہ اور صاحب بصیرت رہنما تھے۔ جنہوں نے جنرل ایوب خان، جنرل آغا محمد یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو جنرل محمد ضیاء الحق نواز شریف اور جنرل پرویز مشرف تک ہر آمر وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کلمہ حق بلند کیا۔ آپ قومی اسمبلی، سینٹ اور عوامی فلور ہر مقام پر بہادر نڈر، بیباک، حق وصداقت اور نہ جھکنے اور نہ بکنے والی قیادت کی علامت تھے۔ زندگی بھر آپ اپنے ہدف اور مشن پر ڈٹے رہے۔ پائے استقامت میں معمولی سی لغزش بھی آپ کو گوارہ نہ تھی۔ لیلائے اقتدار کی غلام گردشیں، بھول بھلیاں اور کشش اِس غلام مصطفی ﷺ کو اپنے دام فریب میں نہ الجھا سکیں اور وہ دیوانہ مصطفی ﷺ اسوۂ شبیری کی پیروی کرتا ہوا وقت کے ہر آمر کے سامنے کلمہ حق بلند کرتا دکھائی دیتا ہے۔

علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی ایک دیدہ ور، صاحب نظر وبصیرت، زہد وتقویٰ، مظہر صدق و صفا، مرد حق آگاہ، نابغہ روزگار، عالم باعمل، قائد بے مثال، عالمی مبلغ و داعی، اور امام اُمت تھے۔ آپ نے فکر وعمل کے وہ چراغ روشن کیے ہیں جو آئندہ صدیوں تک تاریک راہوں پر مسافرانِ حق کیلئے روشنی بکھیرتے رہیں گے۔ آپ کی کثیر الجہات شخصیت اور خدمات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ

عجب تماشہ ہے حسن جاناں — شروع کروں میں کہاں سے پہلے
کہ ہر اک جلوہ پکارتا ہے — یہاں سے پہلے، یہاں سے پہلے

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کا ایک نوجوان مجاہد مولانا شاہ احمد نورانی

یکم اپریل ۱۹۲۶ء کو مبلغ اسلام "سفیر پاکستان" علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی صاحب کے گھر پیدا ہونے والے اِس فرزند ارجمند نے اپنے ایمان، ضمیر اور نسبی تقاضوں کو سامنے رکھ کر احقاق حق اور ابطالِ باطل کی جو شمع روشن کی وہ احیائے اُمت کی عالمی تحریک بن کے مشرق ومغرب

کے دور دراز گوشوں تک پھیل چکی ہے۔

علامہ شاہ احمد نورانی کا خاندان قومی اور ملی حوالوں سے نمایاں خدمات کی شاندار روایات کا امین ہے۔آپ کے آباؤ اجداد عرب سے آ کر میرٹھ میں آباد ہوئے۔ یہ وہی میرٹھ شہر ہے جہاں کے حریت پسند غیور مسلمانوں نے انگریز کے خلاف ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کا آغاز کر کے تحریک پاکستان کی بنیاد رکھی۔علامہ شاہ احمد نورانی کے خاندان کا شمار میرٹھ کے مشہور علمی اور صوفی گھرانوں میں ہوتا تھا۔

آپ کے دادا شاہ عبدالحکیم میرٹھ کی شاہی مسجد کے خطیب، مبلغ اسلام اور مشہور صوفی شاعر تھے۔برصغیر کے مشہور ادیب وشاعر مولانا اسمٰعیل میرٹھی جن کی کتب یوپی بورڈ میں پڑھائی جاتی ہیں آپ کے دادا کے سگے بھائی تھے۔مشہور عالم دین مولانا مختار احمد صدیقی، مولانا بشیر احمد صدیقی، اور مولانا نذیر احمد خجندی، مولانا عبدالعلیم صدیقی کے سگے بھائی تھے۔مولانا نورانی کے تایا مولانا نذیر احمد خجندی صدیقی بمبئی کی جامع مسجد کے خطیب تھے۔

آپ نے تحریک خلافت میں فعال کردار ادا کیا اور گرفتار ہوئے۔آپ کے والد علامہ عبدالعلیم صدیقی نامور عالم دین اور مبلغ اسلام تھے۔مولانا عبدالعلیم صدیقی صاحب کی تبلیغ مساعی سے ساٹھ ہزار (اور دوسری روایت کے مطابق ایک لاکھ) سے زائد غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔آپ کی تدفین جنت البقیع میں اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں ہوئی۔

علامہ شاہ احمد نورانی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی اور آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔حفظ کے بعد ایک سال تک مدینہ منورہ میں تجوید وقرأت کی تعلیم مشہور قاری الشیخ حسن الشاعر سے حاصل کی۔ ۱۹۴۴ء میں اٹھارہ سال کی عمر میں درس نظامی کی تکمیل کی۔آپ کی دستار بندی مفتی اعظم ہند فرزند اعلیٰ حضرت مولانا شاہ مصطفی رضا خاں، صدرالافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی، والد گرامی مبلغ اسلام مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی اور آپ کے استاد محترم مولانا غلام جیلانی میرٹھی علیہم الرحمہ نے کی۔

۱۹۴۵ء میں انیس سال کی عمر میں آپ نے الہٰ آباد یونیورسٹی سے گریجویشن کی تعلیم مکمل کی اور سیاست میں عملاً حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۴۶ء میں آپ نے مسلم نوجوانوں کی تنظیم "نیشنل گارڈ" کی بنیاد رکھی اور انتخابات میں مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کی کامیابی کیلئے بھرپور جدوجہد کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۷ء میں پہلی مرتبہ سیاست میں حصہ لینے پر ڈیفنس انڈیا رولز کے تحت گرفتار ہوئے اور دو ہفتے کیلئے جیل گئے۔

علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی ۱۹۴۸ء میں والد ماجد کے ہمراہ پاکستان تشریف لائے۔ آپ نے ابتدا میں جیکب لائن میں رہائش اختیار کی اور بعد میں (وصال سے ایک سال قبل ۲۰۰۲ء تک) کچھی میمن مسجد صدر کے برابر کرائے کے فلیٹ میں منتقل ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں آپ نے فرانسیسی زبان کا چھ ماہ کا کورس مکمل کیا۔ ۱۹۵۳ء میں آپ "ورلڈ مسلم آرگنائزیشن" کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے اور مسلسل گیارہ سال تک اس کے جنرل سیکرٹری رہے۔ اس تنظیم کے صدر مفتی اعظم فلسطین مفتی امین الحسینی تھے۔

علامہ شاہ احمد نورانی نے دوران طالبعلمی ہی سے قادیانیوں کی اسلام دشمن سازشوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ اسی سال آپ نے پاکستان میں قادیانیوں کے خلاف تحریک ختم نبوت میں بھرپور حصہ لے کر پاکستان میں اپنی مذہبی وسیاسی زندگی کا آغاز کیا۔

مولانا شاہ احمد نورانی کے دیرینہ ساتھی اور مجاہد ختم نبوت حضرت صوفی ایاز خاں نیازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ:

"پرکشش و باکمال شخصیت کے مالک، بزرگوں اور اسلاف کے کمالات سے مزیّن، نجابت وشرافت کا نمونہ، وقار وتمکنت کا خزینہ، ظاہری و باطنی لطافت ونظافت کا مجسمہ، حسن و جمال وفضل وکمال کے عظیم پیکر، عاجزی وانکساری کی اعلیٰ مثال اور باعزت وباوقار زندگی خالی ہاتھ گزارنے والے مولانا شاہ احمد نورانی اپنی ذات کے بارے میں انتہائی کم گو اور منکسر المزاج ہیں۔"

مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کی ساری زندگی اعلائے کلمۃ الحق کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ اتحاد اُمت کی تڑپ اور بلادِ کفر میں اشاعت اسلام اور عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ آپ کی زندگی کے بنیادی نصب العین رہے۔ بارہ (۱۲) اور ایک روایت کے مطابق سترہ (۱۷) زبانوں پر عبور رکھنے، اور اپنی پوری زندگی دین اسلام اور پاکستان کی خدمت کرتے ہوئے بے شمار کارنامے سرانجام دینے والے قائد ملت اسلامیہ مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کی زندگی کے متعدد پہلو آج بھی ایسے ہیں جن پر آپ کی عاجزی، انکساری اور اخلاص کی وجہ سے پردہ پڑا ہوا ہے اور آپ کی زندگی کے صرف چند گوشے ہی ہمارے سامنے آسکے ہیں۔

گوکہ مولانا نورانی ذاتی زندگی میں نمود و نمائش کے قائل نہ تھے اور اپنی نیکیوں اور کارناموں کو منظر عام پر لانا مناسب خیال نہیں کرتے تھے۔ لیکن آپ کی حیرت انگیز جامع الصفات شخصیت اور آپ کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں اور کارناموں کو سامنے لانا صاحبان علم و دانش اور آپ کے رفقاء و مصاحبان پر ایک ایسا قرض ہے جس کی ادائیگی کی صورت میں ہی دنیا آپ کی شخصیت اور کارناموں سے صحیح طور پر آگاہ ہوسکتی ہے۔ راقم الحروف اِس بات کا عینی گواہ ہے کہ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی نے ناظم اعلیٰ ''فدایان ختم نبوت پاکستان'' برادرم السید عقیل انجم قادری کی موجودگی میں جناب خالد محمود قادری مدیر ''احوال و آثار'' اور مصنف ''سچی قیادت'' کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔ ''آپ نے ہماری تعریف میں بہت زیادہ لکھ دیا ہے، اتنا بھی نہیں لکھنا چاہیے تھا۔''

علامہ شاہ احمد نورانی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں بھرپور کردار ادا کرنے کے باوجود اِس تحریک میں آپ کا کام اور خدمات زیادہ نمایاں طور پر سامنے نہیں آسکیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ مولانا شاہ احمد نورانی اِن دنوں نوجوان تھے اور تحریک کی قیادت حضرت علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، علامہ عبدالحامد بدایونی، صاحبزادہ فیض الحسن آلو مہاروی، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، علامہ سید احمد سعید شاہ کاظمی، خواجہ قمر الدین سیالوی، علامہ عبدالستار خان نیازی، مفتی صاحبداد خان، مولانا عبدالغفور ہزاروی، مولانا غلام محمد ترنم مولانا غلام دین محمد، مولانا محمد

بخش مسلم جیسے جید حضرات علماء کے پاس تھی۔ اس لیے تاریخ اور مورخ کی یادداشت ایک ستائیس (۲۷) سالہ نوجوان کی تمام خدمات کو محفوظ نہ رکھ سکی اور تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں آپ کی خدمات اور کارناموں کا بہت سا حصہ گوشہ گمنامی میں چلا گیا۔

ذیل میں ہم نے جسٹس منیر انکوائری رپورٹ، علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کے انٹرویوز اور معاصرین کی یاداشتوں کی مدد سے کچھ مواد اکٹھا کر کے علامہ شاہ احمد نورانی کی زندگی کے کچھ گمنام گوشوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

جسٹس منیر انکوائری رپورٹ کے مطابق ۲، جون ۱۹۵۲ء کو تھیوسوفیکل ہال کراچی میں علماء کرام کی منعقدہ آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس کے اجلاس میں حکومت کے مرزائیت نواز رجحانات کے باعث آئینی ذرائع سے پرامن جدوجہد کا راستہ اختیار کرنے کیلئے جب:

''اس کانفرنس میں اہم رہنماؤں پر مشتمل ایک گیارہ رکنی ''علماء بورڈ'' تشکیل دیا گیا۔ جس کے ذمہ آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کے اگلے اجلاس کے جملہ انتظامات تھے۔ علامہ شاہ احمد نورانی اس نوتشکیل شدہ علماء بورڈ میں ایک رکن کی حیثیت سے شامل تھے۔''[1]

اُس وقت آپ کی عمر تقریباً ستائیس (۲۷) سال تھی۔ اس کم عمری میں علامہ عبد الحامد بدایونی، علامہ مفتی صاحبداد صاحب، سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا احتشام الحق تھانوی، علامہ محمد یوسف کلکتوی، مولانا لال حسین اختر، مولانا سلطان احمد، الحاج ہاشم گزدر، اور مولانا جعفر حسین مجتہد جیسے مختلف مکتبہ فکر کے اکابر علماء کے ساتھ آپ کا انتخاب آپ پر علماء کے اعتماد کا مظہر ہے۔

مولانا نورانی کم عمری اور نوجوانی کے باوجود غیر معمولی شخصیت اور قائدانہ صلاحیت کے حامل تھے۔ جس کا اظہار اکابر علماء نے آپ کو علماء بورڈ کا ممبر بنا کر کیا۔ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں جید علماء و مشائخ اہلسنّت کے ساتھ بحیثیت کارکن و ممبر آپ کی موجودگی جہاں آپ کیلئے ایک

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۸۰

اعزاز کا درجہ رکھتی ہے۔ وہاں وہ مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کی شکل میں تحریک تحفظ ختم نبوت ۱۹۷۴ء کو قادیانیوں کے خلاف برصغیر کے مسلمانوں کی نوے (۹۰) سالہ تحریک کو منطقی انجام تک پہنچانے والا ''عظیم قائد'' بھی فراہم کرتی ہے۔

علامہ شاہ احمد نورانی نے تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں علماء بورڈ کے ممبر اور تحریک کے کارکن کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی احسن طریقے سے انجام دیئے۔ دوران تحریک آپ کا تذکرہ کئی مقامات پر ملتا ہے۔ جو اِس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے اِس تحریک میں بھرپور کلیدی کردار ادا کرتے ہوئے کراچی میں تحریک کو منظم اور فعال کیا۔

علامہ شاہ احمد نورانی نے علماء بورڈ کے رکن کی حیثیت سے ''۱۳، جولائی ۱۹۵۲ء کو کراچی میں جناب الحاج محمد ہاشم گزدر کے گھر پر منعقدہ اجلاس میں شرکت کر کے'' آل پاکستان پارٹیز کنونشن'' کے انعقاد کے پروگرام کو حتمی شکل دینے میں دیگر علماء کرام کی معاونت فرمائی۔

''اس اجلاس میں پاکستان کی چودہ مذہبی جماعتوں جمعیت علماء پاکستان، جمعیت اہل سنت، حزب اللہ (مشرقی پاکستان)، تنظیم اہلسنت والجماعت جمعیت علماء اسلام، مجلس تحفظ ختم نبوت مجلس احرار اسلام، جمعیت اہلحدیث، جماعت اسلامی، جمعیت الفلاح، موتمر اہل حدیث پنجاب، سفینۃ المسلمین، جمعیت العربیہ، ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کو دعوت نامے جاری کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا''[1]

مولانا شاہ احمد نورانی ۱۵، اگست ۱۹۵۲ء کو کراچی میں علماء بورڈ کے اُس اہم اجلاس میں بھی شامل تھے۔ جس میں خصوصی طور پر لاہور سے مجلس عمل کے صدر مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری کے علاوہ مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری بھی شرکت کیلئے تشریف لائے تھے۔ اس اجلاس میں علماء بورڈ نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ:

''کل پاکستان آل پارٹیز کنونشن'' ۱۵، تا ۱۷، ستمبر ۱۹۵۲ء کو منعقد کی جائے۔'' منیر انکوئری

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۸۰

رپورٹ کے مطابق یہ کنونشن اپنے پروگرام کے مطابق نہ ہوسکا۔ چنانچہ ملتوی شدہ کنونشن کے آئندہ انعقاد کیلئے ۱۵، دسمبر ۱۹۵۲ء کو علماء بورڈ کے اجلاس میں ۱۶، تا ۱۸، جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں ''کل پاکستان آل پارٹیز کنونشن'' بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔''[1]

علماء بورڈ کے رکن ہونے کی حیثیت سے مولانا شاہ احمد نورانی بھی اس اجلاس میں موجود تھے۔

ماسٹر تاج الدین انصاری اپنی یادداشت میں مولانا شاہ احمد نورانی کی موجودگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جولائی ۱۹۵۲ء میں کراچی میں مجلس تحفظ ختم نبوت کی جانب سے روزنامہ زمیندار لاہور کے ایڈیٹر مولانا اختر علی خاں کے اعزاز میں نگار ہوٹل میں ایک عصرانہ دیا گیا۔ جس میں مقامی مدیران جرائد کے علاوہ سید حسین امام، مسٹر محمد ہاشم گزدر رکن دستور ساز اسمبلی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مفتی شفیع، مولانا لال حسین اختر، عبدالمجید سالک، مولانا نورانی میاں اور کراچی کے معزز تاجران اور علماء کرام نے شرکت کی۔''[2]

مولانا شاہ احمد نورانی اُس زمانے میں علامہ عبدالحامد بدایونی کے نائب کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ جمعیت علماء پاکستان سندھ کے سیکرٹری نشر و اشاعت بھی تھے۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں علامہ شاہ احمد نورانی علماء بورڈ کے ممبر ہونے کے علاوہ مجلس عمل تحفظ ختم نبوت سندھ کے جنرل سیکرٹری بھی تھے۔ آپ فرماتے ہیں:

''مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، بکفایت حسین، سید مظفر علی شمسی اور تمام مکاتب فکر کے دیگر علماء اس میں شامل تھے۔ یہ فقیر بھی سندھ کی مجلس عمل کا جنرل سیکرٹری تھا۔ بالآخر اس تحریک

---

[1] ایضاً: ص ۱۳۱، ۱۳۲

[2] اللہ وسایا، مولوی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۱۹۹، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

کا مرکز مسجد وزیر خان اندرون دہلی دروازہ لاہور بنی۔ جہاں علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری خطیب تھے اور کراچی میں جامع مسجد آرام باغ جہاں کے خطیب تاج العلماء مفتی عمر نعیمی تھے۔ تحریک ختم نبوت کے جانثاروں اور جانبازوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ لاہور میں پہلا مارشل لاء لگا سینکڑوں عاشقان مصطفی ﷺ نے سینے پر گولیاں کھائیں اور جام شہادت نوش کیا۔ بیسیوں علماء کو پابند سلاسل کیا گیا۔ تین علماء کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ جن میں اہلسنّت کے دو مقتدر علماء سید خلیل احمد قادری اور مجاہد ختم نبوت علامہ عبدالستار خان نیازی تھے۔ الحمدللہ! نہ کسی نے معافی نامے داخل کیے۔ نہ جان بخشی کی اپیل کی۔ سب نے عزیمت و استقامت کا مظاہرہ کیا اور پرچم نبوت و ناموس مصطفی ﷺ کو بلند رکھا۔"[1]

اس تحریک کے دوران آپ کراچی میں حضرت مولانا عبدالحامد بدایونی صاحب اور دیگر جید علماء کرام کے ساتھ شریک رہے اور گرفتاری دینے کیلئے رضا کاروں کے دستوں کی تیاری اور دیگر انتظامی اُمور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کراچی میں تحریک کو پروان چڑھایا۔ محمد امین نورانی لکھتے ہیں:

"۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں آپ کا نمایاں ترین کردار تھا اور آپ مجلس عمل کے سرکردہ رہنما شمار کیے جاتے تھے۔ آپ روزانہ گرفتاری دینے والے رضا کاروں کو تیار کراتے اور انہیں مخصوص مقامات پر لے جاتے جہاں وہ ختم نبوت کی حمایت اور حکومت کی مخالفت میں مظاہرہ کرتے ہوئے گرفتاری دیتے تھے۔"[2]

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں اپنی موجودگی کے حوالے سے آپ فرماتے ہیں:

"(میں) اُس زمانے میں پاکستان میں تھا اور کراچی میں اس تحریک کے دوران میں مولانا عبدالحامد بدایونی مرحوم اور دیگر علماء کے ساتھ شریک تھا۔ آرام باغ میں

---

[1] انٹرویو مولانا شاہ احمد نورانی، ماہنامہ النعیم کراچی ستمبر ۲۰۰۳ء، جلد ۱ شمارہ ۱۰، ص: ۱۸

[2] محمد امین نورانی، عہد رواں کی عبقری شخصیت، ص: ۵۵، بزم انوار القرآن گلشن اقبال کراچی، جنوری ۲۰۰۳ء

جمعہ کے دن اس مہم کا آغاز کیا گیا اور میں اس میں پیش پیش تھا۔“[1]

رضا کاروں کو گرفتاری کیلئے تیار کرنا اور دیگر اہم انتظامی اُمور مولانا شاہ احمد نورانی کی ذمہ داریوں میں شامل تھے۔

قادیانیت پچھلی صدی کا منحوس فتنہ

ایک انٹرویو کے دوران جب مولانا شاہ احمد نورانی سے یہ سوال پوچھا گیا کہ آپ کو قادیانیت کے ردّ میں کام کرنے کا احساس کیسے پیدا ہوا اور اِس سلسلے میں آپ نے کیا جدو جہد کی تو آپ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا:

”قادیانیت پچھلی صدی کا منحوس فتنہ ہے جس نے اسلام کے نام پر مسلمانوں کو کافر بنانے کا کام سنبھال رکھا ہے۔ مرزا قادیانی ۱۹۰۸ء میں مرا اور پچھلی صدی کا وہ سب سے بڑا فتنہ پرور شخص تھا۔ اُس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بے ادبیاں اور گستاخیاں کیں۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اُس کا عقیدہ وہ نہیں جو ایک مسلمان کا ہونا چاہیے۔ اُس نے خدا کا وجود اس انداز میں بیان کیا، جیسے ہندوؤں وغیرہ کا تصور ہے۔ عقیدہ ختم نبوت کا انکار بارہا کیا۔ اُس نے درجنوں دعوے کیے۔ وہ ایک مخبوط الحواس اور فاتر العقل شخص تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں ہی ”محمد اور احمد“ ہوں۔ اُس کو بے وقوف، احمق، جاہل اور بے عقل لوگوں نے اپنا سب کچھ مان لیا۔ بلکہ جو کچھ وہ بکتا گیا وہ مانتے گئے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ فتنہ ہندوستان میں انگریزوں نے برپا کیا۔ ان کا پیسہ اور پلاننگ تھی۔ یہ انگریز کا خود کاشتہ پودا ہے اور مرزا خود ملکہ برطانیہ کے گُن گاتا تھا۔ میرے والد ماجد خلیفہ اعلیٰ حضرت سفیر اسلام مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی چونکہ ایک مبلغ و مصلح تھے۔ انہوں نے ساری زندگی خدمت دین میں گزاری۔ جنوبی امریکہ میں انہوں نے

---

[1] ایضاً ص: ۸۷

مرزائیت کے خلاف جہاد کیا۔تبلیغ دین کیلئے سب سے پہلے ۱۹۳۵ء میں وہ سرینام، جنوبی امریکہ گئے۔ان کے ہاتھ پر الحمد للہ ایک لاکھ افراد نے اسلام قبول کیا۔

عقیدہ ختم نبوت مسلمانوں کے درمیان ایک متفقہ اور اجماعی عقیدہ ہے اور سب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ختم نبوت کا منکر کافر اور مرتد ہے۔اس اُمت میں فتنہ ارتداد اور فتنہ انکار ختم نبوت کو جڑ سے اکھاڑنے والے سب سے پہلے سچے عاشق رسول حضور ختمی مرتبت ﷺ کے پہلے خلیفہ راشد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔انہوں نے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر فتنہ انکار ختم نبوت کی سرکوبی کی۔مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ یمامہ میں ہزاروں صحابہ کرام شریک ہوئے۔جن میں سینکڑوں حفاظ قرآن بھی تھے اور بالآخر مسیلمہ کذاب کو کیفر کردار تک پہنچایا۔برصغیر میں متنبی قادیان کے خلاف علماء حق نے کفر و ارتداد کے فتوے جاری کئے۔اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی، حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی، مولانا لطف اللہ علی گڑھی، اور دیگر تمام مکاتب کے اکابر علماء نے مرزا غلام احمد قادیانی کی تکفیر کی۔علماء حق نے مناظرے اور مباہلے کے چیلنج دیئے اور قبول کئے۔یہی وجہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی محض ایک چھوٹی سی تعداد کو اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہوسکا اور اُمت مسلمہ کا سواد اعظم اس عظیم فتنے میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہا۔

چونکہ میرے والد کا موضوع ردّ قادیانیت و مرزائیت تھا۔اس حوالے سے تو یہ موضوع مجھے ورثے میں ملا اور پھر اس موضوع کا مطالعہ انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے۔انسان سوتے سے جاگتا ہے۔اُسے احساس ہوتا ہے، کہ اے مصطفی ﷺ کے غلام، اٹھ اور جاگ، تیرے ہوتے ہوئے تیرے نبی ﷺ کے گستاخ کیسے جرأت و جسارت کے ساتھ دندنا رہے ہیں۔یہ قادیانی سیاہ بخت اللہ کے پیارے محبوب ﷺ کی محبت ختم کرکے ہندوستان کے جھوٹے نبی کی محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ایسے میں ہر صاحب ایمان کا فرض ہے کہ وہ اٹھ کھڑا ہو اور میدان میں کود پڑے اس فتنہ کی سرکوبی ہر بڑے فریضے سے اہم فریضہ ہے۔یہ ایسا زہر ہے جو گڑ کی شکل میں کھلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ایسے حالات میں بہت

ضروری ہے کہ فتنہ قادیانیت کی سرکوبی کیلئے موثر اقدام اٹھائے جائیں۔ اس فتنے کی سرکوبی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی، حضرت اقدس پیر مہر علی شاہ گولڑوی، امیر ملت پیر جماعت علی شاہ صاحب جیسے ہمارے بزرگوں نے کی اور اس کا محاسبہ کیا۔ بعد میں اور لوگ بھی اس قافلہ میں شامل ہوتے چلے گئے۔ میرے والد ماجد نے سرینام جنوبی امریکہ میں اس فتنے کے خلاف جہاد کیا۔ میں بھی کچھ عرصہ وہاں رہ کر خدمت کرتا رہا۔ قادیانی پاکستان میں ربوہ کو "منی اسرائیل" بنانا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ہم نے بھی پلاننگ کی اور ہر موڑ پر اس فتنے کا تدارک کیا۔"[1]

"تحریک تحفظ ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں میری کوشش حقیر سا نذرانہ ہے"

مولانا نورانی فرماتے ہیں کہ

"میری سیاسی سرگرمیوں کا آغاز سنی عوام کی تنظیم اور مسلم لیگ کی جماعت سے ہوا۔ کیونکہ وہ دور میرا طالبعلمی کا بھی تھا۔ اس زمانے میں کوئی واضح شکل میری ذاتی سوچ کی بھی نہیں بن سکتی تھی۔ اس لیے اپنے بزرگوں کی بتائی اور دکھائی ہوئی راہ پہ چلنا کافی تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی کچھ عرصے تک میں حصول تعلیم میں مصروف رہا۔ پھر والد گرامی کے ساتھ بیرونی ممالک کے تبلیغی اور مطالعاتی دورے کئے۔ والد محترم نے میری تربیت جن خطوط پر کی اُن کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہی تھا کہ میں بھی باقاعدہ عملی سیاست میں آؤں۔ ادھر ہمارے بزرگوں نے وطن عزیز میں نفاذ اسلام کی جدوجہد شروع کر رکھی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ ۱۹۵۳ء میں قادیانی فرقے کے خلاف ہم نے آواز اٹھائی تھی۔ تو اُس میں سب سے توانا آواز ہمارے ہی بزرگوں کی تھی اور اس تحریک میں نوجوانوں کا خون سب سے زیادہ کام آیا۔ اس تحریک کی قیادت ہمارے بزرگ مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری نے کی۔ اس سے قبل حضرت غزالی زماں سید احمد سعید کاظمی صاحب نے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں

[1] فیض الرسول نورانی، صاجزادہ، افکار نورانی ص: ۵۰۔۴۸، مکتبہ اہلسنت جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور

ایک باقاعدہ قرارداد پیش کی تھی کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اس تحریک نے مجھے بھی اپنی طرف متوجہ کیا اور میں نے بھی جان دو عالم ﷺ کے منصب خاتم الانبیاء کے تحفظ کیلئے اپنی حقیر سی کوششوں کا نذرانہ پیش کیا۔"[1]

قادیانیت کے خلاف آہنی چٹان

جناب شاکر حسین خان (ریسرچ اسکالر، علوم اسلامی، جامعہ کراچی) اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں۔

"قیام پاکستان کے بعد علماء و مشائخ نے ۱۹۵۳ء میں قادیانیوں کے خلاف تحریک چلائی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کے باوجود علمائے حق نئی حکمت عملی سے اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے سرانجام دیتے رہے اور ہر محاذ پر قادیانیوں کے سامنے سینہ سپر رہے۔ وہ علماء جنہوں نے حق کی آواز کو تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کی ناکامی کے بعد دوبارہ بلند کیا۔ اُن میں روشن و تابندہ نام مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کا ہے۔ جنہوں نے عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کیلئے بھرپور طریقے سے عملی جدوجہد جاری رکھی۔ قادیانیوں کے خلاف تحریک چلائی اور اُن کی ہر موڑ پر مخالفت کرتے رہے۔ مولانا کو قادیانیوں کی مخالفت کرنا ورثے میں ملی تھی۔ اُن کے والد مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی قادیانیوں کے اہم مخالفین میں سے تھے۔ انہوں (مولانا نورانی) نے افریقہ، یورپ، سیلون، انڈونیشیا، ملائیشیا، برما اور عرب ریاستوں میں قادیانیت کے خلاف مہم چلائی۔ اور اُن کے رد میں انگریزی زبان میں کتاب لکھی۔ جس کا نام "The Mirror" ہے۔ اس کتاب کا عربی زبان میں ترجمہ "المرآۃ" کے نام سے ہوا۔ اس کتاب کے علاوہ انہوں نے ایک کتاب اردو میں بھی تحریر کی۔ جس کا نام "مرزائی حقیقت کا اظہار" ہے۔ اس کتاب کا ملائیشیا کی زبان میں ترجمہ شائع ہوا تو وہاں قادیانیوں کے خلاف زبردست

---

[1] فیض الرسول نورانی، صاحبزادہ، افکار نورانی، ص: ۲۳۱، ۲۳۲، مکتبہ اہلسنت جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور

تحریک چلی جس کے بعد ملائیشیا میں قادیانیوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ مولانا نورانی نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قادیانیوں کی مخالفت کی اور ہمیشہ اُن کے آگے آہنی چٹان کی مانند کھڑے رہے۔"[1]

تحریک ختم نبوت میں اکابرین اہلسنّت کیلئے پھانسی کی سزا کا اعزاز

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے دوران مارشل لاء کے تحت قائم فوجی عدالتوں نے جن چار حضرات کو پھانسی کی سزا سنائی۔ اُن میں حضرت مولانا سید خلیل احمد قادری اور حضرت مولانا مجاہد ملت عبد الستار خاں نیازی کا تعلق اہلسنّت و جماعت کے اکابر اور جید علماء سے تھا، ان دونوں حضرات کو فوجی عدالتوں نے تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں متحرک و فعال کردار ادا کرنے اور حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے جرم میں پھانسی کی سزا سنائی تھی۔ جبکہ اس تحریک کے دوران پھانسی کی سزا پانے والے تیسرے فرد جناب صوفی محمد نذیر احمد صاحب کا تعلق بھی اہلسنّت و جماعت سے تھا۔ واضح رہے کہ صوفی نذیر احمد صاحب کو فوجی عدالت نے تحریک کے دوران ایک مرزائی اسکول ٹیچر کو قتل کرنے کے الزام میں سزائے موت کا حکم سنایا تھا۔ قومی اخبارات میں شائع شدہ خبر کے مطابق:

"محمد نذیر نے مارشل لاء کے دوران ایک مرزائی اسکول ٹیچر کو قتل کر دیا تھا کو 4 جنوری 1955ء کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا، اس خبر کی اشاعت نے مسلمانان پاکستان میں شدید غم و غصے کی لہر دوڑا دی اور گورنر جنرل اور حسین شہید سہروردی کو لوگوں نے محمد نذیر کی سزا کو ختم کرنے کیلئے لاتعداد تار اور رحم کی اپیلیں کیں۔ سخت عوامی دباؤ اور کشیدہ صورتحال کے پیش نظر بعد میں صوفی محمد نذیر کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا۔"[2]

جبکہ اس تحریک کے دوران پھانسی کی سزا سننے والے چوتھے فرد جماعت اسلامی کے

---

[1] ماہنامہ پیام حرم کراچی، نومبر ۲۰۰۵ء، ص: ۲۳، جلد ۲، شمارہ ۳

[2] اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء، جلد اول، ص: ۱۹۔ ۱۵، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، جولائی ۱۹۹۳ء

سربراہ سید مودودی تھے، واضح رہے کہ سید مودودی نے تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں نہ تو خود کوئی حصہ لیا اور نہ ہی انہوں نے جماعت اسلامی کے کارکنان کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ اس تحریک میں حصہ لیں اور حکومت کے خلاف راست اقدام کی تحریک میں متحرک اور فعال کردار ادا کریں، بلکہ یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ سید مودودی نے جماعت اسلامی کے اُن دو افراد کو بھی جنھوں نے حکومت کے خلاف راست اقدام کی تحریک میں حصہ لیا تھا کو اپنے حکم کی خلاف ورزی کی بناء پر جماعت کی بنیادی رکنیت سے خارج کر دیا تھا۔

ایسی صورت میں جبکہ سید مودودی عملاً اس تحریک سے نہ صرف خود لاتعلق رہے بلکہ انہوں نے اپنی جماعت کو بھی اس تحریک سے دور رکھا اور اکابر علماء اہلسنّت مولانا سید خلیل احمد قادری اور مجاہد ملت مولانا عبدالستار خاں نیازی کی طرح نہ تو کوئی قابل فخر قائدانہ کردار ادا کیا اور نہ ہی صوفی نذیر احمد کی طرح کسی قادیانی مرتد کو جہنم واصل کیا، پھر بھی انہیں فوجی عدالت کی طرف سے سزائے موت کا حقدار قرار دیا جانا، عدالت کا ایک ایسا عجیب وغریب فیصلہ ہے، جس کا فائدہ اٹھا کر جماعت اسلامی اور اُس کے ارکان آج بھی سید مودودی کو زیرو سے ہیرو بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کا مجاہد قرار دیتے ہیں، جبکہ اس ہیرو اور نام نہاد مجاہد کی اصل حقیقت، اُس کی اپنی تحریروں، جسٹس منیر رپورٹ، تحریکی وابستگان کے بیانات اور مورخ کے بیان کردہ تاریخی حقائق سے عیاں ہے، جس کی تفصیل آگے بیان ہونے جارہی ہے۔

تحفظ ختم نبوت کے "جرم" میں سزا پانے والے کس مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے؟

تحفظ کا دعویٰ اور ڈھنڈورا پیٹنے والوں سے ایک اہم سوال

دنیا میں عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کا ڈھنڈورا پیٹنے اور اپنے اکابرین کو تحاریک ختم نبوت کو کامیابی سے چلانے اور اس راہ میں قربانیاں دینے کا دعویٰ کرنے والے ایک مخصوص مکتبہ فکر کے دعوؤں اور کردار کا جائزہ لیتے ہوئے مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین اور جامعہ نعیمیہ

کراچی کے مہتمم جناب مفتی منیب الرحمن صاحب فرماتے ہیں کہ پاکستان میں:

''ایک مخصوص مکتبہ فکر نے تحریک تحفظ ختم نبوت کو بظاہر اپنا مشن بنایا اور اس عنوان پر انہوں نے ایک عالمی مجلس ختم نبوت بھی بنا رکھی ہے اور اس مقدس مشن کے نام پر ہر سال زکوٰۃ، فطرہ اور عطیات کی شکل میں بے شمار چندہ بھی جمع کیا جاتا ہے، برطانیہ میں کانفرنسیں بھی منعقد کی جاتی ہیں اور ان کا مکمل زور بیان وقلم اس بات پر ہوتا ہے کہ ختم نبوت کے عنوان پر چلنے والی تمام تحریکیں اُن کے علماء واکابر نے چلائیں اس راہ میں انہوں نے قربانیاں دیں اور دیگر مسالک کے علماء کا ان تحاریک میں کردار محض ثانوی رہا ہے۔لیکن حیرت واستعجاب کی بات یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں تحفظ ختم نبوت کے ''جرم'' میں جن علماء کو سزائے موت سنائی گئی، ان میں ایک بھی اُن کے مکتبہ فکر کا نہیں تھا بلکہ ان میں سے دو مقتدر علماء اہلسنّت مجاہد ملت علامہ محمد عبدالستار خان نیازی اور مولانا سید خلیل احمد قادری رحمہما اللہ تعالیٰ تھے، جبکہ تیسرے جماعت اسلامی کے امیر سید مودودی صاحب تھے۔''

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں اِس مخصوص مکتبہ فکر اکابر علماء کے کردار اور تحریک کی ناکامی کے حوالے جناب مفتی منیب الرحمن صاحب مزید فرماتے ہیں کہ:

''ایک روایت یہ بھی ہے کہ اِن میں سے بعض لوگ دن میں تحریک ختم نبوت کی مجالس میں شریک ہوتے اور رات کو گورنر ہاؤس میں جا کر مخبری کیا کرتے تھے، جس کے باعث یہ تحریک نتیجہ خیز نہ بن سکی۔''

تحریک میں سید مودودی اور جماعت اسلامی کا کردار

حقیقت یہ ہے کہ سید مودودی نے تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں عملاً کوئی حصہ نہیں لیا تھا اور وہ خود اپنی جماعت سمیت مجلس عمل کا حصہ ہونے اور اُس کے تمام اہم فیصلوں میں شامل ہونے کے باوجود اس تحریک سے لاتعلق رہے۔سید مودودی اور جماعت اسلامی نے اپنے

دورخی اور منافقانہ طرز عمل سے اس عظیم تحریک کے مقاصد اور نصب العین کو کس طرح سبوتاژ کیا اور کس طرح شہدائے ختم نبوت کے خون سے بے وفائی کی۔ آئیے دیکھتے ہیں:

کراچی میں تحریک کے تمام مرکزی قائدین کی گرفتاری کے بعد حکومت پنجاب نے ۲۷ اور ۲۸ فروری کی درمیانی شب مولانا غلام محمد ترنم، حافظ خادم حسین کو گرفتار کرلیا اور رضا کاروں کے کیمپ پر چھاپہ مار کر تمام سامان قبضے میں لے لیا۔ اس صورتحال میں جب کہ تحریک اپنے مرکزی قائدین سے محروم ہو چکی تھی اور حکومت نے طاقت کے ذریعے تحریک کو کچلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ۲۷ فروری کی شام مولانا سید خلیل احمد قادری اور حافظ خادم حسین رضوی نے مولانا مودودی سے اُن کے گھر پر ملاقات کی اور اُن سے کہا کہ اس وقت:

> ''تحریک کے بڑے بڑے لیڈر گرفتار ہو چکے ہیں۔ اب آپ ہی باقی ہیں، لہٰذا آپ ہماری رہنمائی کریں۔ جس پر میں (مولانا مودودی) نے اُن سے کہا کہ مجلس عمل کے جو لیڈر لاہور میں ہیں اُنہیں آپ کل صبح میرے ہاں لے آئیے پھر مشورے کے بعد کچھ عرض کرسکوں گا۔''[1]

چنانچہ دوسرے دن صبح مولانا سید خلیل احمد قادری، مولانا ابراہیم چشتی، مولانا عبدالستار خاں نیازی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ، مولانا مودودی سے مل کر آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کیلئے اُن کے مکان پر جمع ہوئے۔ مشاورت کے دوران مولانا مودودی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

> ''یہ ڈائریکٹ ایکشن کنونشن کی بعض شریک جماعتوں نے بالکل من مانے طریقے پر شروع کیا ہے اور آپ لوگ جانتے ہیں کہ میں اس کا ہرگز مؤید نہ تھا...... میرے نزدیک اس سے نہ صرف یہ کہ اس مقصد کو نقصان پہنچے گا بلکہ تمام دینی جماعتوں کے وقار کو اور اُن تمام دینی مقاصد کو جن کیلئے ہم اب تک کوشش کرتے رہے ہیں ایسا

---

[1] مولانا مودودی، قادیانی مسئلہ اور اس کے مذہبی سیاسی اور معاشرتی پہلو، ص: ۲۰۰، اسلامک پبلی کیشنز شاہ عالم مارکیٹ لاہور نومبر ۱۹۹۷ء

صدمہ پہنچے گا جس کی تلافی مشکل ہی سے ہو سکے گی۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ پنجاب میں بھی مجلس عمل کے نظام کو توڑ دیا جائے۔ جن جماعتوں نے یہ کام شروع کیا ہے وہ اپنی ذمہ داری پر اگر اسے جاری رکھنا چاہیں تو رکھیں مگر جو جماعتیں اس میں شریک نہیں ہونا چاہتیں اُنہیں اس سے علیحدہ رہنے دیا جائے۔ جماعت اسلامی کی حد تک میں صاف کہے دیتا ہوں کہ ہم اس میں کوئی حصہ نہ لیں گے اور اپنے ایک آدمی کو بھی اس میں شریک ہونے کی اجازت نہ دیں گے...... (آپ) براہ کرم اُن لوگوں کو اپنے ساتھ الجھانے کی کوشش نہ کریں جو آپ کے شریک کار ہونا پسند نہیں کرتے۔"[1]

سید مودودی نے مزید کہا کہ:

"میں سر دست تحریک (کی قیادت) سے اس لیے معذرت چاہتا ہوں کہ عوام میں تا حال تحریک کیلئے پوری ہمدردی کے جذبات نہیں ہیں، اس لیے میں تحریک میں اس وقت حصہ نہیں لینا چاہتا...... (مولانا مودودی کی مایوس کن گفتگو سن کر) مولانا سید خلیل احمد قادری نے اُن سے کہا کہ مولانا ذرا باہر تشریف لے چلیں اور عوام کے جذبات کا اندازہ لگا لیں تا کہ آپ کی غلط فہمی دور ہو جائے۔ عوام دل و جان سے تحریک کے ہمدرد اور ہر ممکن قربانی کیلئے تیار ہیں۔ (مولانا سید خلیل احمد قادری کی بات سن کر مولانا مودودی نے کہا) مجھے تحریک سے ہمدردی ہے۔ مگر میں شامل ہونا نہیں چاہتا۔ اس پر مولانا خلیل احمد نے کہا یہ فیصلہ تو آپ کو ایکشن کمیٹی میں شامل ہونے سے قبل کرنا چاہیے تھا۔ اب آپ بہت نازک وقت میں کنارہ کشی کر رہے ہیں۔ بڑی رد و کد کے بعد مولانا مودودی زچ ہو گئے تو فرمایا اچھا یوں کیجئے کہ جمعیت علماء اسلام، جمعیت اہلحدیث اور جماعت اسلامی پیچھے رہ کر کام کریں۔ لٹریچر وغیرہ شائع کریں اور جمعیت

---

[1] مولانا مودودی، قادیانی مسئلہ اور اس کے مذہبی سیاسی اور معاشرتی پہلو ص: ۲۰۰۔۲۰۱، اسلامک پبلی کیشنز شاہ عالم مارکیٹ لاہور نومبر ۱۹۹۷ء

علماء (پاکستان) مجلس احرار اور ادارہ تحفظ حقوق شیعہ چونکہ اقدام کر چکے ہیں اس لیے وہ محاذ پر لڑتے رہیں۔ ہم اُن کیلئے پراپیگنڈہ کریں گے۔ اس پر مولانا محمد اسماعیل نے فرمایا جمعیت المحدیث تو اقدام کر چکی ہے اور اس کے علماء فیصل آباد میں گرفتاریاں بھی دے چکے ہیں جبکہ جمعیت علماء اسلام کے صدر مولانا احمد علی لاہوری جلسۂ عام میں تقریر کر کے محاذ کھول چکے ہیں۔ جمعیت علماء تو اب پیچھے نہیں رہ سکتی۔ اس پر مولانا مودودی نے کھسیانے ہو کر فرمایا کہ بہت اچھا جناب یہ سب کچھ درست ہے۔ مگر جماعت اسلامی تو آگے آنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ اسے تو پیچھے رہ کر اپنے ڈھب سے کام کرنا ہے۔ جماعت لٹریچر وغیرہ چھپائے گی۔ غرضیکہ مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کو منشی گلاب سنگھ کا چھاپہ خانہ ثابت کر دیا۔"[1]

امر واقعہ یہ تھا کہ سید مودودی نے جب یہ دیکھا کہ تحریک کی تمام قیادت گرفتار کر لی گئی ہے اور حکومت نے طاقت کے بل پر تحریک کو کچلنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اُنہوں نے اس تحریک سے علیحدہ رہنے میں نہ صرف اپنی عافیت جانی بلکہ جماعت کے وہ دو اراکین جنھوں نے اس تحریک میں عملاً حصہ لیا اور راست اقدام کیلئے رضا کاروں کے بھرتی فارم پُر کئے، اُن کو جماعت اسلامی کی پالیسی کا مخالف قرار دے کر جماعت کی بنیادی رکنیت سے بھی خارج قرار دے دیا۔ جماعت اسلامی نے اپنے اس عمل کے ذریعے حکومت وقت کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اُس کا اس تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بات کی تصدیق منیر انکوائری رپورٹ سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں جسٹس منیر نے لکھا کہ:

"نہ جماعت کے کسی فرد کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ راست اقدام کے ورکر کی حیثیت سے بھرتی ہو۔ مولانا (مودودی) ...... نے جماعت کے دو ممبروں کو اس حکم کی خلاف ورزی کی پاداش میں خارج کر دیا۔"[2]

---

[1] اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۳۴۷۔۳۴۶، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء۔

[2] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۱۳۶

جبکہ خود سید مودودی نے عدالت میں دیئے گئے اپنے تحریری بیان میں اِس بات کو تسلیم کیا کہ جماعت اسلامی کا اِس تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سید مودودی اپنے بیان میں کہتے ہیں:

”۴، اور ۵، مارچ کو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا اور اُس نے ڈائریکٹ ایکشن سے جماعت اسلامی کی قطعی بے تعلقی کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر میں نے پنجاب کے تمام اضلاع سے جماعت کے ذمہ دار کارکنوں کو لاہور بلا کر ہدایات دیں کہ وہ جماعت کے ارکان کو اِس تحریک سے بالکل علیحدہ رکھیں۔ اِس کے بعد دو مقامات سے مجھے اطلاع ملی کہ جماعت کے دو ارکان نے ڈائریکٹ ایکشن میں حصہ لیا ہے اور میں نے فوراً اُن دونوں کو جماعت سے خارج کر دیا۔ اِس پوری مدت میں میرے یا جماعت کے کسی فعل سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ ان اضطرابات کی ذمہ داری میں ہمارا کوئی ادنیٰ سا بھی حصہ ہے۔ اِس کے باوجود جس طرح مجھے اور جماعت کے بہت سے ارکان کو خواہ مخواہ اِس کی ذمہ داری میں گھسیٹا گیا ہے، اِس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک شخص سڑک سے ہٹ کر کھیتوں میں جا کھڑا ہوا اور دوسرا وہاں موڑ لے جا کر اُس کو ٹکرا دے۔“[1]

آپ دیکھئے کہ سید مودودی نے کس خوبصورتی سے کھیتوں میں جا کھڑے ہونے کی مثال دے کر اپنے آپ کو تمام تحریک اور تحریکی اُمور سے لاتعلق اور بری الذمہ قرار دے دیا ہے۔ سید مودودی کا یہ عمل دراصل تحریکی مقاصد اور نصب العین سے ہی لاتعلقی نہ تھا بلکہ اُس تمام حکمت عملی سے بھی اظہار برأت تھا جو تحریکی قائدین نے ۱۹۵۳ء کی تحریک کو کامیاب بنانے کیلئے متفقہ طور پر اختیار کیے تھے۔ یہاں غور طلب اَمر یہ بھی ہے کہ سید مودودی اور جماعت اسلامی کا تحریک ختم نبوت سے اظہار لاتعلقی اور عملاً تمام تحریکی اقدامات سے دور رہنا اور تحریک میں کسی بھی قسم کی قربانی نہ دینے کے باوجود عدالت کی جانب سے اُنہیں سزاوار قرار دینا سوال پیدا کرتا ہے کہ

---

[1] اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۶۲۱۔ ۶۲۰، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

اُنہوں ایسا کون سا جرم کیا تھا جس کی پاداش میں عدالت اُنہیں پھانسی کی سزا سنا کر مجرموں کی قطار سے نکال کر سربکف تحریکی مجاہدین کی صف اول میں کھڑا ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ جس کی بنیاد پر مولانا مودودی اور جماعت اسلامی آج بھی اپنے آپ کو تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے سرفروشوں میں ظاہر کر کے سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتی ہے۔

قبل اِس کے کہ ہم اُن محرکات کا جائزہ لیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کے تحقیقاتی عدالت میں دیئے گئے بیان کا وہ اہم حصہ پیش نظر رکھا جائے جس میں سید مودودی مسلمانوں کے مقابلے میں قادیانیوں سے واضح طور پر اظہار ہمدردی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سید مودودی اپنے بیان میں کہتے ہیں کہ:

''گذشتہ ماہ جولائی میں شیخ بشیر احمد صاحب ایڈوکیٹ لاہور، مولوی ابوالعطاء جالندھری اور جناب جلال الدین شمس صاحب (واضح رہے کہ یہ تینوں افراد قادیانی ہیں) کو میں نے سمجھایا تھا کہ جو باتیں انگریزی دور میں نبھ گئیں وہ اب اِس آزادی کے دور میں، جب کہ جمہوری حکومت کے اختیارات مسلم اکثریت کے ہاتھ میں ہیں زیادہ دیر تک نہ نبھ سکیں گی۔ لہٰذا بجائے اِس کے کہ آپ کی جماعت اور مسلمانوں کے تعلقات کی تلخی میں مزید اضافہ ہو۔ آپ لوگ معاملہ فہمی اور تدبر سے کام لیتے ہوئے دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو اختیار کرلیں۔ یا اپنے عقائد اور طرز عمل میں ایسی ترمیم کیجئے کہ جس سے مسلمان آپ کو اپنے اندر شامل رکھنے پر راضی ہوسکیں یا پھر خود ہی مسلمانوں سے الگ ہو کر ایک مستقل اقلیت کی حیثیت سے اپنے لیے وہی حقوق حاصل کر لیجئے جو پاکستان میں دوسری اقلیتوں کو حاصل ہیں۔ مگر افسوس کہ انہوں نے میرے اِس دوستانہ مشورے کو قبول نہ کیا۔ پھر مارشل لاء کے زمانے میں ۱۰، مارچ کے قریب خواجہ نذیر احمد صاحب ایڈوکیٹ لاہور سے میری ملاقات ہوئی اور اُن سے میں نے کہا کہ آپ مرزا بشیر الدین محمود صاحب سے خود جا کر ملیں اور اُن کو مشورہ دیں کہ اگر وہ واقعی مسلمانوں سے الگ ہونا پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ اُن کی جماعت اسی

ملت کاایک جزو بن کر رہےتو وہ صاف الفاظ میں حسب ذیل اعلان کر دیں:

(۱) یہ کہ وہ نبی ﷺ کو اس معنیٰ میں خاتم النبیین مانتے ہیں کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی اور نبی مبعوث ہونے والا نہیں ہے۔

(۲) یہ کہ وہ مرزا غلام احمد صاحب کیلئے نبوت یا کسی ایسے منصب کے قائل نہیں ہیں جسے نہ ماننے کی وجہ سے کوئی شخص کافر ہو۔

(۳) یہ کہ تمام غیر احمدی مسلمانوں کو مسلمان مانتے ہیں اور احمدیوں کیلئے اُن کی نماز جنازہ پڑھنا، اُن کے امام کی اقتداء میں نمازیں ادا کرنا، اُن کو بیٹیاں دینا جائز سمجھتے ہیں۔"[1]

آگے کہتے ہیں کہ:

"میں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ اگر آج مرزا صاحب ان باتوں کا واضح اعلان کر دیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ سارا جھگڑا فوراً ختم ہو جائے گا۔"[2]

ماسٹر تاج الدین انصاری سید مودودی کے بیان کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"سید مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ (کسی) ایسی تجویز کہ مرزا کو ماننے کے باوجود مرزائی مسلمانوں کا حصہ شمار ہو سکیں۔ وہ ایسے ممکن ہے کہ مرزا صاحب کیلئے نبوت یا کسی ایسے منصب کے قائل نہیں جسے نہ ماننے کی وجہ سے کوئی شخص کافر ہو یعنی مرزا کو ماننے نہ ماننے والے دونوں برابر ہو جائیں (یہاں یہ اَمر بھی واضح رہے کہ سید مودودی کی جانب سے دی گئی تجاویز کی رُو سے لاہوری گروپ مسلمان ٹھہرتا تھا) غور فرمایئے کہ مودودی صاحب کی یہ تجویز اُس مدعی نبوت کے متعلق ہے، جس کا دعویٰ ہے کہ میں نبی ہوں۔ ایسے مدعی نبوت کو کافر نہ کہنے والا بھی کافر ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ اُسے نبی کے علاوہ کوئی اور منصب مان کر مسلمانوں کو دھوکہ دے کر تحریک کو ناکام بنا دیا جائے۔ اِس تجویز کے خالق صرف مودودی صاحب ہی ہو سکتے ہیں، کوئی دوسرا مسلمان تو اس کا

---

[1] اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۶۲۱۔ ۶۲۲، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء۔

[2] اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۶۲۲، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء۔

تصور بھی نہیں کر سکتا۔"[1]

آئیے اب چلتے ہیں اِس سوال کے جواب کی جانب کہ مودودی صاحب اور اُن کی جماعت اسلامی جب تحریک ختم نبوت میں شامل ہی نہ تھی تو وہ گرفتاریوں کیے گئے اور اُن کو عدالت نے کس خود ساختہ جرم کے تحت سزائے موت کا حکم سنایا تو اِس کا صحیح جواب یہ ہے کہ مودودی نے تحریک کے شباب کے دِنوں میں ایک مختصر سا کتابچہ "قادیانی مسئلہ" کے نام سے لکھا تھا۔ منیر انکوائری رپورٹ کے مطابق:

"چالیس صفحوں کا یہ کتابچہ "قادیانی مسئلہ" ۵، مارچ ۱۹۵۳ء کو شائع کیا گیا۔"[2]

خود سید مودودی نے اِس بات کا اعتراف اپنے اُس بیان میں کیا جو انہوں نے فوجی عدالت میں دیا۔ اِس بیان میں سید مودودی کہتے ہیں کہ:

"میں نے ۲۰، فروری کو وہ مضمون لکھنا شروع کیا جو بعد میں "قادیانی مسئلہ" کے نام سے پمفلٹ کی شکل میں شائع ہوا...... استغاثہ کے گواہ محمد صدیق کاتب کی بھی یہ شہادت موجود ہے کہ اُن کو فروری کے آخری ہفتے میں یہ پمفلٹ کتابت کیلئے ملا ہے۔ اِس کے ساتھ میں یہ بات بھی معزز عدالت کے نوٹس میں لانا چاہتا ہوں کہ اِس کا پہلا ایڈیشن 5، مارچ کو پریس سے نکلا۔"[3]

اِس کتابچہ کی تاریخ اِشاعت سے یہ بات واضح ہے کہ یہ کتابچہ تحریک شروع ہونے اور ۲۷، فروری ۱۹۵۳ء کو تمام مقتدر رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد ۶، مارچ ۱۹۵۳ء کو مارشل لاء لگنے سے صرف ایک دن قبل شائع ہوا۔ اور مارشل لاء لگنے کے بائیس دن (۲۲) اور تحریک کے مقتدر رہنماؤں کی گرفتاری کے ٹھیک ایک ماہ بعد ۲۸، مارچ ۱۹۵۳ء کو مولانا مودودی کو

---

1. اللہ وسایا، مولوی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۶۲۵، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء
2. رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۲۶۸
3. مولانا مودودی، قادیانی مسئلہ اور اس کے مذہبی سیاسی اور معاشرتی پہلو ص: ۸۱۔ ۸۰، اسلامک پبلی کیشنز شاہ عالم مارکیٹ لاہور، نومبر ۱۹۹۷ء

گرفتار کیا گیا۔اُن پر مارشل لاء کے ضابطہ ۸،اور تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۵۳ کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔آغا شورش کاشمیری کے مطابق اُن کا:

''جرم یہ تھا کہ اُنہوں نے قادیانی مسئلہ نامی پمفلٹ لکھا جو مارشل لاء سے ایک دو روز پہلے چھپ چکا تھا اور مارشل لاء کے پورے زمانہ میں شائع ہوتا رہا اور کبھی ایک دن کیلئے بھی اُس پر کوئی پابندی عائد نہ کی گئی...... اِس پمفلٹ میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو حکومت کی پیشانی کیلئے کسی شکن کا باعث ہوتی لیکن حکومت ایک ارادہ کر چکی تھی اُس کی تکمیل کیلئے اُس نے پمفلٹ کی آڑ لی اور مولانا کو (۱۱ مئی ۱۹۵۳ء کو) سزائے موت سنادی۔''[1]

جسے بعد میں عمر قید سے تبدیل کر دیا گیا۔مندرجہ حقائق سے واضح ہو جاتا ہے کہ سید مودودی نے قادیانیوں کی مخالفت میں یہ کتابچہ اُس وقت لکھا جب تحریک اپنے پورے شباب پر پہنچ چکی تھی۔تمام مرکزی قائدین گرفتار کئے جا چکے تھے اور پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ پوری قوم کی آواز بن چکا تھا۔ایسے وقت میں سید مودودی نے اپنی سابقہ سرشت کے مطابق'' قادیانی مسئلہ''نامی کتابچہ لکھ کر یہ ظاہر کرنے اور مسلمانانِ پاکستان کو دھوکہ دینے کی کوشش کی کہ وہ اور اُن کی جماعت بھی اس مطالبے کے حق میں ہے۔بقول شخصے اِسے بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے۔چنانچہ ماسٹر تاج الدین انصاری لکھتے ہیں کہ:

''۱۸ جنوری تک جماعت اسلامی تحریک ختم نبوت کو نواں نقطہ بنا کر ہضم کر جانے کی ترکیبیں سوچتی رہی۔مگر جب ملک کے نمائندوں نے جو پاکستان کے کونے کونے سے سرور عالم ﷺ کی محبت اور عقیدت سے سرشار ہو کر کراچی میں جمع ہوئے تھے۔مولانا سید ابواعلیٰ مودودی کے نیک ارادوں کو ناکام بنا دیا تو جماعت اسلامی دو ذہنی میں مبتلا ہو گئی۔تحریک کا شباب دیکھ کر جماعت اسلامی اس سے الگ ہونا نہیں

---

[1] آغا شورش کاشمیری،تحریک ختم نبوت،ص:۱۴۸،مطبوعات چٹان میکلوروڈ لاہور،مارچ ۲۰۰۳ء

چاہتی تھی۔وہ پانچویں سوار کی حیثیت سے پیچھے پیچھے چلنا چاہتی تھی۔بدیں خیال کہ تحریک کامیاب ہوتو آگے بڑھ کر اعلان کر دیا جائے ہم نے میدان مارلیااور اگرکسی صورت جماعت اسلامی اس مقدس تحریک کوسبوتاژ کر سکے تو پھر یہ اعلان کر دیا جائے کہ اس تحریک میں شامل ہونے والے بیوقوف تھے اور چلانے والے خودغرض اور غدار تھے۔ اس دوذہنی نے جماعت اسلامی اور اُس کے امیر کو دین اور دنیا دونوں میں کہیں کا نہ رکھا۔"[1]

ماسٹر تاج الدین انصاری آگے لکھتے ہیں:

''۱۴،جنوری کو جماعت اسلامی نے موچی دروازہ لاہور میں جلسہ عام کیا۔اگر مولانا مودودی صاحب واقعی مجلس عمل آل مسلم پارٹیز کنونشن سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتے تھے تو ایمانداری سے اُن کا یہ فرض تھا کہ وہ جلسہ عام میں مسلمانوں کو اپنے ارادہ سے خبردار کرتے اور اُنہیں بتاتے کہ بدنیت اور خودغرض لوگ مقدس تحریک کے نام پر ملک اور ملت سے غداری کرنے والے ہیں۔لوگو خبردار ہوجاؤ......مگر......مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کیا فرمایا؟ مولانا موصوف نے مطالبات کو جائز قرار دیتے ہوئے حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر اِن مطالبات کو نہ مانا گیا تو ہندو مسلم فسادات کی یاد تازہ ہوجائے گی اور ذمہ داری گورنمنٹ پر ہوگی۔مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں بڑی ہوشیاری سے ہندو مسلم فساد کا ذکر اس انداز سے کیا کہ ہوسکے تو وہ ہماری پُرامن کوششوں کو ناکام بنادیں اور امن پسند قوم کا ذہن فسادات کی جانب منتقل کردیں۔کراچی کنونشن کے آخری اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا موصوف نے اپنے بیان میں جو یہ ارشاد فرمایا ہے کہ"دوسرا خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ اگر میں اِس وقت علیحدہ ہوجاؤں تو صرف اپنا ہی دامن اِس فتنہ سے بچالے جاؤں گا۔اسلام اور مسلمانوں کو جس خطرہ میں یہ لوگ مبتلا کرنا چاہتے ہیں اُس کو

---

[1] اشرف تحریر، میں مولانا عبدالستار خاں نیازی ص:۳۵۰، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور، جنوری ۱۹۹۱ء

روکنا اس طریقہ سے ممکن نہ ہوگا اس بناء پر میں نے کنونشن سے علیحدگی کا ارادہ ترک کردیا'' مولانا موصوف کس دل گردہ کے بزرگ ہیں جو ختم نبوت کی مقدس تحریک کو فتنہ کا نام دے رہے ہیں۔ یہ گستاخانہ جرأت تو مرزائیوں جیسے منہ پھٹ گروہ کو بھی آج تک نہ ہوئی تھی۔

ہر کس از دست دگر نالہ کند

سعدی از دست خویشتن فریاد

بہر حال مولانا موصوف کے اس بیان میں کوئی جان نہیں۔ تحریک میں شامل رہنے کی جو وجہ آج بیان فرمائی جارہی ہے یہ فسانہ اور محض افسانہ ہے۔ یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ مولانا خود اس تاک میں تھے کہ موقعہ ملے تو قوم کو اکسادیا جائے اور اپنا دامن حتی الوسع بچالیا جائے۔''[1]

اس مقام پر ماسٹر تاج الدین انصاری کے تجزیہ اور سید مودودی کے عدالتی بیان کو سامنے رکھنے سے جو تصویر بنتی ہے وہ مولانا مودودی اور اُن کی جماعت کی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء سے بے وفائی کو ہی نمایاں نہیں کرتی بلکہ اس منافقانہ حکمت عملی کو بھی سامنے لاتی ہے جو جماعت اور جماعتی قائدین کی ہمیشہ شناخت، خاصہ اور پہچان رہی ہے۔

اب آیئے چلتے ہیں منیر انکوائری رپورٹ کی جانب اور اُس اہم اقتباس پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی نفسیات اور قلبی کیفیات کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ اُنہوں نے اس مقدس تحریک کے اعلیٰ مقاصد کو نقصان پہنچانے اور نظام حکومت کو ناکام بنانے کیلئے فریب اور دروغ گوئی سے اس لیے کام لیا کہ کرسئ اقتدار تک پہنچنے کی راہ ہموار کی جاسکے۔ چنانچہ جسٹس منیر لکھتا ہے کہ:

''اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ جماعت اسلامی نے ڈائریکٹ ایکشن سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کیا ہو۔ اس کی نامنظوری ظاہر کی ہو یا اس کی مذمت کی ہو۔ محض

---

[1] اللہ وسایا، مولوی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۶۳۸-۶۳۹، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

جلوسوں کی ترتیب کے انداز کو یا بناوٹی جنازے نکالنے کو یا جلسوں میں تقریروں پر نعرے لگانے کو ناپسند کرنے کا یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ ڈائرکٹ ایکشن کی مذمت کی گئی تھی یا ان تدابیر کو ناواجب قرار دیا گیا تھا جو ۲۶ فروری کے اجلاس میں اِس اقدام کی تعمیل کیلئے طے ہوئی تھیں...... بلکہ اِس کے برعکس مولانا (مودودی) نے سرکشانہ رویہ اختیار کیا۔ تمام واقعات کا الزام حکومت پر عائد کیا اور فسادی عناصر کو "تشدد کا شکار" کہہ کر اُن سے عام ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کی گورنمنٹ ہاؤس میں اُنہوں نے جو رویہ اختیار کیا اُس کے متعلق جو شہادت پیش ہوئی ہے اُس سے ہم یہی اثر قبول کر سکتے ہیں کہ وہ پورے نظام حکومت کے انہدام کی توقع کر رہے تھے اور حکومت کی متوقع پریشانی اور حوالگی پر بغلیں بجا رہے تھے اور اگر اِس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھ لی جائے کہ جماعت اسلامی کا مقصد اقتدار حاصل کرنا ہے کیونکہ اِس کے خیال کے مطابق اللہ کی حاکمیت کے ماتحت مذہبی ادارت کے قیام کا مقصد حاصل کرنے کا موثر ترین ذریعہ یہی ہے تو اِس اَمر میں ذرا بھی شبہ باقی نہیں رہتا کہ جو کچھ ہو رہا تھا اُسے جماعت اسلامی کی پوری تائید وحمایت حاصل تھی۔ لہٰذا ڈائریکٹ ایکشن کی منظوری سے اور اُس پروگرام سے جو مجلس عمل نے کراچی میں ۲۶ فروری کو طے کیا تھا کہ گورنر جنرل اور وزیر اعظم پاکستان کی کوٹھیوں پر رضا کاروں کے دستے بھیجے جائیں اور مولانا ابوالحسنات کو تحریک کا پہلا ڈکٹیٹر (قائد) مقرر کیا جائے جو طبعی نتائج پیدا ہوئے اُن کی ذمہ داری جماعت پر بھی عائد ہوتی ہے۔"[1]

آگے جسٹس منیر ڈی ایس پی فردوس شاہ کے قتل کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے کردار پر اظہار تاسف کرتے ہیں اور اُنہیں بزدلی اور بددیانتی کا مرتکب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۲۷۱، ۲۷۰

"اس حادثے کے بعد بھی جماعت اسلامی نے نہ اظہار تاسف کیا، نہ اس وحشیانہ قتل کی مذمت میں ایک لفظ کہا۔ بلکہ اس کے برعکس جماعت کے بانی نے آگ اور خون کے اس ہولناک ہنگامے کے درمیان "قادیانی مسئلہ" کا بم پھینک دیا۔ ہمارے نزدیک جماعت کے ذہن کی کیفیت صحیح صحیح یہ تھی کہ...... وہ شروع سے آخر تک لوگوں کے سامنے اپنے حقیقی خیالات کا دلیرانہ اور دیانت دارانہ اعلان اس خوف کی وجہ سے نہ کرسکی کہ مبادا وہ عوام میں غیر ہر دلعزیز ہو جائے۔ لہٰذا وہ اپنی ذہنیت اور اپنے رویے کے اعتبار سے کسی دوسری سیاسی شخصیت یا انجمن سے مختلف نہ تھی۔"[1]

چنانچہ اسی تناظر میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری جماعت اسلامی کے قائد مولانا مودودی کے تحقیقاتی عدالت میں دیئے گئے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"کہ یہ ستم نہیں کہ ایک طرف مولانا مودودی تحریک ختم نبوت میں دوسرے علماء کے ساتھ رہے اور راست اقدام کی قرارداد کی تدوین میں شریک رہے، دوسری طرف تحقیقاتی عدالت میں اس تحریک میں شرکت سے صاف مکر گئے اور کہا کہ اس تحریک کی ذمہ داری مرزائیوں مرکزی حکومت اور اُن جماعتوں پر ہے جو اس تحریک سے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ اور مولانا مودودی نے بات یہاں تک نہیں رکھی بلکہ اس بیان میں یہ مطالبہ کیا کہ ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ شاہ صاحب نے کہا میں بھی چاہتا ہوں مقدمہ چلایا جائے تاکہ پتہ چل جائے کہ آج دستور اسلامی کے داعی کتنے جھوٹے ہیں اور ان کے پروپیگنڈے اور تحریک کی پوری بنیاد کس قدر کذب وافترا پر ہے۔"[2]

اُنھوں نے فیصل آباد میں ایک اجتماع سے خطاب میں مولانا مودودی کو اس حوالے سے مباہلے کی بھی دعوت دی اور کہا کہ:

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۲۷۱

[2] اللہ وسایا، مولوی تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء، جلد اول، ص: ۵۴، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، جولائی ۱۹۹۳ء

''مولانا مودودی کراچی کنونشن میں میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی موجودگی میں راست اقدام کا ریزولیشن پاس ہوا۔ مودودی صاحب تحریک میں شامل تھے اگر وہ کہتے ہیں کہ تحریک میں شامل نہیں تھا تو میں انہیں دعوت مباہلہ دیتا ہوں۔''[1]

فیصلہ آپ کیجئے!!!

جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ کا مجلہ ''ہم قدم'' جولائی ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں ''نوشتہ دیوار'' کے تحت لکھتا ہے:

''تحفظ ناموس رسالت کیلئے دو تحریکیں چلیں۔ ایک اپنوں کی ریشہ دوانیوں اور غلط حکمت عملی کے نتیجہ میں چند روز کے اندر المناک حادثات وواقعات کو جنم دے کر دم توڑ گئی۔''

مجلے کی تحریر میں بیان کردہ ''اپنوں کی ریشہ دوانیوں اور غلط حکمت عملی'' کا اشارہ کس جانب ہے؟ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، اس کا فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑ دیں۔

اعلان مجاہد ''ہزار خوف ہوں لیکن زباں ہو دل کی رفیق'' جبکہ سید مودودی کے طرز عمل کے برخلاف تحریک ختم نبوت کے قائد اول اور مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے صدر مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری نے انکوائری کورٹ میں بلاکسی ڈر وخوف بانگ دہل اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ہم تحریک ختم نبوت کے ذمہ دار ہیں'' ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ[2]

منیر انکوائری رپورٹ ''تبصرہ'' اور ''محاسبہ'' کے تناظر میں

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء جسے حکومتی سطح پر ''فسادات پنجاب'' کا نام دیا گیا، سے متعلق تحقیقات کیلئے ۱۹، جون ۱۹۵۳ء کو گورنر پنجاب نے جسٹس منیر اور جسٹس رستم کیانی پر مشتمل ایک

---

[1] اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۶۲۶، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

[2] اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص: ۶۳۶، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

تحقیقاتی عدالتی کمیشن قائم کیا۔ اس عدالتی کمیشن کے قیام کا مقصد ۶، مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں مارشل لاء کے نفاذ کی وجوہات، فسادات کے ذمہ داروں کا تعین اور اُن حفاظتی تدابیرو اقدامات کے کافی یا ناکافی ہونے کا جائزہ لینا تھا جو سول حکام نے فسادات کے تدارک کیلئے اختیار کیے تھے۔ [1] چنانچہ کمیشن کی کارروائی یکم جولائی ۱۹۵۳ء سے ۲۳، جنوری ۱۹۵۴ء تک جاری رہی۔

کمیشن نے کل ۱۱۷، اجلاس منعقد کیے جن میں ۹۲، اجلاس شہادتوں کی سماعت اور اندراج کیلئے مختص رہے۔ اس دوران عدالت نے تحریری بیانات کے ۳۶۰۰، صفحات اور شہادتوں کے ۲۷۰۰، صفحات بھی نوٹ کیے۔ جبکہ ۳۳۰، دستاویز الگ سے عدالت میں بطور حوالہ پیش کی گئیں جو کثیر التعداد کتابوں، کتابچوں، رسائل اور اخبارات کے علاوہ تھیں۔ اس کے علاوہ کافی تعداد میں خطوط بھی عدالت کو موصول ہوئے اور عدالت نے خفیہ اداروں کی رپورٹوں کو بھی اپنی تحقیقات میں پیش نظر رکھا۔ اس تحقیقاتی کمیشن کے روبرو مجلس عمل کی نمائندگی مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش درانی نے کی جبکہ مجلس احرار کی جانب سے مولوی مظہر علی اظہر پیش ہوئے اور جماعت اسلامی کی نمائندگی مسٹر سعید احمد ملک نے کی۔

تحقیقاتی عدالت نے قادیانی عقائد ونظریات سے آگاہی کیلئے قادیانی جماعت کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود کو بھی عدالت میں طلب کیا، جبکہ مسلمانوں کے مؤقف کی ترجمانی ممتاز علماء کرام نے کی۔ [2] حکومت پنجاب، صوبائی مسلم لیگ، مجلس احرار، مجلس عمل، جماعت اسلامی، صدر انجمن احمدیہ ربوہ اور احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کو فریق قرار دیتے ہوئے ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے تحریری بیانات عدالت میں داخل کریں۔ [3] جس پر حکومت پنجاب اور صوبائی مسلم لیگ کے سوا باقی تمام فریقوں نے اپنے مفصل بیانات عدالت میں جمع کرائے۔

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۲

[2] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۶

[3] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۳

حکومت پنجاب نے صرف ایک سطری بیان عدالت میں جمع کرایا کہ "حکومت کا اِس معاملے کے متعلق کوئی نقطہ نگاہ نہیں۔"[1]

جبکہ پنجاب مسلم لیگ کے تحریری بیان کو عدالت نے مایوس کن قرار دیا۔اور مانا کہ ڈائرکٹ ایکشن کی تحریک کے خلاف مسلم لیگ نے کوئی اصولی اور نظریاتی مزاحمت نہیں کی۔ بلکہ متعدد اضلاع میں لیگ کے عہدہ دار خود بھی اس عمل میں نمایاں رہے۔[2] یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ مولانا عبدالستار خان نیازی کی فریق بننے کی درخواست عدالت نے منظور نہ کی تاہم اُنہیں بھی سو صفحات پر مشتمل اپنا تحریری بیان جمع کرانے کی اجازت دی گئی۔[3]

عدالت نے خواجہ ناظم الدین (وزیر اعظم)، مسٹر آئی آئی چندریگر (گورنر پنجاب)، سردار عبدالرب نشتر (وزیر مرکزی کابینہ)، چوہدری ظفر اللہ خاں (وزیر خارجہ)، سردار بہادر خاں (وزیر مواصلات)، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (وزیر اطلاعات ونشریات) اور مشتاق احمد گورمانی (وزیر داخلہ) کو بھی طلب کیا اور بند کمرے میں ان کے بیانات قلم بند کیے۔[4] عدالت نے خفیہ اداروں اور اہم سرکاری افسران کے علاوہ میجر جنرل محمد اعظم خان آفیسر کمانڈنگ دہم ڈویژن (جنہوں نے بذاتِ خود اپنے آپ کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر لیا تھا) کو بھی طلب کر کے مارشل لاء کے نفاذ کی وجوہات جاننا چاہیں۔[5] جبکہ وزیر اعلیٰ پنجاب ممتاز دولتانہ نے ایک گواہ کی حیثیت سے عدالت میں اپنا بیان نوٹ کرایا۔[6]

تحقیقاتی عدالت نے یکم فروری تا ۲۸ فروری ۱۹۵۳ء تک مقدمے پر بحث کے بعد

---

1. رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص:۵
2. رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص:۶
3. رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص:۵
4. رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص:۶
5. رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص:۵
6. رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص:۶

۳۹۷ صفحات پر مشتمل ایک انگریزی رپورٹ

Report of the Court of Inquiry

Constituted Under Punjab Act II of 1954

to Enquire into the Punjab Disturbances of 1953

یعنی "رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے تحقیقاتِ فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء" کے نام سے حکومت پنجاب کو پیش کی۔ اس رپورٹ کا اردو ترجمہ ۴۲۵ صفحات پر مشتمل ہے جو "منیر انکوائری رپورٹ" کے نام سے مشہور ہوا۔ چونکہ حکومت پنجاب کا اِس معاملے میں اپنا کوئی نقطہ نگاہ نہ تھا اس لیے یہ تحقیقات کسی خاص اور معین فرد یا جماعت کے خلاف نہ ہونے کی وجہ سے عمومی نوعیت کی تھیں۔ [1] اِس تحقیقاتی رپورٹ میں بہت سے تاریخی واقعات کو نہ صرف مسخ کیا گیا بلکہ حقائق پر پردہ ڈالنے اور علماء کے کردار کو مطعون کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔

رپورٹ کا اجمالی جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ کمیشن نے اپنے اختیارات اور سپرد کردہ تینوں معاملات تک ہی اپنی تحقیقات کو محدود نہیں رکھا بلکہ بہت سے دوسرے معاملات مثلاً "آل مسلم پارٹیز کنونشن کے مطالبات، اسلامی ریاست، جمہوریت، نمائندہ حکومت اور نفاذ قانون واستحفاذ آئین" وغیرہ پر بحث کے ساتھ ساتھ اُن علمی، دینی اور نظریاتی حیثیت کے مسائل ونکات جیسے" مسلم ومومن کی تعریف، مسئلہ قتل مرتد، مسئلہ جہاد، مسئلہ مال غنیمت وخمس، لہو ولعب اور اسلام، آرٹ اور اسلام، بین الاقوامی قوانین ومجالس اور اسلام اور حدیث وسنت" وغیرہ پر بھی تبصرہ آرائی اور خامہ فرسائی کی جو اس کے متعین کردہ دائرہ کار میں شامل نہیں تھے۔

رپورٹ کے ابتدائی سو صفحات سے یہ بات واضح اور عیاں ہے کہ فوج، بیوروکریسی، انتظامیہ اور حکومت کے اہم عہدوں پر فائز قادیانیوں کی وجہ سے اُن کے ہر جائز وناجائز فعل کو تحفظ فراہم کرنے کیلئے سخت قدم اٹھایا گیا اور قادیانیوں کے خلاف زبان کھولنے اور تقاریر کرنے کے الزام میں متعدد علماء پر مقدمات بھی قائم کیے گئے۔ حکومت نے ظفر اللہ خان قادیانی کی

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص:۲

برطرفی کا مطالبہ دبانے اور قادیانیوں کے خلاف احتجاج روکنے کی غرض سے ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ مساجد کے اندر دفعہ ۱۴۴ نافذ کی اور قادیانیوں کے خلاف جلسے جلوس کے انعقاد پر بھی سخت پابندیاں عائد کی گئیں۔ جبکہ وزیر خارجہ کے خلاف قادیانی جلسوں میں شرکت اور مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ کرنے پر نا صرف تادیبی کارروائی سے گریز کیا گیا بلکہ قادیانی جلسوں کو سرکاری پروٹوکول اور حکومتی سرپرستی بھی مہیا کی گئی جس پر حکومتی ذمہ داران کی خاموشی رضامندانہ کیفیت کی عکاس تھی۔

تحقیقاتی عدالت نے یہ بھی تسلیم کیا کہ حکومت پنجاب فسادات کے سدباب اور امن و آئین کی حفاظت کے فرض کی کماحقہ بجا آوری سے قاصر رہی اور میاں ممتاز دولتانہ کی حکومت نے چشم پوشی و رعایت سے ہی کام نہیں لیا بلکہ اُن کا اخبار ''آفاق'' اِس تنازع کو بھڑکانے میں سرگرمی سے ملوث رہا۔[1] عدالت نے خواجہ ناظم الدین اور مرکزی حکومت کو بھی اس وجہ سے مورد الزام ٹھہرایا اور لکھا کہ مرکزی حکومت کو اپنے موقف و مقام کے متعلق پورا تیقن نہ تھا اور وہ ایسے اقدام کو اپنے آپ سے منسوب ہونا پسند نہ کرتی تھی جو بعد میں غیر مقبول اور ناپسندیدہ قرار پائے۔ اور یہ کہ مرکزی حکومت کئی مہینوں تک عدم فیصلہ، تامل اور تذبذب کی جس پالیسی پر کاربند رہی اُس کا اثر صوبے کی صورت حال پر پڑا۔

عدالت نے یہ بھی لکھا کہ مرکزی حکومت نے بیرون ممالک چہ میگوئیوں اور ہندوستان کو پاکستان کے بدنام کرنے کے خوف سے قادیانی وزیر خارجہ کی برطرفی کے مطالبے کو مسترد کر کے عوامی ہیجان کو بڑھاوا دیا۔[2] اور عوام کے سادہ سے مطالبات منظور کرنے کے بجائے ملک کو ایسے خطرات میں ڈالنا گوارا کر لیا جو مارشل لاء کے نفاذ پر منتج ہوئے۔ اگر خدانخواستہ مارشل لاء بھی امن و آئین کے قیام و تحفظ میں ناکام ہو جاتا تو نہ معلوم پاکستان کا حشر کیا ہوتا!!۔

---

[1] پروفیسر محمد سرور (ایڈیٹر آفاق) کے بیان کے مطابق ''آفاق'' ممتاز دولتانہ کا اخبار تھا۔ دیکھئے رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۸۴

[2] ایضاً، ص: ۲۵۱، ۲۵۲، ۳۰۴

عدالت نے مجلس عمل میں شامل تمام مذہبی جماعتوں، انجمنوں اور تنظیموں پر جو راست اقدام کی قرارداد کی منظوری میں شریک تھیں، فسادات کی ذمہ داری عائد کی۔[1] لیکن ساتھ ہی اس امر کو بھی تسلیم کیا کہ جس مقصد کیلئے تحریک اُٹھائی گئی تھی، وہ خالصتاً دینی تھا۔ مطالبات بظاہر بہت معقول صورت میں پیش کیے گئے تھے۔[2] عدالت نے لکھا کہ بلاشبہ خواجہ صاحب ان مطالبات کو تسلیم کر سکتے تھے یا شخصی طور پر ان کی حمایت کا وعدہ کر سکتے تھے۔ اس حالت میں کوئی گڑبڑ پیش نہ آتی۔[3] یعنی اگر علماء کے اِن مطالبات کو مان لیا جاتا تو فساد برپا نہ ہوتا۔

جبکہ مجلس عمل میں شامل جماعت اسلامی کے بارے میں عدالت کا کہنا تھا کہ:

''جماعت مسلم لیگ کے تصورِ پاکستان کی علی الاعلان مخالف تھی۔ اور جب سے پاکستان قائم ہوا ہے جس کو ''ناپاکستان'' کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جماعت موجودہ نظام حکومت اور اِس کو چلانے والوں کی مخالفت کر رہی ہے۔ ہمارے سامنے جماعت کی جو تحریریں پیش کی گئی ہیں اُن میں سے ایک بھی نہیں جس میں مطالبہ پاکستان کی حمایت کا بعید سا اشارہ بھی موجود ہو..... تمام کی تمام اِس شکل کی مخالف ہیں جس میں پاکستان وجود میں آیا اور جس میں اب تک موجود ہے...... جماعت کا عقیدہ اور مقصد یہ ہے کہ نظامِ حکومت کو توڑ کر جماعت اسلامی کے تصور کے مطابق حکومت قائم کی جائے۔''[4]

عدالت نے دوران انکوائری جماعت اسلامی کے اختیار کردہ موقف اور خود کو راست اقدام اور فسادات سے بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کا بھی سختی سے رد کیا اور لکھا کہ فسادات کی ذمہ داری سے جماعت اسلامی کا دامن پاک نہیں ہے۔ چنانچہ عدالت اپنی انکوائری رپورٹ کے صفحہ ۲۷۲، پر لکھتی ہے کہ:

---

1. ایضاً: ص ۲۶۰
2. ایضاً: ص ۲۵۴
3. ایضاً: ص ۳۰۳
4. ایضاً: ص: ۲۶۱، ۲۶۲

''وہ (جماعت اسلامی) ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد میں ایک فریق کی حیثیت رکھتی تھی۔اور مجلس عمل کے اجلاس مورخہ ۲۶.فروری میں جماعت کا نمائندہ اس قرارداد میں شریک تھا کہ رضاکاروں کے دستے بھیجے جائیں اور اقدامات کے اجراء کیلئے ایک ڈکٹیٹر مقرر کیا جائے۔لہٰذا موجودہ تحقیقات میں اس نکتے کی کوئی حیثیت نہیں۔''

عدالت نے جماعت سے دو افراد کے اخراج کے حوالے سے مزید لکھا کہ''میانوالی کے غلام صدیق اور سرگودھا کے سید احمد شاہ جماعت سے اُس وقت خارج کیے گئے جب مارشل لاء کے نفاذ پر خاصی مدت گزر چکی تھی۔لہٰذا اس اخراج سے جماعت کے موقف کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا.....(عدالت کا کہنا تھا کہ) گوجرانوالہ اور راولپنڈی کے پولیس سپرنٹنڈنٹوں نے بھی اپنی رپورٹوں میں ارکانِ جماعت اسلامی کی اُن سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے جو اُنہوں نے دوران فسادات اختیار کی تھیں۔

ہنگامہ آرائی اور فسادات میں جماعت اسلامی کے ملوث ہونے کے حوالے سے عدالت کا کہنا تھا کہ:''جماعت اسلامی کی جاری کردہ ہدایات میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے ظاہر ہوسکے کہ جماعت ڈائرکٹ ایکشن کے پروگرام کی حامی یا موید نہیں ہے.....جماعت اسلامی ڈائرکٹ ایکشن کے فیصلے میں سنجیدگی سے شامل تھی.....اِس اَمر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ جماعت نے ڈائرکٹ ایکشن سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کیا ہو۔اُس کی نامنظوری ظاہر کی ہو یا اُس کی مذمت کی ہو۔محض جلوسوں کی ترتیب کے انداز کو یا بناوٹی جنازے نکالنے کو یا جلسوں میں تقریروں پر نعرے لگانے کو ناپسند کرنے کا یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ ڈائرکٹ ایکشن کی مذمت کی گئی تھی یا اُن تدابیر کو ناواجب قرار دیا گیا تھا جو ۲۶.فروری کے اجلاس میں اس اقدام کی تعمیل کیلئے ہوئی تھیں۔''[1]

جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا ابواعلیٰ مودودی کے بارے میں عدالت کی رائے تھی کہ:

---

[1] ایضاً:ص: ۲۷۰،۲۷۱

"مولانا نے سرکشانہ رویہ اختیار کیا۔(انہوں نے) تمام واقعات کا الزام حکومت پر عائد کیا اور فسادی عناصر کو "تشدد" کا شکار کہہ کر اُن سے عام ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کی.....وہ پورے نظامِ حکومت کے انہدام کی توقع کر رہے تھے اور حکومت کی متوقع پریشانی اور حوالگی پر بغلیں بجا رہے تھے۔اور اگر اِس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھ لی جائے کہ جماعت اسلامی کا مقصد اقتدار حاصل کرنا ہے۔کیونکہ اُس کے خیال کے مطابق اللہ کی حاکمیت کے ماتحت مذہبی ادارت کے قیام کا مقصد حاصل کرنے کا موثر ترین ذریعہ یہی ہے تو اِس اَمر میں ذرا بھی شبہ باقی نہیں رہتا کہ جو کچھ ہو رہا تھا اُسے جماعت اسلامی کی پوری تائید وحمایت حاصل تھی۔لہٰذا ڈائرکٹ ایکشن کی منظوری سے اور اُس کے پروگرام سے.....جو طبعی نتائج پیدا ہوئے اُن کی ذمہ داری جماعت پر بھی عائد ہوتی ہے۔"[1]

اِس کے ساتھ تحقیقاتی عدالت نے مجلس احرار اور اُس کے لیڈروں کو فسادات کی کیفیت پیدا کرنے کا اوّلین ذمہ دار قرار دیا۔اور لکھا کہ احرار نے اِس مذہبی معاملے کو عوام میں اپنی ہردلعزیزی کا ذریعہ بنایا۔عدالت نے احرار کو اُس قوم پرست مسلمانوں کی ٹولی سے بھی تشبیہ دی،جس نے کانگریس سے علیحدگی اور مجلس احرار اسلام کی شکل اختیار کرنے کے باوجود تقسیم کے بعد بھی کانگریس سے ساز باز جاری رکھی۔عدالت نے احرار کے قائداعظم محمد علی جناح اور پاکستان دشمن ماضی کو بھی دہرایا اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ بعض احراری لیڈروں نے اپنی تقریروں میں پاکستان کو "پلیدستان" اور قائداعظم کو "کافرِ اعظم" تک کہا۔[2]

تحقیقاتی عدالت نے احراری نفسیات اور طریقہ واردات کو واضح کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ:

"نئی مملکت میں اُن کیلئے اپنی پرانی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں (تھی) لیکن احراری اِس مٹی کے بنے ہوئے نہ تھے۔وہ پرانے باراں دیدہ

1۔ ایضاً:ص ۲۷۱

2۔ ایضاً:ص:۱۰،۱۱

شورش پسند تھے۔جن کو اپنی مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں اضافہ کرنے کیلئے بڑی بڑی مہمیں چلانے اور ہنگامے برپا کرنے کا تجربہ حاصل تھا۔چنانچہ اُنہوں نے ایسے طریقوں پر غور وخوض شروع کردیا جن سے کام لے کر وہ نئے ماحول میں اپنی سرگرمیوں کیلئے مخرج پیدا کرسکیں۔کسی موجودہ شورش سے فائدہ اٹھانا کسی نئی شورش کی تخلیق کے مقابلے میں دوسرے درجے کی چال ہے......احراریوں نے اپنی ہستی کا ثبوت دینے اور جماعت کی حیثیت سے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کیلئے اسی چال سے کام لیا۔"[1]

منیر انکوائری رپورٹ کے مطابق احراری سیاسی طور پر انتہائی فہیم اور چالاک تھے۔اور مجلس عمل میں اپنے حصہ سے زیادہ نمائندگی حاصل ہونے کی وجہ سے اُس کی کارروائیوں پر بھی اُنہی کا غلبہ تھا۔چنانچہ ۱۵،جولائی ۱۹۵۲ءکو روزنامہ" آفاق" میں شائع ہونے والے ایک مضمون سے عدالت کے اِس موقف کی مکمل تائید ہوئی ہے جس میں مضمون نگار لکھتا ہے کہ:

"احراری کنونشن کی پوری کارروائی پر حاوی رہے اور کنونشن میں جو پندرہ قراردادیں منظور ہوئیں اُن میں سے بعض کا مقصد احرار کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے سوا کچھ نہ تھا۔"

اسی اشاعت میں شامل ایک اور مضمون میں بعض منظور شدہ قراردادوں پر سخت تنقید کے بعد اِس خدشہ کا اظہار بھی کیا گیا کہ:"اِس تحریک کو بعض رہنماؤں کی حماقت اور خود غرضی سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بعض ناکام سیاست دان اور پاکستان کے پرانے مخالف صرف اپنے مقاصد کی تکمیل میں کوشاں ہیں اور علمائے دین کی مقدس قباؤں کے سائے میں اپنے کھوئے ہوئے سیاسی اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔"[2]

اسی مضمون میں تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے قائد مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کے اُس بیان کا بھی حوالہ دیا گیا جس میں آپ نے اِس عزم کا اظہار کیا تھا کہ:

---

[1] ایضاً:ص ۱۳

[2] ایضاً:ص:۸۶

''میں کسی جماعت کو اِس اَمر کی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ اپنے سیاسی مقاصد کیلئے مذہب کو استعمال کرے۔اور جولوگ خلاف ورزیٔ قانون کی حمایت کریں گے اُن کو میرا تعاون حاصل نہ ہوگا۔''

اپنے اس بیان میں مولانا ابوالحسنات صاحب نے بدنظمی، لاقانونیت اور اشتعال انگیز تقریروں کی بھی سخت مخالفت کی تھی اور تحریکی وابستگان پر واضح کردیا کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ پُر امن اور آئین پسندانہ طریق سے ہی پیش کر کے کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔''[1]

واضح رہے کہ مولانا ابوالحسنات قادری کا یہ بیان ۱۰، جولائی ۱۹۵۲ء کو روزنامہ آفاق میں شائع ہوا تھا۔مگر اخبارات کی تنبیہ اور مولانا ابوالحسنات قادری کے بروقت انتباہ کے باوجود آل مسلم پارٹیز کنونشن کی کارروائی میں احراریوں نے اپنی عددی برتری اور غلبہ سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔اُنہوں نے عوامی جذبات کو مشتعل و برانگیختہ کرنے میں کوئی کسر اُٹھانہ رکھی اور قادیانیوں کے خلاف پُر امن مذہبی تحریک کو پُر تشدد ہنگامہ آرائی اور سول نافرمانی سے بدل دیا۔چنانچہ جسٹس منیر نے لکھا:

''سول بغاوت کا سارا سرو سامان احرار ہی کا کیا دھرا تھا......اُن کا طرزِ عمل بطور خاص مکروہ اور قابل نفرین تھا۔اِس لیے کہ اُنہوں نے ایک دنیاوی مقصد کیلئے ایک مذہبی مسئلے کو استعمال کر کے اِس مسئلے کی توہین کی اور اپنے ذاتی اغراض کی تکمیل کیلئے عوام کے مذہبی جذبات وحسیّات سے فائدہ اٹھایا۔''[2]

درحقیقت احراریوں کی تمام تر سرگرمیوں کا مقصد ہر دل عزیزی اور عوام میں مقبول عام ہونے کی خواہش تھی۔اُنہوں نے اس مذہبی معاملے کو اپنے سیاسی مقاصد کیلئے استعمال کیا۔اور اِس کی آڑ میں خوب چندہ جمع کیا۔عدالت کے بقول وہ جس قدر زیادہ زہر افشانی

---

[1] ایضاً:ص ۸۶

[2] ایضاً:ص: ۲۷۷، ۲۷۸

کرتے چندہ بھی انہیں اتنا ہی زیادہ ملتا۔ جس سے اُن کی مالی حیثیت مستحکم ہوگئی۔ اُنہیں بعض دولت مند مربی بھی حاصل تھے۔ جن میں زیادہ فیاضی سے امداد کرنے والوں میں نوابزادہ نصر اللہ خان (ایم ایل اے ضلع مظفر گڑھ) حاجی دین محمد (بادامی باغ لاہور مالک کارخانہ) میاں قمر الدین (رئیس اچھرہ لاہور) رانا غلام صابر (ایم ایل اے اوکاڑہ) قابل ذکر ہیں۔ [1]

چنانچہ مولانا غلام معین الدین نعیمی کی زیر ادارت شائع ہونے والے ہفت روزہ ''سواد اعظم'' لاہور نے احرار کی مالی بددیانتی اور چندہ خوری کو بے نقاب کرتے ہوئے اُسے خائن اور غادر (دھوکہ باز) جماعت قرار دیا۔ اور اپنے تاریخی اداریہ میں یہ مطالبہ بھی کیا کہ وہ تحریک ختم نبوت کے چندے کا نہ صرف حساب دے بلکہ جمع شدہ تمام رقم شہداء ختم نبوت کے وارثوں میں تقسیم کر کے عملی ہمدردی کا بھی ثبوت دے۔ اِس حوالے سے سواد اعظم اپنے اداریہ میں لکھتا ہے کہ:

''قطع نظر اُن کی سیاسی چالاکیوں اور ملکی شعبدہ بازیوں کے احرار ایک خائن اور غادر پارٹی ہے۔ بڑے بڑے نعروں اور بلند بانگ ڈینگوں کے ساتھ متعدد تحریکیں اُٹھائیں اور سربراہی کی اور ملک وملت کی آنکھوں میں دھول جھونک کر خوب خوب چندہ جمع کیا اور دل کھول کر مل بانٹ کر کھایا پیا اور جب قوم نے کسی وقت میں مطالبہ کیا تو اُن کے بڑے بڑے جگادریوں نے علی الاعلان کہا کہ ''ہاں ہم نے کھایا اور خوب کھایا مگر قید وبند کی لعنت بھی تو جھیلی ہے۔'' غرض کہ ہر تحریک میں جس طرح چندہ جمع کرنے کا ریکارڈ قائم کیا اُسی طرح اُس چندہ کو ہضم کر کے ڈکار تک نہ لینے کا بھی ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں تحریک تحفظ ختم نبوت جیسے مقدس نام کی تحریک اُٹھائی، یہ نعرہ ہی ایسا تھا کہ مسلمان بہ حیثیت مسلم اِس نعرہ کی مخالفت نہیں کرسکتا۔ قوم نے اِس تحریک کی ہمنوائی کی، دل کھول کر رقمیں دیں، ہزاروں نہیں لاکھوں روپیہ جمع ہوا ٹکٹوں کے ذریعہ ہی نہیں، اجلاسوں میں عام چندے بھی ہوئے...... تقریباً ایک لاکھ صرف احرار

[1] ایضاً: ص ۵۲

کے لیڈر جس کو وہ" امیر شریعت" سے خطاب کرتے ہیں یعنی عطاء اللہ شاہ بخاری کے پاس جمع تھا۔ جب بخاری جیل میں ٹھونس دیے گئے تو اُن کے فرزند اس لاکھ روپے کو لے کر گھر سے اچانک غائب ہو گئے اور مجلس احرار کے مضبوط ترین قلعہ "عوامی لیگ" کے معتمد رہنما رانا نصر اللہ خاں صاحب کے یہاں پناہ گزیں ہو گئے اور جب تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں مارشل لاء وغیرہ جیسے قابل مذمت ونفرت حربے استعمال کیے گئے تو پولیس اور فوج ماخوذ و مشتبہ افراد کی تلاش میں پھرنے لگی، اُس وقت اِس مطلوبہ رقم کی بازیابی کیلئے بے حد کوشش کی گئی، جگہ جگہ چھاپے مارے گئے مگر مطلوبہ رقم کی درآمد میں پولیس ناکام رہی۔ جب یہ خبر جیل میں بخاری صاحب کو پہنچی تو اپنے خون جگر کی گمشدگی میں روتے رہے اور کئی مرتبہ معافی مانگ کر جیل سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ بالآخر مخصوص ذرائع سے بخاری صاحب کو یہ خبر پہنچائی گئی کہ آپ کے فرزند مع ایک لاکھ روپے کے ہر طرح بخیریت ہیں، جب کہیں جا کر بخاری صاحب کو اطمینان نصیب ہوا۔ جب پنجاب میں امن قائم ہوا اور اپنے وقت پر حکومت نے اپنے مخصوص مفاد کی خاطر یعنی بعض ہمدردوں کو رہا کیا تو بعض حضرات عام قانونی وضاحت کی بناء پر آل پارٹیز کنونشن کی مجلس عمل کے صدر اور بقول بخاری صاحب "صبر وتحمل کے پہاڑ" یعنی مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری بھی جیل سے باہر تشریف لائے۔ صدر مجلس عمل مولانا موصوف نے اپنی رہائی کے بعد اپنی ضعیفی اور پیرانہ سالی اور بیماری کی بناء پر عام ہمدردی ہونے کے باوجود ہر قربانی دینے کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے وقتی سکون چاہا اور اراکین مجلس عمل سے خواہش ظاہر کی کہ مجلس کا تمام روپیہ جو مختلف پارٹیوں یا لیبلوں کے ذریعہ جمع کیا گیا ہے، یک جا اکٹھا کر کے تمام روپیہ شہداء ختم نبوت کے وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ تاکہ آج تک جو کچھ ہم زبانی طور پر اُن سے ہمدردی کا اظہار کرتے رہے ہیں، اب اُس کو عملی طور پر بھی کر کے دکھایا جائے۔ مگر صدر مجلس عمل کی اِس خواہش پر تقریباً تمام ان لوگوں نے جو کہ پرانے چندہ خور اور چندہ اکٹھا کرنے کے

ماہر تھے، چُپ سادھ لی اور پھر اس طرف رُخ تک نہ کیا۔ اور صدر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے سے بھی اپنے آپ کو معذور سمجھا۔ اس طرح وہ تمام روپیہ شیر مادر کی طرح ہضم کر لیا۔ ان میں سے ایک بڑی رقم جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے تقریباً ایک لاکھ روپے کی ہے...... اس رقم کا جب اُن سے مطالبہ کیا گیا تو جواب دیا کہ یہ رقم تو "مجلس ختم نبوت" (جو کہ احرار کی ذیلی پارٹی تھی) کے نام سے جمع کی گئی تھی۔ آل پارٹیز کنونشن یا مجلس عمل کے نام سے یہ رقم نہیں ہے۔ اس طرح لفظی آڑ اور گورکھ دھندے کے ذریعہ صدر مجلس عمل کو جواب دے دیا۔ اُن کے اس جواب پر صدر مجلس عمل نے خدا اور رسول کا واسطہ دے کر اُن سب سے کہا کہ میں اس رقم کو ہاتھ لگانا حرام جانتا ہوں، آپ تمام رقم کو خود ہی اُن لوگوں پر جنہوں نے خدا و رسول کے نام پر اپنی جانیں قربان کی ہیں، جن عورتوں کے سہاگ لٹے ہیں، جن کے بچے یتیم ہوئے ہیں، جو بے وارث رہ گئے ہیں، تقسیم کر کے اُن کی جہاں تک زیادہ سے زیادہ مدد ہو سکے مدد کرو لیکن:

زمیں جدید سماء جدید ولے احرار از جانی جدید

اب جبکہ مجلس احرار قانونی حیثیت سے آزاد ہو چکی ہے، ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ختم نبوت کی تحریک کے تمام روپے کا حساب دے اور شہداء ختم نبوت کے ورثا کے ساتھ عملی ہمدردی کا ثبوت دے۔"[1]

تحقیقاتی عدالت نے قادیانیوں کی جارحانہ تبلیغ اور توسیع پسندانہ عزائم کو بھی دل آزار اور اشتعال انگیز قرار دیا اور اُنہیں فسادات کا بالواسطہ ذمہ دار ٹھہرایا۔ عدالت نے لکھا کہ اُن کے عقائد و معتقدات مسلمانوں کے معتقدات سے متغائر ہیں۔ اور یہ کہ مسلمانوں اور قادیانیوں کے درمیان مذہبی حیثیت سے اہم بنیادی اختلافات روز اوّل ہی سے موجود تھے اور ہیں۔ وہ جداگانہ جماعتی تنظیم رکھتے ہیں۔ اُن کے اپنے اُمور خارجہ، اُمور داخلہ اور اُمور عامہ کے محکمے اور

---

[1] ہفت روزہ سواد اعظم، ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء، اداریہ، مشمولہ مفتی غلام معین الدین نعیمی، حیات و خدمات، محمد ثاقب رضا قادری، ص: ۲۹۰۔ ۲۸۸، دار النعمان پبلیشرز غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور، جولائی ۲۰۱۸ء۔

نشر و تبلیغ کے شعبے ہیں۔ وہ مسلمانوں سے رشتے ناطے کا تعلق نہیں رکھتے اور مسلمانوں کے ساتھ نماز بھی نہیں پڑھتے۔ چونکہ وہ مرزا کے نبی ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اِس لیے (عدالت نے اُنہیں مشورہ دیتے ہوئے لکھا کہ) وہ "مسلمان" کے بجائے "احمدی، قادیانی یا مرزائی" کی اصطلاح استعمال کریں۔[1]

تحقیقاتی عدالت نے یہ بھی لکھا کہ قادیانی تقسیم سے قبل برطانیہ کا جانشین بننے کا خواب دیکھ رہے تھے اور وہ ملکی تقسیم کے خلاف تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُنہوں نے بلوچستان کو مرزائی صوبہ بنانے کی کوشش کی۔ اور قادیانی افسران و ملازم نے ارتداد پھیلانے کے معرکے میں پوری تندہی اور دل جمعی کے ساتھ حصہ لیا۔ وہ لوگوں کا مذہب و عقیدہ تبدیل کراتے رہے اور مرتد بنانے کی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ بقولِ عدالت:

"قادیانی افسروں نے لوگوں کو قادیانی بنانے کی مہم میں از سرتاپا مصروف ہو جانا اپنا مذہبی فریضہ خیال کیا۔ اُن کے اِس رویے کی وجہ سے قادیانیوں کو اِس اَمر کا حوصلہ ہوا کہ جہاں کہیں اُنہیں افسروں کی حمایت حاصل تھی یا حاصل ہونے کی توقع تھی وہاں اپنے مقصد کے حصول میں زور و شور سے مصروف ہو گئے۔"[2]

اُن کی اِس روش نے قادیانیوں کے حوصلے بڑھائے۔ اور اُنہوں نے اپنے مقاصد کے حصول کیلئے زیادہ تندہی سے کام کیا۔ عدالت نے قادیانیوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے اِس اَمر پر بھی مہرِ تصدیق ثبت کی کہ "اُن کے خلاف عام شورش کا موقع خود انہی کے طرزِ عمل نے بہم پہنچایا۔"[3] عدالت نے یہ بھی لکھا کہ قادیانیوں کا:

"پروپیگنڈا صرف پاکستان تک محدود نہیں اور الفضل کی بعض شائع کردہ رپورٹوں سے

---

[1] ایضاً: ص ۲۱۱،۸

[2] ہفت روزہ سوادِ اعظم، ۱۰، اکتوبر ۱۹۵۸ء، اداریہ، مشمولہ مفتی غلام معین الدین نعیمی، حیات و خدمات، محمد ثاقب رضا قادری، ص: ۲۸۰، دار النعمان پبلیشرز غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور، جولائی ۲۰۱۸ء

[3] ایضاً: ص ۲۸۱،۲۸۰

معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے ملکوں میں جو قادیانی مقرر ہیں اُن کی تبلیغ پر بھی بعض اوقات مار پیٹ اور بدنظمی رونما ہوگئی ہے۔"[1]

اگست ۱۹۵۴ء میں مجلس عمل کے وکیل اور ممتاز صحافی و مورخ مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش درانی نے "محاسبہ" یعنی عدالت تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء کی رپورٹ پر ایک جامع اور بلیغ تبصرہ" کے عنوان سے تحریر کیا۔ جو سب سے پہلے روزنامہ "نوائے پاکستان" کے خاص رپورٹ نمبر مورخہ ۲۹، اگست ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔

جبکہ جنوری ۱۹۵۵ء میں جماعت اسلامی نے تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ پر "تبصرہ" کے عنوان سے اپنے موقف کا اظہار کیا۔ ۲۰۸ صفحات پر مشتمل اس کتابچہ کو نعیم صدیقی اور سعید احمد ملک نے ترتیب دیا۔ اور جسے جماعت اسلامی نے "مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ لاہور" سے شائع کیا۔ خیال رہے کہ یہ "تبصرہ" اپنے معنوی اعتبار سے نقد و نظر، تنقید اور اُن الزامات کی توضیح و تشریح کا مجموعہ تھا جو تحقیقاتی عدالت نے جماعت اسلامی اور اُس کے سربراہ پر عائد کیے تھے۔

جماعت اسلامی کا یہ "تبصرہ" تین حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول اُن تین معاملات سے متعلق ہے جن کی تحقیق عدالت کے سپرد کی گئی تھی۔ دوسرے حصے میں اُن مباحث پر گفتگو کی گئی جو اگرچہ سپرد کردہ معاملات کی حدود میں نہیں آتے تھے تاہم رپورٹ میں قلم بند کیے گئے۔ جبکہ تیسرے حصے میں یہ جائزہ لیا گیا کہ رپورٹ نے اصل مسئلے جس کی وجہ سے پنجاب میں اتنے بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے کا حل بھی پیش کیا یا مزید اُلجھا کر رکھ دیا۔

گو جماعت نے عدالتی فیصلے پر اپنی رائے دینے سے یہ کہہ کر گریز کیا کہ:

"رپورٹ کے اِس پہلو پر کوئی بحث نہیں کی جائے گی کہ سپرد کردہ معاملات کے متعلق عدالت نے جو فیصلے دیے ہیں اُن میں کوئی خامی ہے یا نہیں اور ہے تو وہ کیا

---

[1] ایضاً، ص ۲۱۳

ہے۔"[1]

لیکن اِس کے باوجود اُس نے اِن مباحث کے ساتھ وہ معاملات جو عدالت کی حدود میں نہیں آتے لیکن رپورٹ میں تحریر کیے گئے اور یہ کہ" پنجاب میں برپا ہونے والے ہنگاموں کے اصل مسئلہ کو رپورٹ نے کچھ سلجھایا یا گول مول چھوڑ دیا"[2] پر" تبصرہ" کے دوسرے اور تیسرے حصہ میں بہت زیادہ زور دیا۔

جماعت اسلامی نے" تبصرہ" سب سے پہلے فسادات کی وجوہات کے بارے تحقیق کے لئے اختیار کردہ طریقہ کار پر سخت تنقید اور اعتراض اٹھایا اور اسے ۱۹۱۹ء کے ہنگاموں کی تحقیقات کیلئے اختیار کیے گئے طریقہ کار کے مقابلے میں ناقابل اطمینان اور غیر منصفانہ قرار دیا۔ جماعت کے نزدیک" وہ قانون جس کے تحت یہ تحقیقات کرائی گئیں تھیں سراسر غلط اور ناروا تھا۔"[3]

اُس کا موقف تھا کہ ۱۹۱۹ء میں (رولٹ ایکٹ کی منظوری اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو و ڈاکٹر ستیہ پال کی گرفتاری سے) پنجاب ہونے والے زبردست ہنگاموں کو دبانے کیلئے صوبے کے کئی اضلاع میں مارشل لاء لگایا گیا تھا مگر اُس وقت اِن ہنگاموں کی تحقیقات کیلئے بیرونی حکومت نے جو طریقہ کار اختیار کیا تھا وہ کم از کم موجودہ قومی حکومت کے طریقہ کار سے قدرے بہتر، زیادہ منصفانہ اور قابل اطمینان تھا۔

جماعت کا یہ بھی کہنا تھا کہ ۱۹۱۹ء میں تحقیقات کیلئے جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی وہ صرف ملازمین ریاست ہی پر مشتمل نہ تھی بلکہ اُس میں تین غیر سرکاری ہندوستانی ممبر بھی شامل تھے جس کا فائدہ یہ ہوا کہ واقعات کے تمام پہلو سامنے آگئے۔ اور ایک ایسی رپورٹ شائع ہوئی جو صرف ایک ہی نقطہ نظر کی حامل نہ تھی۔ اِس کے برعکس ۱۹۵۳ء کے ہنگاموں کی تحقیقات کیلئے کمیٹی کے بجائے

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ پر تبصرہ، مرتبہ نعیم صدیقی وسعید احمد ملک، ص: ۱۵، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ لاہور، جنوری ۱۹۵۵ء

[2] ایضاً، ص ۱۳، ۱۴

[3] ایضاً، ص: ۱۰

غیر سرکاری نمائندگی سے محروم ایک ایسا عدالتی کمیشن قائم کیا گیا جسے پورے عدالتی حقوق و اختیار کے ساتھ توہین عدالت کے قانون کا تحفظ بھی حاصل تھا۔ اور اِسے عام قانون شہادت کے تقاضوں سے بالاتر رکھا گیا۔[1]

جماعت اسلامی کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ عدالت نے نتائج اخذ کرنے اور فیصلہ دینے میں ''اُن سرکاری اطلاعات پر انحصار کیا ہے جو کہ زیادہ تر سرکاری افسران اور سی آئی ڈی نے مختلف جماعتوں اور اشخاص سے متعلق دی تھیں۔ اور ''جو قطعی طور پر خلاف واقعہ ہیں۔''[2] جماعت نے تحقیقاتی عدالت کے ججز کو بھی اِس اَمر کا ذمہ دار ٹھہرایا کہ اُنہوں نے اِن رپورٹوں کی صداقت جاننے کی کوشش نہیں۔ چنانچہ اِس حوالے سے جماعت نے لکھا کہ:

''بدقسمتی سے رپورٹ کے ''فاضل مصنفین کی توجہ اِن سرکاری اطلاعات کی جانچ پرکھ کی طرف منعطف نہ ہو سکی۔''[3]

جماعت اسلامی نے اپنے ''تبصرہ'' میں تحقیقاتی عدالت کو ایک ایسے کمیشن کا درجہ دیا جس نے ایک متعین معاملے میں اپنا کام کرنے کے بعد اپنا وجود کھو دیا۔ اُس نے لکھا کہ:

''حقیقت میں یہ عدالت ایک کمیشن کی سی حیثیت رکھتی تھی جس نے ایک متعین معاملے میں اپنا کام کیا اور خود بخود ختم ہو گیا۔ اب ایک مستقل عدالت کی طرح اِس کا وجود باقی نہیں۔''[4]

جماعت نے تحقیقاتی عدالت کے مرتب کردہ نتائج کو عدالتی فیصلہ تسلیم کرنے سے بھی انکار کیا۔ اور اُس نے اِسے محض ایک رپورٹ کا درجہ دیتے ہوئے لکھا کہ ''اِس رپورٹ کو بھی ایک علمی کام سمجھا جانا چاہیے۔''[5] لیکن تعجب خیز اَمر یہ ہے کہ منیر انکوائری رپورٹ کو ایک علمی کام کا درجہ دینے

---

[1] ایضاً: ص ۱۰
[2] ایضاً: ص: ۱۵، ۱۶
[3] ایضاً: ص ۱۹
[4] ایضاً: ص ۱۱
[5] ایضاً: ص ۱۳

کے باوجود جماعت نے اُس پر شدید تنقید اور نکتہ چینی کی۔ اِسے بد دیانتی، طنز، تضاد اور من گھڑت واقعات کا مجموعہ جیسے الفاظوں سے نوازا۔ اور اِس حوالے سے "تبصرۃ" میں لکھا کہ یہ:

"سراسر ایک من گھڑت افسانہ ہے۔ جس میں صداقت کا شائبہ تک نہیں۔"[1] "رپورٹ کے انداز بیان میں طنز کا اسلوب دل کھول کر استعمال کیا گیا۔"[2] "طنزیات سے رپورٹ کا دامن مالا مال ہے"[3] "لوگوں کی نیتوں کے خلاف اظہار رائے کیا گیا"[4] "کچھ مواقع ایسے بھی آتے ہیں جہاں پڑھنے والوں کو بعض اصحاب کی عزت پر بھی زد پڑتی محسوس ہوتی ہے۔"[5] اور یہ کہ "رپورٹ کے اندر متعدد ایسے نظریات وخیالات بھی درج ملتے ہیں جن کو ایک متوسط ذہن کا آدمی بھی باہم دگر متضاد محسوس کر سکتا ہے اور ان کے بے جوڑ پن کو کسی تاویل سے رفع کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔"[6]

جماعت اسلامی کا حیرت انگیز طرز عمل دیکھئے کہ انکوائری رپورٹ کے مندرجات کو باہم متضاد اور کسی تاویل سے رفع نہ ہونے والے واقعات کا مجموعہ قرار دے کر مسترد کرنے کے باوجود اُس نے اپنے مسلک وعقیدے، قیام پاکستان کی مخالفت، پاکستان کو ناپاکستان کہنے، موجودہ نظام مملکت کی بساط الٹ کر اپنے تصور دینی کے مطابق اسلامی حکومت قائم کرنے، ہنگاموں اور فسادات میں ملوث ہونے اور حکومتی پریشانی پر خوشی سے بغلیں بجانے وغیرہ جیسے عائد سنگین الزامات کے ٹھوس اور مدلل جوابات دینے کے بجائے خود اسی منطقی استدلال اور تاویل کا سہارا لیا۔

اس کی مثال منیر انکوائری رپورٹ کی وہ رائے جس میں تحقیقاتی عدالت نے مولانا

---

1. ایضاً: ص ۱۸
2. ایضاً: ص: ۲۱
3. ایضاً: ص ۲۳
4. ایضاً: ص ۲۳
5. ایضاً: ص ۲۸
6. ایضاً: ص ۳۵

مودودی کے حوالے سے لکھا تھا کہ "جماعت مسلم لیگ کے تصورِ پاکستان کی علی الاعلان مخالف تھی۔"[1] اور یہ کہ "جماعت اسلامی کے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تک یہ رائے رکھتے تھے کہ نئی مسلم ریاست اگر کبھی وجود میں آئی بھی تو اس کی شکل غیر دینی ریاست کی ہوگی۔"[2] چنانچہ جماعت نے مولانا مودودی کے اِس قول کی تشریح اور وضاحت پیش کرتے ہوئے "تبصرہ" میں لکھا کہ:

> "مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے تقسیم ہند سے پہلے جس بناء پر یہ کہا تھا کہ مجوزہ پاکستان ایک اسلامی ریاست نہ بن سکے گا وہ یہ نہ تھی کہ وہ اسلامی ریاست کے قیام کے مخالف تھے بلکہ اِس کے برعکس وہ تو مسلم لیگ سے اِس لیے الگ رہے کہ اُن کو امید نہ تھی کہ اِس ذہنیت اور اِس کیریکٹر کی جماعت کے ہاتھوں کبھی کوئی اسلامی ریاست وجود میں آسکے گی۔"[3]

گو اِس منطقی استدلال کے باوجود قیام پاکستان کی مخالفت کا عنصر دونوں تحریروں میں موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اقتباس مخالفت کا صاف اور واضح اظہار کر رہا ہے جبکہ "تبصرہ" کی وضاحت مولانا مودودی کی مخالفت پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ اور اُس کے قائدین کی دیانت، ایمانداری اور سچائی پر انگلیاں اُٹھا رہی ہے اور اُن کے اُس بے داغ کردار و عمل کو توہین و تضحیک کا نشانہ بھی بنا رہی ہے جس پر مسلمانوں کا سوادِ اعظم کامل یقین و بھروسہ رکھتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے اپنی اور مولانا مودودی کی متنازعہ پوزیشن کی صفائی دینے کے بجائے اِسی قسم کا اندازِ توضیح و تشریح اپنایا اور اُس نے تسلیم کیا کہ:

---

1. رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۲۶۱
2. تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ پر تبصرہ، مرتبہ نعیم صدیقی و سعید احمد ملک، ص: ۳۱، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ لاہور، جنوری ۱۹۵۵ء
3. ایضاً، ص: ۳۰، ۳۱

''ہم نے یہ تبصرہ اپنی سعی کی حد تک علمی نقطہ نگاہ سے مرتب کیا ہے اور ارادی حد تک ہم نے کسی موقع پر یہ نہیں چاہا کہ تحقیقاتی عدالت کے فاضل جج یا کسی بھی متعلقہ فرد یا پارٹی کی نیت یا عزت پر کوئی حملہ کریں یا کسی کے جذبات کو تکلیف پہنچائیں...... اِس تبصرے میں مقصود کسی کی دل آزاری کرنا نہیں ہے بلکہ صرف واقعات کی توضیح اور علمی حقائق کی تشریح ہے۔''[1]

اُس نے تحقیقاتی عدالت کی جانب سے اٹھائے گئے بعض اہم نکات پر مدلل جواب دینے کے بجائے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے یہاں تک لکھا کہ:

''آیا یہ اُمور اِس تحقیقات میں عدالت کیلئے فی الواقعہ تصفیہ طلب تھے۔؟ کیا اِن کو باقاعدہ تصفیہ طلب مسائل کی حیثیت دے کر جماعت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اِن میں اپنی پوزیشن کو خود واضح کرے۔؟ مثلاً یہ سوالات کہ تقسیم سے پہلے پاکستان کے قیام کے معاملہ میں کس جماعت کی کیا پوزیشن تھی یا یہ کہ اپنے نصب العین کے حصول کیلئے کونسی جماعت کن ذرائع و وسائل کے استعمال کی قائل ہے اور کن کی نہیں۔ بظاہر نہ تو اِس عدالت میں تصفیہ طلب ہی تھے اور نہ اِن کو کبھی باقاعدہ ایک تنقیح بنا کر کسی سے اپنی پوزیشن واضح کرنے کیلئے کہا گیا۔''[2]

گویا جماعت نے منطقی استدلال، نکتہ چینی اور اگر، مگر، چونکہ اور چنانچہ کے لفظی گورکھ دھندے میں الجھا کر انکوائری رپورٹ کے مندرجات سے عوام کی توجہ ہٹانے کی بھرپور کوشش کی۔ اور اُس نے خود کو پاکستان کا خیر خواہ اور وفادار ثابت کرنے کا سہل اور آسان حل نکالتے ہوئے لکھا:

1۔ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ پر تبصرہ، مرتبہ نعیم صدیقی وسعید احمد ملک، ص: ۲۰۸، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ لاہور، جنوری ۱۹۵۵ء

2۔ ایضاً: ص ۳۳

"جس طرح رپورٹ کے مصنفین ملک کے خیرخواہوں کی حیثیت سے سوچتے ہیں اسی طرح اس پر تبصرہ کرنے والے بھی ملک کے خیرخواہ ہو سکتے ہیں۔" [1]

جبکہ اس کے برخلاف مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش نے "محاسبہ" (جو معنوی اعتبار سے پوچھ گچھ، حساب و پڑتال اور احتساب کا مظہر تھی) میں منیر انکوائری رپورٹ کا تجزیاتی جائزہ لیتے ہوئے جرأت مندانہ موقف اپنایا۔ اور اسے اُن چھ اندھوں کے تصوراتی خیال سے تشبیہ دی جنہوں نے ہاتھی کو ٹٹول کر اُس کے وجود کو اپنے اپنے احساسات کے مطابق محسوس کیا ہو۔ چنانچہ اس حوالے سے مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش درانی لکھتے ہیں کہ:

"عدالت تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء کی رپورٹ جو ایک ضخیم کتاب کی شکل میں شائع ہوئی ہے اُس ہاتھی کی مانند ہے جس کے مختلف اعضاء کو چھ (۶) اندھوں نے اپنے ہاتھوں سے ٹٹولا اور اپنی حس لامسہ کی مدد سے ہاتھی کے متعلق ہر ایک نے اپنا جدا جدا مخصوص تصور قائم کرلیا۔ ایک نے کہا ہاتھی ایسا ہے جیسے عمارت کا ستون، دوسرا بولا ایک بہت بڑا چھاج، تیسرے نے کہا موٹا سا اژدھا، چوتھے نے کہا ہاتھ بھر کی موٹی رسی، پانچویں نے کہا ناہموار سا چبوترہ، چھٹے نے ارشاد فرمایا وہ تو ایک دیوار سی تھی اور بس۔" [2]

آپ لکھتے ہیں کہ اس رپورٹ نے بعینہ اسی قسم کی کیفیت عامۃ الناس میں پیدا کر رکھی

---

[1] ایضاً، ص ۱۳

[2] مرتضیٰ احمد خان میکش درانی، مولانا، محاسبہ، یعنی عدالت تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء کی رپورٹ پر ایک جامع اور بلیغ تبصرہ

(نوٹ:۔ یہ رسالہ سب سے پہلے روزنامہ "نوائے پاکستان" کے خاص رپورٹ نمبر مورخہ ۲۹، اگست ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ مشمولہ ردقادیانیت اور سنی صحافت، ص: ۲۶۲، جلد سوم، مولف، محمد ثاقب رضا قادری، اکبر بک سیلرز لاہور، مارچ ۲۰۱۷ء۔ واضح رہے کہ اس رسالے کو احتساب قادیانیت، مولوی اللہ وسایا، جلد ۲۸، مئی ۲۰۰۹ء، اور عقیدہ ختم نبوت، مفتی محمد امین، جلد ہشتم میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔)

ہے اور ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق اس کے متعلق اپنا خیال اور تصور قائم کر چکا ہے یا کر رہا ہے۔آپ نے لکھا کہ عدالت تحقیقات محض فسادات کی ذمہ داری کا سراغ لگانے اور فسادات کے سلسلے میں حکومت پنجاب کے اختیار کردہ ذرائع کا مکتفی یانا مکتفی ہونا معلوم کرنے کیلئے معرض وجود میں لائی گئی تھی لیکن اس کا دائرہ کار بتدریج وسیع تر ہوتا چلا گیا اور اس عدالت نے فسادات کے اسباب وعلل کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش میں ایسی علمی اور عملی کوائف کا جائزہ بھی لینا چاہا جو اس عدالت کے بجائے اگر کسی علمی بحث ومناظرہ کی مجلس میں پیش کیے جاتے تو مفید تر نتائج حاصل کیے جاسکتے تھے۔

آپ نے عدالت میں علماء کے درمیان ''مسلم''یعنی مسلمان کی معین تعریف کے اختلاف کو جسے فاضل جج صاحبان نے علماء کو مطعون کرنے کیلئے استعمال کیا تھا، عدالت کا غلط استنباط قرار دیا اور لکھا:

''علمائے دین نے عدالت کے اِس سوال کے جواب میں جو بیانات دیئے ہیں وہ الفاظ وعبارت کے لحاظ سے تو بلا شبہ ایک نہیں لیکن معنی اور مفہوم کے اعتبار سے اُن میں کسی قسم کا اختلاف نظر نہیں۔جن علمائے دین سے یہ سوال کیا گیا اُن سب نے توحید باری تعالیٰ اور رسالت محمدیہ ﷺ پر ایمان لانے اور ضروریات دین کا اقرار کرنے کو'' مسلم'' کہلانے کیلئے ضروری قرار دیا۔''[1]

اُنہوں نے اِس عدالتی طریقہ کار پر کڑی تنقید کی اور لکھا کہ اگر عدالت ''مسلم'' کی ایسی جامع ومانع تعریف حاصل کرنا چاہتی تھی جسے اسلامی مملکت کے دستور اساسی میں شامل کیا جاسکے تو اِس کا صحیح طریقہ کار یہ تھا کہ وہ اِس سوال کو علمائے دین کی مجلس میں پیش کرکے ایک جامع تعریف معین کراتی۔اُنہوں نے ارتداد اور کفر وتکفیر کے حوالے سے بھی فاضل جج صاحبان کے خیالات کی گرفت کی اور عدالت کی اس کوتاہی کی طرف توجہ دلائی کہ:

---

[1] ایضاً

"فاضل جج صاحبان رپورٹ کے اس مقام پر اگر تکفیر کی وہ تصریح درج کر دیتے جو مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری نے عدالت کے سامنے پیش کی تھی اور بتایا تھا کہ اُن کے نزدیک کفر کی دو قسمیں ہیں: ایک کفر قطعی اور ایک کفر فقہی، کفر قطعی کی صورت میں اُس کا مرتکب دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور کفر فقہی کی صورت میں دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ تو رپورٹ پڑھنے والوں کو اِس اشکال کی ماہیت سمجھنے میں بہت مدد ملتی۔"[1]

اُنہوں نے فریضہ جہاد بالسیف اور اس سے متعلقہ نکات مثلاً مال غنیمت، خمس، اسیران جنگ، دارالحرب، دارالسلام، ہجرت، غازی اور شہید وغیرہ پر عدالتی افکار کو التباس کا شکار قرار دیتے ہوئے لکھا کہ:

"اگر عدالت اِن مسائل کے بارے میں پوری تحقیقات کرنے کی زحمت گوارا کرتی تو جج صاحبان کے ضمائر پر یہ بات روشن ہو جاتی کہ جنگ اور اس سے متعلقہ کوائف کے بارے اسلام کے تصورات اُن تصورات سے کہیں افضل اور نوع انسانی کیلئے آیہ رحمت وموجب خیر و برکت ہیں جو عصر حاضر کے مفکرین نے صدہا سال کے تجربوں پر غور وفکر کرنے کے بعد قائم کیے۔"[2]

مولانا مرتضیٰ احمد میکش درانی نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور مودودی کے اِس تصور جہاد کی نفی اور تردید بھی کی کہ تلوار کی طاقت کے زور پر اسلام کی اشاعت کی جائے۔ اُنہوں نے واضح کیا کہ اسلام میں جہاد کا بنیادی نقطہ دین اسلام اور مسلمانوں کے جان و مال، عزت و آبرو اور دینی و ملّی شعائر کے دفاع کی خاطر اسلحہ اٹھانا اور جنگ کرنا ہے۔ دنیا میں جب تک اسلام اور مسلمانوں سے برسرپیکار رہنے والی قومیں موجود ہیں مسلمانوں کیلئے شمشیر بکف رہنا اور قرآن

---

1. ایضاً
2. ایضاً

پاک کے بتائے ہوئے اُصول و قواعد کے مطابق دفاعی جنگ جاری رکھنا ضروری اور ایک لازمی اَمر ہے۔

اُنہوں نے لکھا کہ اسلام کو جارحیت اور نسل کشی کا حامی قرار دینا دشمنان اسلام کا پروپیگنڈا ہے۔ مسلمانوں نے عملاً جارحیت اور نسل کشی سے اجتناب کیا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں نسل کشی کی کوئی مثال دکھائی نہیں جاسکتی۔ اُنہوں نے اس تصور کی بھی نفی کی کہ ایک صحیح اسلامی مملکت کو اس اَمر کا خوف لاحق نہیں ہوسکتا کہ عصر حاضر کے بین الاقوامی قوانین کے ساتھ اسلام کے قوانین منطبق نہیں ہوتے بلکہ صحیح اسلامی مملکت اگر بین الاقوامی محافل کے سامنے اسلام کے قوانین پیش کرے تو دنیا کے مذاق سلیم کو اپنا ہم نوا بنا سکتی ہے۔

اُنہوں نے مال غنیمت اور خمس کے حوالے سے اسلامی قانون سے متعلق فاضل جج صاحبان کے اس گمان فاسد کہ "اگر مال غنیمت اور خمس کو جہاد کے لوازم خیال کیا جائے تو بین الاقوامی سوسائٹی اِسے خالصۃً لوٹ کا مال تعبیر کرے گی۔" کی اصلاح کی اور اُن پر واضح کرتے ہوئے لکھا کہ:

> "اسلام کے نزدیک جہاد ایک مذہبی فریضہ ہے جو خالصۃً فی سبیل اللہ ادا کیا جاتا ہے۔ جہاد کی نیت کو اگر کسی قسم کے دنیوی لالچ سے آلودہ کرلیا جائے تو وہ جہاد نہیں رہتا لیکن جنگ میں مال غنیمت کا ہاتھ آنا ایک لازمی اَمر ہے۔ عصر حاضر کی جنگوں میں بھی فاتح فریق مال غنیمت پر قبضہ جمالیتا ہے اور وہ مال فاتح فریق کا حق متصور ہوتا ہے یہی قانون اسلام کا ہے۔ اسلام کی رُو سے اصولاً مال غنیمت بیت المال کا حق متصور ہوتا ہے۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ (سورہ انفال:۱) کی آیہ اس پر دال ہے۔ اِس کے بعد خمس یعنی پانچویں حصے کو بیت المال میں رکھنے اور باقی مال کو مجاہدین پر بحصہ رسدی تقسیم کردینے کا جو حکم قرآن پاک میں مذکور ہے وہ مخصوص حالات سے متعلق ہے۔ یہ مال صرف اُن مجاہدین پر بانٹا جاتا ہے جو محض اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کی نیت خالص کے ساتھ اپنے خرچ پر اور اپنا ساز و

سامان لے کر میدانِ جنگ میں حاضر ہوتے ہیں۔"[1]

ساتھ ہی اُنہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ اسلام نے مدمقابل کے اموال لوٹنے کو اپنا حق سمجھنے اور انفرادی حیثیت سے دشمن کا مال لوٹ کر اُس پر اپنا قبضہ جمانے سے منع کیا ہے۔ اور خمس و تقسیم کا حکم صرف اُس مال کیلئے ہے جو جنگ کے نتیجے میں خود بخود ہاتھ لگ جائے اور اُس کی تقسیم بھی امیر کی مرضی پر موقوف ہو۔ امیر چاہے تو سارے مالِ غنیمت کو بیت المال میں داخل کر کے مجاہدین کے وظائف مقرر کر سکتا ہے۔

مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش نے اسلام میں غلامی کے تصور سے متعلق مغربی دنیا میں موجود غلط فہم و فکر کو دور کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ اسلام میں جس کیفیت کو غلامی کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ کس قدر رحم دلانہ سلوک کی حامل ہے۔ جبکہ دنیا کی مہذب ترین قومیں عصر حاضر میں اسیرانِ جنگ کو موت کے گھاٹ اتارنے اور اُنہیں بدترین صورتوں میں غلام بنا کر رکھنے کی مرتکب ہو رہی ہیں اور اسلام کو بدنام کیا جا رہا ہے کہ اُس نے اسیرانِ جنگ کو مخصوص حالات میں غلام بنانے کی اجازت دی ہے۔ اس بات کو کوئی نہیں دیکھ رہا کہ اسلام میں غلام کے حقوق اور اُس کا درجہ کیا ہے۔؟ جبکہ عصر حاضر کے دانشور اور فلسفی اسیرانِ جنگ سے متعلق کوئی ایسا قاعدہ وضع نہ کر سکے جو اسلام کے بتائے ہوئے قاعدے سے بہتر ہو اور جس کی رُو سے جنگی اسیر امن و عافیت کی زندگی بسر کرنے کے قابل بن سکیں۔

الغرض مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش درانی نے ریاست و حکومتی نظام سے متعلق پیش کردہ اسلامی تصورات اور جمہوری ریاست سے متعلق جدید سیاسی فکر میں تصادم اور الجھاؤ، لہو و لعب، آرٹ اور اسلام، جمہوریت قیادت اور نمائندہ حکومت اور اربابِ سیاست و قیادت کی کوتاہیوں پر مدلل اور سیر حاصل اندازِ فکر اپنایا۔ آپ نے فاضل جج صاحبان کے منفی اندازِ فکر، تردد و مغالطوں اور علمی و فکری کجی کو دور کرنے کی پوری کوشش کی۔ اور حکومت و اربابِ اقتدار کو

---

[1] ایضاً

صائب مشورے بھی دیئے۔ساتھ ہی آپ نے مغرب زدہ فکر کی خوف زدگی کا ذکر کرتے ہوئے اہل علم وعلماء کو عصر حاضر میں درپیش مسائل اور چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے کیلئے اپنی صف بندی کرنے کا بھی مشورہ دیا۔اور لکھا کہ:

''اِس رپورٹ میں من جملہ دیگر اُمور کے یہ بات نہایت واضح طور پر اور عام اشجار کے مقابلے میں شمشاد وصنوبر کی بلند قامتی کے ساتھ نمایاں طور پر ظاہر ہو رہی کہ ہمارے ملک کا وہ طبقہ جو برسر اقتدار ہے اور جس کے اذہان نے مغربی افکار کی گود میں پرورش پائی ہے۔بے طرح ذہنی غلامی کا شکار ہو رہا ہے اور اپنے ہاں کی ہر چیز کو حتیٰ کہ دینی معتقدات وشعائر کو بھی قدروں کے اُسی معیار پر پرکھنے کا عادی ہے جو اہل مغرب کی فکر نے عصر حاضر میں مقرر کر لیا ہے اور جس میں مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔دوسری جانب ہمارا وہ طبقہ ہے جس نے علوم دینیہ کے مطالعہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے عصری افکار سے نا آگاہ ہونے کے باعث اسلام کی تعلیمات کو ایسے انداز میں پیش کرنے سے قاصر ہے جو عصر حاضر کے دماغوں کیلئے قابل فہم ہو۔رپورٹ میں جا بجا اِس اَمر کے اعترافات واظہارات موجود ہیں کہ ہمارے ارباب اقتدار کو جن ملحوظات ومفکورات نے عامۃ المسلمین کے سہ گانہ مطالبات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے سے روکے رکھا۔وہ یہی تھے کہ باہر کی دنیا ہمیں کیا کہے گی۔؟''[1]

مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش کے نزدیک یہ اُس مغربی افکار ونظریات سے متاثر طبقے کا طرزِعمل ہے جو مغرب کے افکار،اہل مغرب کی معاشرت اور اُن کے طرز بود وباش سے اِس حد تک مسحور ہو چکا ہے کہ زندگی کے متعلق اسلام کے تصورات کی عظمت وماہیت کا اخذ کرنا بھی اُس کے دماغ کیلئے بڑا مشکل اور کٹھن کام بن رہا ہے۔وہ یہ نہیں دیکھتا کہ سیاسیات ومعاشرت میں بین الاقوامی فکر ابھی ارتقائی منازل طے کر رہی ہے اور اُن تلخ تجربوں کی روشنی میں جو نوع

---

[1] ایضاً

انسان کو ہر شعبۂ حیات میں آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔کسی مستقل اور پائیدار حل کو تلاش کرنے میں سرگرداں ہے۔

جبکہ اسلام اب سے چودہ سو سال پہلے ان جملہ مشکلات کا حل نوع انسان کے سامنے پیش کر چکا ہے۔اگر نوع انسان کی فکر اُس چراغ کی روشنی سے استفادہ کرتے ہوئے جو اسلام نے روشن کر رکھا ہے، راستہ تلاش کرے تو انسانیت صراط مستقیم پر سرعت رفتار کے ساتھ گامزن ہو سکتی ہے اور اُن منازل مقصود تک جلد از جلد پہنچ سکتی ہے جن تک پہنچنے کیلئے اُس کے شعوری اور لاشعوری تقاضے اُسے بے قرار رکھتے ہیں۔

آپ نے اِس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا کہ نوع انسانی کو یہ روشنی دینا اور یہ صراط مستقیم دکھانا مسلمانوں سے مفلوج ہو کر رہ گئی ہیں۔چنانچہ آپ نے اہل علم،علماء اور دینی طبقے کو اس ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے لکھا کہ:

> ''ضرورت اس اَمر کی ہے کہ اِن (اپنی) صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے اور اقوام عالم کے سامنے اِن مسائل کا صحیح حل پیش کرنے کیلئے اسلام کی تعلیمات یعنی قرآن وسنت سے رہنمائی حاصل کرنے کی سعی کی جائے اور اِس بارے میں پوری تحقیق اور کاوش سے کام لیا جائے۔تجدید اسلام یا احیائے دین اسی سعی کا نام ہے اور یہ سعی وکوشش ایسے ادوار میں ضروری ہو جاتی ہے جب مسلمانوں میں بیرونی اثرات کی وجہ سے فکر وعمل کی گمراہیاں ترقی پذیر ہو جاتی ہیں۔''[1]

حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش کے جامع مدلل اور جاندار تبصرے نے منیر انکوائری رپورٹ کے حوالے سے عوام اور خواص میں پائی جانے والی بے چینی اور تذبذب کو دور کرنے میں بہت مدد دی۔اِس تبصرے میں مولانا میکش نے رپورٹ کے مثبت اور منفی تمام پہلوؤں کی ہی نشاندہی نہیں کی بلکہ فاضل جج کے انداز فکر اور علمی وفکری مغالطوں پر بھی عملی جرح کی۔آپ نے اپنے تجزیے میں مرکزی وصوبائی حکومت کی کوتاہی،قادیانیوں کی اشتعال

---

[1] ایضاً

انگیزی، مسلمانوں کیلئے اُن کے جارحانہ عوائم اور مرزا بشیر الدین محمود، چوہدری ظفر اللہ خان و مرزائی سرکاری افسران کے متعصبانہ طرز عمل کے ساتھ ساتھ احرار اور زعمائے احرار کے پُر تشدد جارحانہ حکمت عملی، وزیر اعلیٰ پنجاب میاں ممتاز محمد خان دولتانہ اور اُن کی حکومت کی احراری سرگرمیوں پر غفلت، چشم پوشی، کوتاہی اور ایسے اخبارات کی مالی معاونت جو ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کی ایماء پر تحریک کو خاص رخ پر ڈالنے کیلئے مضامین شائع کرتے رہے، پر بھی سخت تنقید اور گرفت کی۔ آپ نے اِس رپورٹ کو ایک ضخیم اور متنوع دستاویز قرار دیا۔

آخر میں "محاسبہ" کی اشاعت کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا کہ پہلا مقصد یہ ہے کہ "اُن لوگوں کو جنہیں ضخیم رپورٹ پڑھنے کی فرصت نہیں ایک مرتب اور اجمالی صورت میں ملک کے اہم کوائف و مسائل پر فاضل جج صاحبان کی تنقیدات سے روشناس کر دیا جائے۔" دوسرا مقصد یہ ہے کہ "اُن غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی سعی کی جائے جو اس رپورٹ کے مندرجات پر پوری توجہ نہ دینے کی وجہ سے عامۃ الناس میں بلکہ پڑھے لکھے حلقوں میں پھل پھول رہی ہے۔" اور تیسرا اہم اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ "مملکت عزیز پاکستان کے جملہ عناصر کی توجہ دلائی جائے کہ وہ اس کے مندرجات کی روشنی میں اپنے فکر و عمل کے رجحانات کا جائزہ لیں اور آئندہ کیلئے اِن رجحانات سے بچنے کی کوشش کریں۔" خاتمہ کلام کرتے ہوئے مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش لکھتے ہیں کہ "پاکستانی معاشرے کے مختلف عناصر کا کام یہ ہے کہ عدالت تحقیقات کی اِس رپورٹ کے آئینے میں اپنے اپنے چہرے دیکھیں اور ایسا طرز عمل اختیار کریں جو ملک میں امن و سکون کی فضاء کو تقویت دینے کا موجب ہو۔ جان لینا چاہیے کہ ہمارے ملک کو اِس سلسلے میں اہم فکری اور حیاتی مسائل درپیش ہیں۔ جن کو خوش اسلوبی کے ساتھ اور وطن خواہی کی اسپرٹ میں حل کیے بغیر ہم امن و سکون کی وہ فضاء پیدا نہیں کر سکتے جو کسی ملک کو یا کسی معاشرے کو ترقی و بلندی کی شاہراہ پر گامزن کرنے کیلئے ضروری ہے۔ ایسے اہم مسائل کی طرف سے آنکھیں بند کر لینے یا اُن کو حل کرنے کی سعی سے گریز کرنے کی روش معاملات کو مزید اُلجھاؤ ہی میں ڈالنے پر منتج ہو سکتی

ہے۔ سلجھاؤ پیدا نہیں کرسکتی...... جب تک اربابِ حکومت سیاسی پارٹیاں اور اربابِ قیادت اور ملک کے دیگر عناصر اِن مسائل کا خوشگوار حل تلاش کرنے کیلئے کمرِ ہمت باندھ کر آگے نہیں بڑھیں گے اور باہمی مشورت اور افہام وتفہیم سے ایسے نتائج پر پہنچنے کی کوشش نہیں کریں گے جو تصادموں کو روکنے اور فسادات کے سرچشموں کو بند کر دینے والے ہوں۔"[1]

چونکہ مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش مجلس عمل کے وکیل کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوئے تھے اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے عدالت کو متاثر کر چکے تھے۔ اس لیے عدالت نے آپ کی محنت، لیاقت اور صلاحیتوں کی تعریف کرتے ہوئے آپ کے ساتھ کام کرنا ایک نیا اور خوشگوار تجربہ قرار دیا۔ اور تسلیم کیا کہ مولانا میکش نے علماء کے کیس پر نمایاں زورِ بیان سے بحث کی۔ اور انہوں نے اُن تمام دشنام آمیز تقریروں کی مذمت کی جو ادنٰی درجے کے لیڈروں نے کی تھیں۔[2]

مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش درانی کو انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ آپ بہترین مترجم تھے۔ آپ نے رپورٹ کے متعدد پیراگراف کا اردو ترجمہ اس خوش اسلوبی سے کیا کہ جب یہ ترجمہ روزنامہ نوائے پاکستان کے خاص رپورٹ نمبر میں شائع ہوا تو جسٹس منیر نے ۳ ستمبر ۱۹۵۴ء کو آپ کے نام خط میں آپ کی مہارتِ ترجمہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا:

"آپ کا گرامی نامہ مع رپورٹ نمبر نوائے پاکستان موصول ہوا۔ شکریہ اقتباسات کے ترجمہ میں جو اصل رپورٹ کی سطح آپ نے قائم رکھی وہ قابلِ رشک ہے۔ وہ ترجمہ کیا جو صاف ترجمہ نظر آئے۔ اگر ہم اردو میں اِس موثر طریقہ سے اظہارِ خیال کر سکتے جس طرح آپ نے ترجمہ میں کیا ہے تو ہم یقیناً رپورٹ اردو میں ہی لکھتے گورنمنٹ اگر چاہتی انگریزی سے ترجمہ کرا لیتی۔ اسلامک سٹیٹ کی ضروریات جو ہم نے اپنے نقطہ نظر سے بیان کی ہیں اُن کا اقتباس بمع اپنی رائے آپ نے کیوں پیش نہیں کیا اور مولانا ہم نے تو بہ قول آپ کے

---

[1] ایضاً

[2] رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء، ص: ۳۲۱۔ ۷

صرف چوبھی دی تھی اور آپ چوٹ مار گئے نہ.....کیا کیانی (جسٹس رستم کیانی) کو کوہاٹ کے پتہ پر بھی آپ نے رپورٹ نمبر بھیجا و یقیناً خوش ہوئے ہوں گے۔"[1]

آپ کی ترجمہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے شورش کاشمیری نے لکھا کہ:

"انگریزی سے اردو ترجمہ کرتے ہیں تو اصل سے بڑھ جاتا ہے، فارسی اُن کے گھر کی لونڈی ہے، اردو خوب لکھتے ہیں لیکن لکھنوی، دہلوی یا لاہوری کسی اُسلوب کے پیرو نہیں۔ اُن کا اپنا اُسلوب ہے۔ زبان گنجلک تو نہیں ادق ہوتی ہے، انگریزی کے ہر لفظ کو مشرف بہ اسلام کر لیتے ہیں، الفاظ کو مفرس یا معرب کرنے میں اُنہیں ید طولیٰ حاصل ہے۔"[2]

مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش درانی کئی مشہور زمانہ اخبارات کے مدیر رہے۔ آپ نے متعدد علمی و تحقیقی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ ۱۹۵۰ء میں "پاکستان میں مرزائیت کا مقام اور مستقبل" کے عنوان سے آپ نے دس اقساط میں روزنامہ "مغربی پاکستان" میں اداریہ لکھا۔ جس میں حکمران طبقہ پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ مرزائی مسلمانوں سے الگ اُمت ہیں اور صرف اپنے مذموم سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے اسلام کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ نیز یہ طبقہ انگریز سامراج کی پیداوار، اکھنڈ بھارت کا حامی و طلب گار اور پاکستان کو مرزائی اسٹیٹ بنانا چاہتا ہے خواہ اِس کیلئے اُن کو کسی بھی خطرناک حد تک جانا پڑے۔[3]

آپ کی مشہور تصانیف میں تاریخ اسلام دو جلدیں، تاریخ اقوام عالم، سیرت سید المرسلین ﷺ، اخراج اسلام از ہند، درد دل (شاعری)، تقدیر (الہامی افسانے)، تدبیر (الہامی افسانے) اور "قبلی برقستان" وغیرہ شامل ہیں۔ آپ نے رد قادیانیت پر بھی متعدد کتابچے لکھے جن میں "محاسبہ" کے علاوہ "مرزائی نامہ"، "پاکستان میں مرزائیت"، "قادیانی سیاست" اور "کیا

---

[1] محمد ثاقب رضا قادری، رد قادیانیت اور سنی صحافت، جلد سوم، ص: ۲۶۰، اکبر بک سیلرز لاہور، مارچ ۲۰۱۷ء
[2] شورش کاشمیری، نورتن، ص: ۱۳۸، مطبوعات چٹان لاہور، ۱۹۶۸ء
[3] ثاقب رضا قادری، تحریک ختم نبوت اور نوائے وقت، ص: ۷۷، دار النعمان پبلی شرز لاہور، جون ۲۰۱۷ء

پاکستان میں مرزائیوں کی حکومت ہوگی؟'' زیادہ مشہور ہیں۔

مرزا محمود قادیانی کا عبرت ناک انجام

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کی بظاہر ناکامی قادیانیوں کے حوصلے میں اضافے کا سبب بنی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ تندہی سے اپنے اہداف کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ ابھی اُن کی سرگرمیاں جاری تھیں کہ ۸ نومبر ۱۹۶۵ء کو قادیانی خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود قادیانی طویل بیماری کے بعد اذیت ناک انجام سے دو چار ہوگیا۔ اور مرزا ناصر احمد قادیانیوں کا نیا خلیفہ بن گیا۔ مرزا محمود کی بیماری کی اذیت ناک کیفیات کا نقشہ کھینچتے ہوئے ممتاز احمد فاروقی نے لکھا:

''ابھی مرزا محمود کے (مامور من اللہ اور مصلح موعود) کے دعوے کو یعنی موکد بعذاب حلف پر گیارہ برس (۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۵ء) بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ میاں محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان و ربوہ کو عذاب الٰہی نے آن پکڑا۔ اس کا آغاز فالج کے حملے سے ہوا۔ جیسا کہ متعدد ڈاکٹروں کی رائے تھی اور اس اَمر کی طرف اشارہ میاں محمود احمد نے خود اپنی بعض تحریروں میں کیا۔ جو اُس نے ۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۵ء میں لکھیں اور فالج کے مرض کو حضرت مسیح موعود (مرزا غلام احمد) نے دکھ کی مار (انجام آتھم ص: ۶۱) کہا ہے اور اپنے دشمنوں کیلئے مفلوج ہونے کی بد دعا بھی کی ہے۔ اب میاں محمود احمد کئی سال سے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہیں اور تکلیف اور کرب سے چلاّ تے ہیں۔ تختے کی مانند کبھی کبھی سٹیج پر لائے جاتے ہیں۔ یعنی خاص خاص جلسوں کے موقع پر کبھی الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں اور اکثر رونے لگ جاتے ہیں۔ خود میاں محمود احمد کے بیٹے ڈاکٹر منور احمد نے اپنے باپ کی صحت کے متعلق جو رپورٹ اخبار الفضل مورخہ ۱۹، اگست ۱۹۶۱ء کے دوسرے صفحے پر دی ہے۔ اس سے ان تمام علامات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اعصابی بے چینی بصورت نسیاں اور جذبات کی شدت یعنی رقت جو مقدس ہستیوں یا مقدس مقامات کے ذکر پر عموماً پیدا ہو جاتی ہے۔

چند دن اِن علامتوں میں قدرے فرق محسوس ہوتا تو پھر چند دن زیادتی محسوس ہوتی ہے اور اِس طرح یہ سلسلہ چلا جاتا ہے۔ لیٹے رہنے کے باعث ٹانگوں میں کھنچاوٹ اور اکڑاؤ بھی بدستور ہے۔ کوئی ممکن کوشش حضور کو چلانے کی کامیاب نہیں ہورہی۔ چونکہ قادیانی جماعت کا عقیدہ ہے کہ خلیفہ معزول نہیں ہوسکتا اِس لیے وہ اب ایک مریض اور از کار رفتہ انسان کو خلیفہ بنائے ہوئے ہیں۔ حالانکہ خدا نے اپنے ہاتھوں سے اُسے معزول کردیا ہے۔ کچھ سال ہوئے کسی شخص نے میاں محمود احمد پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور گردن پر گہرا زخم آیا تھا۔ یہ بھی خدائی عذاب کا ایک نشان تھا۔ ویسے بھی جماعت ربوہ ایک کونسل کے سپرد ہے۔ جس کے پریذیڈنٹ مرزا ناصر احمد (خلف میاں محمود احمد قادیانی) ہیں۔ اِس لیے مقام عبرت ہے کیونکہ خدا کے فرستادہ لیڈر کبھی مجنون اور مفلوج ہوکر نکمے نہیں ہوجاتے۔"[1]

۸ نومبر ۱۹۶۵ء کو مرزا ناصر احمد قادیانی نے قادیانی جماعت کے تیسرے جانشین کی حیثیت سے مسند اقتدار سنبھالا۔ جسے وراثت میں ایک مالی طور پر مستحکم سلطنت اور پیروکاروں کی پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ایک منظم تنظیم ملی۔ مرزائیت آج دنیا کا مالدار ترین فرقہ ہے۔ جس کے دو مرکزی دفاتر ایک بھارت کے شہر قادیان اور دوسرا پاکستان میں ربوہ میں واقع ہے۔ یہ دونوں مراکز اپنے عالمی مشنریوں کو منظم رکھتے ہیں، ہدایات دیتے ہیں اور اُن کے بجٹ کا حساب وکتاب رکھتے ہیں۔ اور مالی فراہمی سے بے نیاز قادیانی داعی دنیا بھر میں قادیانیت کی تبلیغ میں مصروف رہتے ہیں۔

یورپ میں کینیڈا، انگلینڈ، ہالینڈ، سوئزرلینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سویڈن، بلجیم، اسپین اور اٹلی میں قادیانیوں کے چوبیس (۲۴) مشن، ایک سو تیس (۱۳۰) قادیانی عبادت گاہیں، دو (۲) مدرسے، اور نو (۹) سے زائد اخبارات و رسائل کام کررہے ہیں۔ مشرق وسطی میں فلسطین شام،

---

[1] ممتاز احمد فاروقی، فتح حق ص: ۳۰، مشمولہ تحریک احمدیت یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ، بشیر احمد ص: ۶۲۲۔ ۶۲۳، ادارہ اصلاح وتبلیغ، اسٹریلیا بلڈنگ ریلوے اسٹیشن لاہور

لبنان، عدن، مصر، کویت، بحرین، مسقط، دوبئی اور اُردن میں دس (۱۰) مشن، چار (۴) سے زائد قادیانی عبادت گاہیں، ایک (۱) مدرسہ کام کر رہے ہیں۔ عربی زبان میں ایک رسالہ ''البشریٰ'' کے نام سے نکالا جارہا ہے۔ مشرقی افریقہ میں کینیا، تنزانیہ، یوگنڈا، زمبیا، میں چھبیس (۲۶) قادیانی مشن، اکہتر (۷۱) قادیانی عبادت گاہیں، پانچ (۵) مدرسے کام کر رہے ہیں اور پانچ (۵) سے زائد اخبارات و رسائل نکل رہے ہیں۔

قادیانیوں کو سب سے زیادہ کامیابی مغربی افریقہ میں ملی جہاں ان کے نائجیریا، گھانا، سیرالیون، گیمبیا، آئیوری کوسٹ، لائبیریا، صومالیہ اور دیگر افریقی ممالک میں دوسو سینتیس (۲۳۷) قادیانی مشن، چار سو انہتر (۴۶۹) قادیانی عبادت گاہیں، ایک سو چون (۱۵۴) مدارس، پچیس (۲۵) ہسپتال قادیانیت کی تبلیغ میں مصروف ہیں، بحر ہند کے ممالک میں ماریشس، سری لنکا، برما، وغیرہ میں سات (۷) قادیانی مشن، تیرہ (۱۳) قادیانی عبادت گاہیں اور ایک (۱) مدرسہ کام کر رہا ہے۔

مشرق بعید میں انڈونیشیا، فجی، جاپان، جنوبی افریقہ کے ممالک میں تہتر (۷۳) قادیانی مشن، ایک سو ستائیس (۱۲۷) قادیانی عبادت گاہیں چھ (۶) مدرسے کام کر رہے ہیں اور سولہ (۱۶) سے زائد اخبارات و رسائل قادیانیت کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف ہیں۔ انڈونیشیا جیسے اسلامی ملک میں تیس (۳۰) سے زائد قادیانی مشن اور ایک سو پندرہ (۱۱۵) عبادت گاہیں مختلف شہروں میں قادیانیت کی اشاعت میں مصروف کار ہیں۔ اس وقت دنیا میں امریکہ، برطانیہ، بھارت اور اسرائیل قادیانیت کے سب بڑے معاون و حمایتی ممالک ہیں۔

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے بعد حالات اور اثرات و نتائج

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کو اس وقت کے سیاستدانوں نے بیشک مارشل لاء لگا کر سنگینوں اور گولیوں کے بل پر کچل ڈالنے کی ناپاک کوشش کی۔ اور حکومت کے وحشیانہ تشدد کی بدولت یہ تحریک وقتی طور پر اس اعتبار سے ناکام ہوگئی کہ مجلس عمل کا ایک بھی مطالبہ بظاہر تسلیم نہیں

کیا گیا۔لیکن یہ تحریک پاکستان کی سیاسی تاریخ پر اپنے اثرات چھوڑ گئی اور اس تحریک نے ملک اور قوم کو ہلا کر رکھ دیا۔تحریک کی ناکامی سے مسلمانوں کے دل و دماغ مجروح تھے اور عوام کے جذبات پر اس کا مایوس کن اثر پڑا۔حکمرانوں کے منافقانہ طرزِ عمل کی وجہ سے عوام کو شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ اُن کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اُن کے ذہنوں میں پاکستانی فوج کا کردار بھی بری طرح متاثر ہوا۔سیاستدان بیوروکریسی کے محتاج ہو کر رہ گئے اور پاکستان نوکرشاہی کے تصرفات کا شکار ہو کر رہ گیا۔مرکزیت ہر آنے والے دن کے ساتھ کمزور تر ہوتی گئی اور علاقائی فتنے سر اٹھانے لگے۔فوج نے اقتدار کا ایسا مزا چکھا کہ ملک پر فوجی اقتدار کا عرصہ سول حکمرانی سے زیادہ رہا۔

قادیانیوں کے نزدیک اِس تحریک کی ناکامی نے اُن کی پوزیشن کو مزید مضبوط کر دیا تھا اور وہ اِس تحریک کے نتائج سے قدرے مطمئن اور اپنے آپ کو ناقابل تسخیر سمجھنے لگے تھے۔سامراجی قوتوں نے پاکستان کی نوکرشاہی میں موجود اپنے گماشتوں کے ذریعے اُن کی بھرپور پشت پناہی کی۔صیہونی لابی اور یہودیت نواز غیر ملکی پریس نے قادیانی موقف کی پرزور حمایت جاری رکھی۔چنانچہ قادیانیوں نے آنے والے سالوں میں اپنی سیاسی ترجیحات تبدیل کر لیں اور اپنے خلاف عوام کا شدید ردِ عمل دیکھ کر عوامی محاذ کو ترک کر دیا۔انہوں نے عام مسلمانوں سے براہِ راست کھلے تصادم کے بجائے فوج اور نوکرشاہی سے اپنے تعلقات استوار کرنا شروع کر دیے۔وہ بزنس،نوکرشاہی،اور فوج میں اعلیٰ عہدوں پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے۔دوسری طرف امریکی سی۔آئی۔اے اور سامراجی تنظیموں نے انہیں مشرق وسطیٰ اور نوآزاد افریقی ریاستوں میں پھلنے پھولنے کیلئے بھرپور امداد مہیا کی۔ادھر مسلم لیگ کو اِس تحریک کے نتائج سے سب زیادہ دھچکہ اُس وقت لگا جب اُسے آئندہ انتخابات میں ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا اور خواجہ ناظم الدین کو وزارت عظمیٰ اور ممتاز دولتانہ کو وزارت اعلیٰ پنجاب کے عہدوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے بعد قادیانیوں نے پاکستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ اُنہوں نے سول اور فوجی افسران سے مل کر مرکز میں اپنے معاشی و سیاسی مفادات کا تحفظ کیا اور اپنی کوششوں کا رخ ملک میں آئینی عمل کو تہہ و بالا کرنے کی جانب موڑ دیا۔ قادیانیوں نے اپنے صیہونی و سامراجی آقاؤں کی ہدایت پر پاکستان کی سیاست میں دخل اندازی جاری رکھی۔ ۱۹۵۷ء میں قادیانی پاکستانی سیاست میں نوکر شاہی اور مغرب نواز حلقوں کے ذریعے کافی سرگرم رہے۔ وہ پاکستانی سیاست میں اتنے زیادہ ملوث تھے کہ حکومت کو اس تجویز پر غور کرنا پڑا کہ اُنہیں ایک سیاسی تنظیم قرار دے دیا جائے۔ اخبار "دی مسلم" اسلام آباد کے ایک باخبر نامہ نگار کے مطابق:

> "۱۹۵۷ء میں پنجاب سی آئی ڈی نے ایک تجویز تیار کی کہ جماعت احمدیہ کو سیاسی تنظیم قرار دے دیا جائے۔ کیونکہ یہ اس وقت کی پنجاب حکومت کی نظروں میں مشکوک قرار پا چکی تھی۔ اِس جماعت کے ذیلی اراکین کی ایک تنظیم کو حکومت نے غیر قانونی قرار دیا اور سرکاری ملازمین کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ تعلق نہ رکھیں۔ یہ ذیلی تنظیم "احمدیہ انٹیلی جنس سٹاف" کہلاتی تھی اور اس نے حکومت کے مختلف محکموں میں اپنے حلقے قائم کیے ہوئے تھے۔ اِس کے نتیجے میں مسلح افواج میں قادیانی افسران کی ایک فہرست لاہور اور دیگر بڑے شہروں میں تیار کی گئی۔ حکومت کے نوٹس میں یہ بات بھی آئی کہ قادیانی افسران خفیہ اجلاس بھی منعقد کرتے تھے۔"[1]

قادیانیوں کی ان خفیہ کارستانیوں نے ۱۹۵۴ء تا ۱۹۷۱ء تک کئی نئی جہتیں اختیار کیں۔ ایوب خان کے اقتدار پر قبضہ سے قبل ساڑھے پانچ سال کے عرصے کے دوران ملک میں پانچ وزیر اعظم تبدیل کیے گئے۔ ایوب خان کے دور میں قادیانیوں کی نشوونما میں خصوصی

---

[1] اخبار "دی مسلم" اسلام آباد، ۲۴ مئی ۱۹۸۴ء، مشمولہ تحریک احمدیت یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ، بشیر احمد، ص: ۶۰۵، ادارہ اصلاح و تبلیغ، آسٹریلیا بلڈنگ ریلوے اسٹیشن لاہور

سرپرستی کی گئی اور انہیں مستحکم ہونے اور اپنے استبدادی پنجے بیرون ملک پھیلانے کا پورا پورا موقع فراہم کیا گیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا پوتا مرزا مظفر احمد (ایم۔ایم۔احمد) پہلے فنانس سیکرٹری اور بعد میں پاکستان کے منصوبہ بندی کمیشن کا ڈپٹی چیئرمین بنایا گیا۔جس نے پاکستانی معیشت میں علاقائی عدم تعاون اور ناہمواریوں کے بیج بو کر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب پیدا کئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام (قادیانی) پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے چیئرمین اور صدر کا مشیر برائے سائنس وٹیکنالوجی، بشیر احمد چیئرمین Picic اور وائس ایئر مارشل ایم اختر پی۔آئی۔اے کے چیف بنائے گئے۔انہیں ایوب حکومت کی اعانت کے باعث یہ موقع بھی مل گیا کہ وہ مشرقی ومغربی پاکستان کی مذہبی وسیاسی تحریکوں کے خلاف سرگرمیاں جاری رکھیں۔اس دوران دفتر خارجہ میں قادیانی اہلکاروں نے کمال ہوشیاری سے پاکستان کے عرب ممالک کے ساتھ تعلقات کو فروغ نہ پانے دیا۔نوکرشاہی میں ان عناصر نے سرمایہ داریت کو پروان چڑھانے کی حکمت عملی اختیار کی اور پہلے سے طے شدہ حکمت عملی کے مطابق قادیانیوں کیلئے پاکستان کی مسلح افواج کی صفوں میں گھسنے کا سنہری موقع دیا گیا۔اسی طرح دیگر اداروں کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

کراچی ٹیلی ویژن سینٹر میں ایک دینی پروگرام "بصیرت" کے پروڈیوسر کے عہدے پر ایک قادیانی عبیداللہ علیم کی تقرری نے مسلمانوں کو شدید رنج والم میں مبتلا کر دیا اور تمام مکاتب فکر کے علماء نے اس تقرری پر شدید احتجاج کیا۔اس تقرری کو مسلمانوں کے ساتھ شرمناک مذاق سے تعبیر کیا گیا۔راجہ غالب احمد قادیانی کو سرگودھا تعلیمی بورڈ کا چیئرمین بنایا گیا۔جس نے بورڈ کو قادیانی عملے سے بھر دیا۔کنٹرولر امتحانات شفیق الرحمٰن اور ڈپٹی کنٹرولر قادیانی مقرر کئے گئے۔راجہ غالب احمد کو بعد میں چیئرمین ٹیکسٹ بورڈ پنجاب لیکن حکومت کو شدید عوامی احتجاج کی وجہ سے اُسے اُس کے عہدے سے علیحدہ کرنا پڑا۔عبدالقادر ڈاہری قادیانی سچل سرمست کالج نواب شاہ کا پرنسپل تھا۔جو طلباء کو قادیانی جلسوں میں جانے اور قادیانی لٹریچر پڑھنے پر مجبور کرتا

تھا۔گورنمنٹ ٹریننگ کالج لائل پور کا پرنسپل میاں محمد افضل قادیانی تھا۔جو اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھا کر طلباء میں اپنے قادیانی مذہب کی تبلیغ کرتا تھا۔

حکومت نے ادارہ تحقیقات اسلامی کا ڈائریکٹر ایک رسوائے زمانہ افسر شیخ محمود کو مقرر کیا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ شخص مرزائی ہے۔ادارہ تحقیقات اسلامی کی سربراہی پر شیخ محمود جیسے شخص کی تقرری کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مرزائیوں نے اپنے خاص اثر ورسوخ کو استعمال کر کے اس ادارے میں ایسا آدمی مقرر کروایا جو اسلامی قوانین اور اقدار کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی مہارت رکھتا ہو۔واضح رہے کہ شیخ محمود وہی شخص ہے جس نے پہلے آزاد کشمیر میں ڈائریکٹر تعلیمات ہوتے ہوئے زکوٰۃ کی شرح میں ترمیم کی تجویز پیش کی تھی اور اس کے خلاف سارے ملک میں احتجاج کی وجہ سے اسے وہاں سے نکالا گیا تھا۔سندھ کا ہوم سیکرٹری کنور ادریس قادیانی کو مقرر کیا گیا۔غرض کہ قادیانی اس قدر اثر ورسوخ حاصل کر چکے تھے۔کہ انہوں نے اپنے خلاف عوامی ردّعمل اور تنقید کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ تو مُلّا کی روایتی تنگ نظری اور تعصب ہے۔

قادیانیوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو دیکھ کر علماء کرام اور مذہبی جماعتوں کو جہاں ایک طرف سخت مشکل کا سامنا تھا۔تو دوسری طرف علماء کی مخالفت کے مقابلے میں بے رحم مارشل لاء آرڈیننس اور ڈیفنس رولز نے انہیں کافی تحفظ فراہم کیا ہوا تھا۔اس صورتحال میں ضروری ہو گیا تھا کہ وہ وقت و حالات کو دیکھتے ہوئے اب اپنے طریقۂ کار اور حکمت عملی میں تبدیلی پیدا کریں۔چنانچہ علماء کرام اور پاکستان کی مذہبی جماعتوں نے ۱۹۵۳ء کے تحریکی نتائج کو سامنے رکھ کر ایک مربوط اور منظم حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے ایک بار پھر قادیانیوں کی خلاف اپنی صف بندی کی اور نئے سرے سے مختلف محاذوں پر تحریک ختم نبوت کے کام کو جاری رکھا۔

علماء کی تحریک اور جدوجہد کی بدولت پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے قادیانیت کا اصل چہرہ اور کردار نمایاں ہو کر سامنے آچکا تھا اور پاکستان کے گوشے گوشے میں یہ احساس شدت سے

ابھر رہا تھا کہ برصغیر میں اسلام کی سب سے بڑی دشمن تحریک قادیانیت ہے جو حقیقت میں نبوت محمدی ﷺ کے خلاف انگریز کی بدترین سازش اور اسلام کی ابدیت اور اُمت کی وحدت کیلئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تحریک پاکستان کی سالمیت اور استحکام کے بھی درپے ہے۔

قادیانی جو ابتداء میں اور قیام پاکستان کے کافی عرصے بعد تک اپنے آپ کو ایک مذہبی فرقہ ظاہر کر کے اپنے پاؤں جماتے رہے اور سیاسی پناہ گاہیں تلاش کر کے اپنے قدم مضبوط کرتے رہے۔ یہاں تک کہ پاکستان کی فوج ،سول کے تمام شعبوں اور خصوصیات کے ساتھ وزارت خارجہ میں جب اُن کے قدم مکمل طور پر جم گئے تو وہ بیرونی اشاروں پر پاکستان کی سیاست میں غلط فہمیاں پھیلانے، امن وسکون کو برباد کرنے اور پاکستان کی سالمیت کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ قادیانیوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ عالم اسلام میں استعماری طاقتوں کے مہرے کی حیثیت سے اُمت کے اتحاد اور روح جہاد کو مٹانے کی بھی مذموم کوشش بھی کی۔

چنانچہ شورش کاشمیری اپنی کتاب ''تحریک ختم نبوت'' میں لکھتے ہیں کہ:

''مولانا عبدالستار نیازی جو بریلوی مکتبہ فکر کے جید و متبحر نوجوان تھے۔ اُنہوں نے اپنی رہائی کے بعد ختم نبوت کے تقریری محاذ کو ٹھنڈا نہ ہونے دیا اور اس سلسلہ میں تحریک و مسئلہ سے متعلق دو یا تین کتابچے لکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا عبدالستار نیازی عشق رسالت میں قرون اوّل کے مسلمانوں کا مزاج رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے باہر آتے ہی مرزائیوں کو للکارنا شروع کر دیا اور ایوب خان کے دور میں اُس کی حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اُن مسلمانوں کو ''اینگلو مسلمان'' کا لقب دیا جو قادیانی امت کو مسلمانوں میں شمار کرتے اور عقیدۂ ختم نبوت کی اساس سے ناواقف تھے۔ مولانا اِس دوران کئی بار گرفتار ہوئے۔ اسی طرح مولانا سید خلیل احمد قادری جس دن سے رہا ہوئے اُس دن سے قادیانیت کا احتساب اپنے بیان وقلم میں شامل کر لیا۔ مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد

قادری کے بھتیجے علامہ محمود احمد رضوی نے بھی قادیانیت کے خلاف اپنے قلم کی روانی وجولانی قائم رکھی۔ آپ اس سلسلے کی آخری تحریک میں مجلس عمل کے جنرل سیکرٹری رہے۔ ایک ادیب وخطیب ہی نہیں بلکہ عالم ومحدث بھی ہیں۔"[1]

ان حضرات علماء کے علاوہ بے شمار علماء ومشائخ اہلسنت وجماعت نے اس تحریک کو جاری رکھا۔ بقول شورش کاشمیری:

"مولانا ابوالحسنات قادری کی بدولت بریلوی علماء کا طبقہ قادیانیت کے محاذ پر ڈٹ گیا اور انہوں نے اپنے مسلسل وعظوں میں عامتہ المسلمین کے ذہنی احتساب کو مستحکم کیا۔"[2] اور اس تحریک کو رکنے نہ دیا۔

علماء ومشائخ اہلسنت کے اس طرز عمل کی وجہ سے حکومت نے بہت سے علماء کرام کو جنہوں نے قادیانیت کی مخالفت کی فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دینے کا الزام لگا کر گرفتار کیا۔ قادیانی مخالف پریس کو دبایا گیا۔ کئی اخبارات کے مدیروں اور ناشران کو گرفتار کیا گیا۔ ان کے ڈیکلریشن منسوخ کیے گئے۔ لیکن اس سب کے باوجود علماء کرام نے نہایت پامردی اور بہادری سے ختم نبوت کے اعلیٰ وارفع مقصد کیلئے لڑتے ہوئے تحریک ختم نبوت جاری رکھی۔

قادیانیوں کے خلاف عدلیہ کے چند تاریخ ساز فیصلے

اسی دوران پاکستان کی بعض اعلیٰ عدالتوں نے قادیانیت کے خلاف تاریخ ساز مدلل فیصلے دے کر مستقبل میں عوام اور حکومت کیلئے فیصلہ کن راہ عمل متعین کرنے کے ساتھ ساتھ قادیانیت کو اسلام کے دینی حصار میں پناہ لینے کے قابل بھی نہ چھوڑا۔ جذبہ ایمانی سے مزین چند تاریخ ساز فیصلے درج ذیل ہیں۔

۲۵ ، مارچ ۱۹۵۴ء کو سینئر سول جج راولپنڈی میاں محمد سلیم صاحب کی عدالت میں قادیانی

---

[1] شورش کاشمیری، تحریک ختم نبوت، ص: ۱۶۶،۱۷۰، الفیصل ناشران وتاجران کتب، اردو بازار لاہور، مارچ ۲۰۰۳ء۔

[2] شورش کاشمیری، تحریک ختم نبوت، ص: ۱۷۰، الفیصل ناشران وتاجران کتب، اردو بازار لاہور، مارچ ۲۰۰۳ء۔

خاتون مسماۃ امۃ الکریم کا اپنے سابقہ شوہر مسلمان لیفٹننٹ نذیر الدین ملک کے خلاف مبلغ دو ہزار روپیہ مہر کی وصولیابی اور ۲۴۰۳ روپے مالیت کا سامان جہیز جو اسے شادی کے موقع پر باپ سے ملا تھا اور جو اس کے سابقہ شوہر نے اپنے قبضہ میں رکھ لیا تھا کیلئے مقدمہ دائر کیا۔ مقدمے کے اختتام پر میاں محمد سلیم صاحب نے اپنے فاضلانہ فیصلے میں لکھا کہ

(الف) قادیانیوں کو اہل کتاب تصور نہیں کیا جاسکتا۔

(ب) مدعا علیہ کے ساتھ شادی کے وقت مدعیہ مسماۃ امۃ الکریم قادیانی ہونے کے سبب غیر مسلم تھی۔

(ج) فریقین کا نکاح مطلقاً ناجائز اور باطل تھا۔ اور ازدواجی تعلقات کے بعد بھی اسے جائز نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

(د) مہر قانوناً ناقابل بازیابی ہے۔

اوپر دیئے گئے نتائج اور معلومات کی بناء پر فاضل جج میاں محمد سلیم صاحب نے مسماۃ امۃ الکریم کے حق میں اس کے سابق شوہر سے مبلغ ۲۴۰۳ روپے بابت مالیت سامان جہیز کے حصول کی جو اس کے قبضہ میں تھا ڈگری دے دی۔ مگر اس کا دعویٰ حق مہر کو خارج کر دیا۔ اس فیصلے اور ڈگری کے خلاف دو اپیلیں داخل کی گئیں۔ پہلی قادیانی خاتون امۃ الکریم نے اپنے مہر مبلغ دو ہزار روپے کی وصولی کی اپیل کی اور دوسری لیفٹیننٹ نذیر الدین ملک نے سامان جہیز کی مالیت سے متعلق ڈگری سے چھٹکارا پانے کیلئے اپیل داخل کی۔ ان اپیلوں پر ایڈیشنل سیشن جج راولپنڈی شیخ محمد اکبر صاحب نے ۳، جون ۱۹۵۵ء کو فیصلہ دیتے ہوئے کہا کہ ''میں سمجھتا ہوں کہ اس بحث اور اس سے اخذ کردہ نتائج کی بناء پر یہ بات بڑی آسانی کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ عدالت سماعت نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ درست ہیں۔ چنانچہ میں ان سب کی توثیق کرتا ہوں، مسماۃ امۃ الکریم کی اپیل میں کوئی جان نہیں ہے۔ لہٰذا میں اسے خارج کرتا ہوں۔ اور لیفٹیننٹ نذیر الدین ملک کی اپیل میں بھی کوئی وزن نہیں۔ میں ان کی اپیل بھی خارج کرتا ہوں۔''

۱۳، جولائی ۱۹۷۰ء کو جیمس آباد کی فیملی کورٹ کے جج جناب محمد رفیق گوریجہ نے مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیتے ہوئے ایک مسلمان عورت سے قادیانی کا نکاح فسخ کر دیا۔ پاکستان اور بیرون ملک تمام اخبارات نے اس فیصلے کو جلی سرخیوں میں شائع کیا۔ پاکستان کے تمام حلقوں میں اس فیصلے کا زبردست خیر مقدم کیا اور اسے ایک نیک فال سے تعبیر کیا۔ مسلمان خاتون کی طرف سے اس مقدمے کی پیروی جناب محمد عثمان ایڈووکیٹ نے کی۔

۲۶، فروری ۱۹۷۲ء کو ایڈمنسٹریٹر سول جج چوہدری محمد نسیم نے ایک دعویٰ کا فیصلہ سناتے ہوئے محلہ قاضیاں کے قادیانیوں کو مسجد تعمیر کرنے، اذان دینے اور وہاں تبلیغی مرکز قائم کرنے کی ممانعت کر دی۔ عدالت نے یہ حکم امتناعی دوامی مولوی عبدالرشید کی درخواست پر جاری کیا۔ اس حکم میں کہا گیا کہ فریقین کے عقائد میں شدید اختلاف ہے۔ دونوں فریق ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے ہیں۔ ان حالات میں اس محلہ میں قادیانیوں کو مسجد تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ قادیانی ایک مکان میں احمدیوں کی مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ جب کہ اس علاقے میں قادیانیوں کا ایک بھی خاندان آباد نہیں تھا۔ جس پر درخواست گزار نے شیخ عبدالعزیز ایڈووکیٹ کے توسط سے پہلے ہی عدالت سے اس تعمیر کے خلاف عارضی حکم امتناعی حاصل کرلیا تھا۔ جس کو بعد میں عدالت نے مستقل قرار دیتے ہوئے قادیانی جواب دعویٰ خارج کر دیا۔

۱۴، دسمبر ۱۹۷۲ء کو بہاولپور کے ڈویژنل کمشنر ملک احمد خاں نے نمبرداری کے ایک مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے قرار دیا کہ کسی قادیانی کو مسلمان تپید داروں کی نمبرداری نہیں سونپی جاسکتی۔ کیونکہ قادیانی فرقہ کے اعتبار سے مسلمانوں سے بالکل الگ ہیں۔ اور ان کے مذہبی، سماجی اور معاشرتی معاملات ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ اس لیے فاضل عدالت نے اپنے فیصلے میں احمدی عقائد کے حامل ایک امیدوار کو مسلمان تپید اروں کی نمبرداری کیلئے نااہل قرار دے دیا۔

☆☆☆

منیر انکوائری رپورٹ کا محاسبہ

تحریر

مرتضیٰ احمد خان میکش دُرّانی

پیش لفظ

عدالت تحقیقات فسادات ۱۹۵۳ء کی رپورٹ جو مسٹر چیف جسٹس محمد منیر سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ پنجاب حال چیف جسٹس فیڈرل کورٹ پاکستان اور مسٹر جسٹس محمد رستم کیانی جج ہائی کورٹ پنجاب نے دس ماہ کی لگاتار محنت شاقہ کے بعد تیار کی ہے۔ بہت ہی قیمتی اور غور طلب مندرجات کی حامل ہے۔ اس رپورٹ میں پاکستانی معاشرے کے متعدد اہم عناصر کے انداز فکر و طرز عمل کے نقائص پر تحقیقات کی تیز روشنی ڈالی گئی ہے۔ پاکستان کے ارباب دانش و بینش اگر چاہیں تو اس رپورٹ کے مندرجات کی روشنی میں اپنے ہاں کی کیفیات کا جائزہ لے کر ان نقائص کی اصلاح اور ان مسائل کے حل کی تدابیر سوچ سکتے ہیں جن کی نشان دہی فاضل جج صاحبان نے مکمل اور ہمہ گیر تحقیقات کے بعد کر دی ہے۔

یہ مجمل سا تبصرہ اس خیال سے سپرد قلم کیا گیا ہے کہ عامتہ الناس کو بالعموم اور ملک کے ارباب فہم و فکر کو بالخصوص ان اہم کوائف و مسائل کی طرف توجہ دلائی جائے جن کا ذکر فاضل جج صاحبان نے اس رپورٹ میں نہایت ہی فاضلانہ انداز سے کیا ہے۔ رپورٹ کے مندرجات کے متعلق پڑھے لکھے لوگوں میں بھی فکر و ذہن کا بہت کچھ اُلجھاؤ نظر آ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت کم لوگوں نے اس رپورٹ کو اس توجہ کے ساتھ پڑھا جس کی وہ مستحق تھی۔ اس تبصرہ یا تعبیہ کو ضبط تحریر میں لانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس ذہنی اُلجھاؤ کو دُور کرنے کی سعی کی جائے جو رپورٹ کے متعلق عامتہ الناس میں ترقی پذیر ہے۔ فقط!

مرتضیٰ احمد خان میکش

۲۱/اگست ۱۹۵۴ء

☆

ایک ضخیم اور متنوع دستاویز

عدالت تحقیقات فسادات پنجاب (۱۹۵۳ء) کی رپورٹ جو ایک ضخیم کتاب کی شکل میں شائع ہوئی ہے۔ اس ہاتھی کی مانند ہے جس کے مختلف اعضاء کو چھ (۶) اندھوں نے اپنے ہاتھوں سے ٹٹولا اور اپنی حس لامسہ کی مدد سے ہاتھی کے متعلق ہر ایک نے اپنا جدا جدا مخصوص تصور قائم کر لیا۔ ایک نے کہا، ہاتھی ایسا تھا جیسے عمارت کا ستون، دوسرا بولا ایک بہت بڑا چھاج، تیسرے نے کہا موٹا سا اژدھا، چوتھے نے کہا کہ ہاتھ بھر کی موٹی رسی، پانچویں نے کہا ناہموار سا چبوترہ، چھٹے نے ارشاد فرمایا وہ تو ایک دیوار سی تھی اور بس۔ اس رپورٹ نے بعینہ اسی قسم کی کیفیت عامتہ الناس میں پیدا کر رکھی ہے اور ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق اس کے متعلق اپنا خیال اور تصور قائم کر چکا ہے یا کر رہا ہے۔

عدالت تحقیقات محض فسادات کی ذمہ داری کا سراغ لگانے اور فسادات کے سلسلے میں حکومت پنجاب کے اختیار کردہ ذرائع کا مکتفی یا نا مکتفی ہونا معلوم کرنے کے لیے معرض وجود میں لائی گئی تھی لیکن اس کا دائرہ کار بتدریج وسیع تر ہوتا چلا گیا اور اس عدالت نے فسادات کے اسباب و علل کی کُنہ تک پہنچنے کی کوشش میں ایسے علمی اور عملی کوائف کا جائزہ بھی لینا چاہا جو اس عدالت کی بجائے اگر کسی علمی بحث و مناظرہ کی مجلس میں پیش کیے جاتے تو مفید تر نتائج حاصل کیے جاسکتے تھے۔

☆ عدالت کن نتائج پر پہنچی ☆ حکومت کی کوتاہی

اہم اُمور تنقیح پر عدالت اس نتیجے پر پہنچی کہ پنجاب کی حکومت (میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کی مسلم لیگی وزارت) نے فسادات کا سد باب کرنے یا ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جو ذرائع اختیار کیے وہ مکتفی نہ تھے بلکہ حکومت قانون ملکی کے احترام کو قائم رکھنے اور امن و آئین کی

حفاظت کرنے کے فرض کی کما حقہ بجا آوری سے قاصر رہی۔

فسادات کی ذمہ داری

ا۔احرار

دوسرے امر تنقیح یعنی فسادات کی ذمہ داری کے بارے میں عدالت کی تفتیش کا نتیجہ یہ ہے کہ ہنگامہ آرائی اور خلل امن کے اس حمام میں مارشل لاء کے حکام کے سوا باقی سب ننگے ہیں۔عدالت نے فسادات کی کیفیت پیدا کرنے کی ذمہ داری بدرجہ اول مجلس احرار اور زعمائے احرار پر عائد کی ہے جنہوں نے ایک مذہبی سوال کو عامۃ الناس میں ہر دل عزیزی حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا اور قادیانیوں کے مقابلے میں ان سے شدید تر جارحانہ طرز عمل اختیار کیا۔

۲۔قادیانی

قادیانیوں کے بارے میں عدالت تحقیقات اس نتیجے پر پہنچی کہ ان کے معتقدات مسلمانوں کے معتقدات سے متغائر ہیں اور مسلمانوں کے لیے ان کا طرز عمل، ان کی جارحانہ تبلیغ اور ان کے عزائم بدرجہ غایت دل آزارانہ اور اشتعال انگیز ہیں۔خود ان کے امام مرزا بشیر الدین محمود، چوہدری ظفر اللہ خان اور مرزائی سرکاری افسروں نے منافرت کے اس جذبے کو ترقی دی جو مسلمانوں میں مرزائیوں کے متعلق پہلے ہی سے بدرجہ اتم موجود تھا۔عدالت نے قادیانیوں کو فسادات کی براہ راست ذمہ داری سے بری قرار دیا یعنی بالواسطہ ذمہ داری کا مورد ٹھہرایا۔

حکومت پنجاب اور میاں دولتانہ

عدالت نے حکومت پنجاب بالخصوص پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کو فسادات کی ذمہ داری میں اس بناء پر شریک گردانا کہ اس حکومت نے احرار کی ایسی سرگرمیوں کو روکنے میں چشم پوشی اور رعایت سے کام لیا جو قانون کی زد اور گرفت میں آسکتی تھیں اور پبلک میں ہر دل عزیز بننے کی خاطر قانون و آئین کا احترام قائم رکھنے کے معاملے میں

کوتاہی اور غفلت سے کام لیا اور ایسے اخبارات کو مالی امداد دی جو ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز (Director Public Relations) کے ایما پر تحریک کو خاص رخ پر ڈالنے کے لیے مضامین شائع کرتے تھے۔

مرکزی حکومت اور خواجہ ناظم الدین

عدالت نے خواجہ ناظم الدین وزیراعظم پاکستان کی مرکزی حکومت کو اس وجہ سے فسادات کا ذمہ دار قرار دیا کہ اس نے چوہدری ظفر اللہ خان کو محض باہر کے ملکوں کی چہ میگوئیوں کے خوف سے وزارت سے برطرف نہ کیا اور مسلمانوں کے مطالبات کو مسترد کر کے ہیجان عمومی کو ترقی دی۔ مزید برآں عدالت نے تعلیمات اسلامیہ کے سرکاری بورڈ کو بھی ذمہ داری کا شریک ٹھہرایا کیونکہ اس بورڈ کے ارکان بھی مجلس عمل کے اقدامات سے متفق تھے۔

مجلس عمل

عدالت کی رائے میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کی مجلس عمل اور علمائے دین کی وہ انجمنیں جنہوں نے مجلس عمل کی ساخت میں حصہ لیا اس بناء پر فسادات کی ذمہ داری میں شریک ہیں کہ مجلس عمل نے اپنی بات منوانے اور اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ''راست اقدام'' (Direct Actions) کا فیصلہ کیا۔

جماعت اسلامی

مجلس عمل کو جن دینی انجمنوں نے تشکیل کیا تھا ان میں سے جماعت اسلامی نے عدالت تحقیقات کے سامنے اپنا کیس (case) اس شکل میں پیش کیا تھا کہ جماعت اسلامی کو مجلس عمل کے فیصلہ ''راست اقدام'' سے اتفاق نہ تھا اور مجلس مذکور کا یہ فیصلہ آئینی ہی نہ تھا لہٰذا فسادات کی ذمہ داری سے جماعت اسلامی کا دامن پاک ہے اور وہ لوگ فسادات کی ذمہ داری میں شریک ہیں جنہوں نے ''راست اقدام'' کا فیصلہ کیا۔

جماعت اسلامی نے اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرنے کے لیے شہادتیں پیش کیں اور ان کے وکیل نے راست اقدام اور فسادات کی ذمہ داری کا بوجھ مجلس عمل کے ارکان پر ڈالنے کے لئے بہت کچھ زور استدلال صرف کیا لیکن عدالت تحقیقات نے جملہ بیانات کی جرح وتعدیل کر کے اس نکتہ پر حسب ذیل فیصلہ دیا:

۱۔ جماعت اسلامی مجلس عمل پنجاب کا عضو تھی۔

۲۔ یہ جماعت اس مجلس عمل کا ایک عضو بھی تھی جسے آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن نے برپا کیا اور جس نے ۱۸؍جنوری ۱۹۵۳ء کو بمقام کراچی "راست اقدام" کی قرارداد منظور کی۔

۳۔ مولانا سلطان احمد نے جو مجلس عمل کے اجلاس کراچی مورخہ ۲۶؍فروری میں حاضر تھے۔ مجلس عمل کی سرگرمیوں سے بے تعلقی کا اظہار نہیں کیا اور یہ پروگرام کہ گورنر جنرل اور وزیراعظم کے دولت کدوں کی طرف رضاکار بھیجے جائیں، اس کی موجودگی میں اور اس کی طرف سے کسی قسم کے احتجاج کے بغیر طے ہوا تھا۔

۴۔ جماعت اسلامی کا کوئی نہ کوئی نمائندہ مجلس عمل کے اجلاسوں میں بہ مقام لاہور وکراچی شامل ہوتا رہا۔

۵۔ اس تاریخ سے لے کر جس دن کہ راست اقدام کی قرارداد منظور ہوئی اس وقت تک جب کہ فسادات اپنے عروج پر تھے۔ جماعت اسلامی نے کوئی پبلک اعلان اس مضمون کا نہیں دیا کہ راست اقدام سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور وہ ان سرگرمیوں سے جو مجلس عمل کے طے کردہ پروگرام کو چلانے کے لئے کی جارہی ہیں- اپنے آپ کو الگ کرتی ہے۔

۶۔ مولانا مودودی نے ۵؍مارچ کو گورنمنٹ ہاؤس میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا کہ عامتہ الناس اور حکومت کے درمیان سول وار(civil war) جاری ہے اور جب تک حکومت طاقت کا استعمال ترک کر کے عوام کے نمائندوں کے ساتھ بات چیت پر آمادہ نہیں ہوتی- امن کی اپیل شائع کرنے کا کوئی موقعہ نہیں۔

۷۔ جماعت اسلامی نے ۵؍مارچ کی قرارداد میں انہی خیالات وآراء کا اظہار کیا جو

مودودی صاحب نے اسی دن گورنمنٹ ہاؤس میں ظاہر کیے تھے۔[1]

فاضل جج صاحبان نے جماعت اسلامی کے بیانات کا تجزیہ کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا:

"ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے جماعت اسلامی کے ذہن کا صحیح طور پر مطالعہ کرلیا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ جماعت مذکورہ اس پروگرام کی موزونیت کی قائل نہ تھی جو راست اقدام کی قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے طے ہوا تھا لیکن وہ پبلک کے سامنے اپنے حقیقی خیالات کا کھلا اور دیانت دارانہ اظہار کرنے سے خائف تھی تاکہ کہیں عوام میں نامقبول نہ ہو جائے۔ گویا اس ذہنیت اور روش میں وہ دوسری سیاسی جماعتوں یا شخصیتوں سے مختلف نہ تھی۔ یہ جماعت بھی دوسری کی طرح کوئی ایسی بات کرنے سے خائف تھی جو اسے عوام کی نکتہ چینی کا تختۂ مشق بنا دے۔"[2]

مسلم لیگ

عدالت کے خیال میں مسلم لیگ اس لیے ذمہ دار ہے کہ اس کی صوبائی کونسل نے ایسی قرارداد منظور کی جس میں قادیانیوں کو مسلمانوں سے جداگانہ عقائد رکھنے والا گروہ قرار دیا اور مسلم لیگ کے بعض لیڈروں اور کارکنوں نے تحفظ ختم نبوت اور راست اقدام کی تحریکات میں عملی حصہ لیا اور مجلس عمل کا ساتھ دیا اور دوسرے لیڈروں اور کارکنوں نے راست اقدام کی تحریک کی مخالفت نہ کی۔ مزید برآں مسلم لیگ نے مقتدر سیاسی نظام کی حیثیت میں ان مسائل پر پبلک کی صحیح رہنمائی نہ کی۔

مجلس عمل کے مطالبات

فسادات کی ذمہ داری کے بارے میں عدالت تحقیقات کے فاضل جج صاحبان جن نتائج

---

[1] رپورٹ انگریزی ص ۲۵۱، ۲۵۲

[2] رپورٹ انگریزی ص ۲۵۳

پر پہنچے ہیں۔ ان سے مترشح ہے کہ اگر اس ذمہ داری کی سزا موت تجویز کی جائے تو احرار کے زعما کو، قادیانی کے لیڈروں اور قادیانی سرکاری افسروں کو، علمائے اسلام کی ایک کثیر جماعت کو خواجہ ناظم الدین اور ان کی کابینہ کے جملہ ارکان کو تعلیمات اسلامیہ کے سرکاری بورڈ کے ممبروں کو میاں ممتاز محمد خان دولتانہ اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کو تختۂ دار پر لٹکا دینا ضروری ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود فاضل جج صاحبان کے ارشاد کے مطابق مطالبات کا بچہ یعنی فساد کا مرکزی نقطہ پھر بھی زندہ رہتا ہے۔ اگر اس بچے کی پرورش کر کے اس سے کام لینے کے لیے کوئی طالع آزما گروہ کھڑا ہو جائے تو ملک میں پھر اسی قسم کی کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں جو مارچ ۱۹۵۳ء کے اوائل میں لاہور اور پنجاب کے دوسرے مقامات پر دیکھنے میں آئیں۔

رپورٹ میں فاضل جج صاحبان نے احرار کی مذمت کرنے میں پورا زور قلم صرف کیا ہے کیوں کہ انہوں نے ایک دینی موضوع کو دنیوی مقصد کی خدمت پر لگا کر اس کا استخفاف کیا اور اپنی ذاتی اغراض کی خاطر عامتہ الناس کے مذہبی جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ (رپورٹ انگریزی ص ۲۵۹) لیکن جہاں تک موضوع فساد کے دینی ہونے کا تعلق ہے عدالت کو اس کی صحت، اہمیت اور موجودگی سے انکار نہیں بل کہ عدالت نے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ مسلمانوں اور قادیانیوں کے درمیان مذہبی حیثیت سے اہم بنیادی اختلافات روز اوّل ہی سے موجود تھے اور موجود ہیں۔ اس سلسلے میں جس قدر نکات مجلس عمل کی طرف سے عدالت کے سامنے پیش کیے گئے عدالت نے اپنی رپورٹ میں ان سب کا ذکر کر دیا ہے اور ان کی صحت کو تسلیم کر لیا ہے، اس سلسلے میں تنقیدات حسب ذیل ہیں:

☆ مسلمانوں اور قادیانیوں کے بنیادی مذہبی اختلافات

☆ احمدی، قادیانی یا مرزائی

سرکاری کاغذات اور پولیس کی رپورٹوں میں اس کیفیت کو جو فسادات معلومہ پر منتج ہوئی: ''احرار احمدی اختلاف'' کی اصلاح سے تعبیر کیا جاتا تھا اور قادیانی اپنے آپ کو ''احمدی''

اور مسلمانوں کو ”غیر احمدی“ لکھنے کے عادی تھے۔ مجلس عمل اور اس کی حلیف جماعتوں کی طرف سے ان الفاظ وتراکیب کے استعمال پر اعتراضات وارد کیے گئے جن کی صحت کو عدالت نے صحیح تسلیم کرتے ہوئے رپورٹ میں لکھا ہے:

”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے سواد اعظم کو جو مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان نہیں رکھتا، ان لوگوں سے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ممیز کرنے کے لیے لفظ ”مسلمان“ استعمال کریں اور احمدیوں کی قادیانی جماعت کے لیے جو مرزا غلام احمد کے نبی ہونے پر ایمان رکھتی ہے ”احمدی“، ”قادیانی“ یا ”مرزائی“ کی اصطلاح استعمال کریں۔“[1]

مرزا غلام احمد کا دعویٰ نبوت

مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کے سلسلے میں فاضل جج صاحبان نے مسلمانوں اور قادیانیوں کے عقائد کی وضاحت کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے:

”اگرچہ مرزا غلام احمد نے شروع شروع میں لوگوں کے سامنے اپنا ہاتھ اس ہدایت کے ساتھ پیش کیا کہ وہ اسے قبول کرلیں تاہم یہ سوال تحقیق طلب ہے کہ آیا اس نے اپنی وحی کے متعلق وحی نبوت کے درجے کا دعویٰ کیا تھا یا نہیں جس پر ایمان لانے سے کوتاہی بعض روحانی اور اُخروی نتائج کی حامل ہے۔ احمدیوں نے اور ان کے موجودہ امام نے احتیاط کوشانہ غور وفکر کے بعد ہمارے سامنے یہ پوزیشن اختیار کی ہے کہ مرزا غلام احمد نے ایسا دعویٰ نہیں کیا لیکن فریق ثانی شدت اصرار کے ساتھ مجادل ہے کہ اس نے ایسا کیا۔ احمدیوں کے لٹریچر میں جس میں مرزا غلام احمد اور احمدیہ جماعت کے موجودہ امام کی بعض تحریرات بھی شامل ہیں، بعض ایسے اظہارات موجود ہیں جو فریق مجادل کے دعویٰ کی تائید کرتے ہیں لیکن ہمارے سامنے اب جو پوزیشن اختیار کی گئی ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ مرزا غلام احمد نے اپنے آپ کو محض اس

---

[1] رپورٹ انگریزی ص ۹

لیے نبی کہا کہ اس کے الہام میں خدا نے اسے اسی طرح ظاہر کیا تھا، وہ کوئی نئی شریعت نہیں لایا، نہ اس نے اصلی شریعت کو منسوخ کیا، نہ اس میں کچھ اضافہ کیا نیز یہ کہ کوئی شخص مرزا قادیانی کی وحی پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے یا اس وحی پر ایمان لانے سے محروم یا قاصر رہ جانے کے باعث دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ ہم پیش ازیں لکھ چکے ہیں کہ ہمارا منصب یہ نہیں کہ ہم اس بات کا فیصلہ کریں کہ آیا احمدی دائرہ اسلام سے خارج ہیں یا نہیں۔ ہم نے اس نقطہ کا ذکر محض اختلافات کی تشریح کرنے کے خیال سے کیا ہے جو احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان مبینہ طور پر موجود ہیں۔ ہم اس امر کا فیصلہ غیر احمدیوں پر چھوڑتے ہیں کہ (اس نئی پوزیشن کے اعلان کے بعد) وہ احمدیوں کو مسلمان سمجھیں یا نہ سمجھیں۔"[1]

قادیانی وکیل نے عقیدہ اجرائے نبوت کی تائید میں قرآن پاک کی جو آیات پیش کیں اور جس نوعیت کے استدلال سے کام لیا۔ اس پر فاضل جج صاحبان نے رائے زنی کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ "ایک سلسلہ استدلال کی بناء پر قرآن پاک کی ان آیات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مستقبل میں یعنی ہمارے رسول اقدس واطہر ﷺ کے بعد بھی ایسے لوگ ظاہر ہوتے رہیں گے جن پر لفظ نبی یا رسول کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ یہاں اس سلسلہ استدلال کی تشریح کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ نہ تو ہم اس امر کا فیصلہ کرنے کے مکلف ہیں نہ ہم سے اس کی توقع کرنی چاہیے کہ آیات مذکورہ کی کون سی مخصوص تفسیر صحیح یا غلط ہے۔"[2]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات وممات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور قیامت کے قریب ان کے نزول کے بارے میں قادیانیوں کے عقائد اور آیات متعلقہ کی قادیانی تفسیر کا ذکر کرتے ہوئے فاضل جج صاحبان

---

[1] رپورٹ انگریزی ص ۱۸۹

[2] رپورٹ انگریزی ص ۱۸۸

لکھتے ہیں کہ:

''مولانا مرتضیٰ احمد خان نے مجلس عمل کی جانب سے بحث کرتے ہوئے بتایا کہ ان آیات اور بعض دیگر آیات قرآنی کی احمدی تفسیریں تاویل وتحریف کے درجے تک پہنچ جاتی ہیں اور اس قسم کی تاویل وتحریف کفر وارتداد پر مستلزم ہے جو اس کے مرتکب کو حلال الدم والمال کے فتویٰ کا مستوجب بنادیتی ہے یعنی ایسے شخص کا خون اور مال (از روئے شریعت اسلام) مباح ہوجاتا ہے۔ ہمیں اس اختلاف کے حسن وقبح پر اپنی رائے ظاہر کرنے کا مکلف نہیں بنایا گیا جس کا مرکزی نکتہ سورہ ۶۳ کی آیت ۵۷ کے لفظ اور مادہ ''وفیٰ'' کے مشتقات جو آیات محولہ بالا میں آئے ہیں نیز سورہ ۶۳ کی آیت ۶۱ کا لفظ انہ ہے۔''[1]

جہاد کے بارے میں قادیانی عقائد

جہاد کے قرآنی حکم کی تنسیخ کے بارے میں قادیانیوں کی طرف سے جو صفائی پیش کی گئی اس کا ذکر بالوضاحت کرتے ہوئے فاضل جج صاحبان نے تحریر کیا ہے:

''جہاد کے بارے میں مرزا قادیانی کی نشریات کا عام انداز ظاہر کرتا ہے کہ یہ تحریریں ان واقعات کے سلسلے میں لکھی گئیں جو ان دنوں سرحد پر رونما ہورہے تھے اور جہاں برطانوی افسروں کے پے در پے قتل کی وارداتیں واقع ہوتی رہتی تھیں۔ ہر برطانی افسر کو جو ہندوستان میں آتا تھا ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ غازی یعنی افغان یا قبائلی مذہبی دیوانے سے محتاط رہے جو کافر کو قتل کرنا مذہبی حیثیت سے کار ثواب اور مالی حیثیت سے نفع بخش خیال کرتا ہے تاکہ بہشت میں اجر پائے۔ ایسے حملے اگر ان کا محرک مذہبی جوش تھا بلا شبہ اسلامی عقیدہ جہاد کے منافی تھے اور مرزا قادیانی نے اس اعتقاد کی تردید کرکے اچھا کام کیا لیکن حکم جہاد کی جو تشریح مرزا قادیانی نے کی اسے انہوں

---

[1] رپورٹ انگریزی ص ۱۹۱

نے ان متملقانہ اور خوشامدانہ بیانات سے جو اس تشریح میں مہربان حکومت برطانیہ اور اس کی مذہبی رواداری کی پالیسی کے بارے میں لکھے۔ مشتبہ بنالیا جب مرزا قادیانی نے اس عدم رواداری جو مسلمان ملکوں میں پائی جاتی تھیں اور انگریزوں کی فراخ دلانہ مذہبی حکمت عملی کے درمیان تحقیر آمیز مقابلہ وموازنہ شروع کر دیا تو مسلمانوں میں مزید غصہ واشتعال پیدا ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا قادیانی کو اس امر کا بہ خوبی احساس تھا کہ ان کے پیش کردہ عقائد کو اسلامی ملکوں میں ارتداد کی نشرواشاعت پر محمول کیا جائے گا۔ جب افغانستان میں عبداللطیف نامی ایک قادیانی کو سنگسار کر دیا گیا تو ان کے اس خیال کی تصدیق ہوگئی ہوگی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں جس میں ترکی نے شکست کھائی جب ۱۹۱۸ء میں انگریزوں نے بغداد فتح کیا تو قادیان میں جشن فتح منایا گیا۔ اس بات نے مسلمانوں کے قلوب میں سخت رنج اور تلخی پیدا کر دی اور وہ احمدیت کو برطانیہ کی لونڈی خیال کرنے لگے۔"[1]

اسلامی اصطلاحات کا استعمال

عدالت تحقیقات نے قادیانیوں کے خلاف مسلمانوں کی ایک اور بہت بڑی شکایت کی صحت کو بھی من وعن تسلیم کرلیا ہے کہ مرزا غلام احمد نے اپنی تحریرات میں انبیاء کرام علیہم السلام اور حضور سید المرسلین ﷺ پر اپنی فضیلت کا اظہار کر کے مسلمانوں کی سخت دل آزاری کی ہے اور قادیانی اپنی مطبوعات میں مسلمانوں کی مقدس مصطلحات مثلاً امیر المومنین، ام المومنین، سیدۃ النساء، صحابہ کرام کو جن کا محل استعمال مخصوص ہو چکا ہے۔ اپنے اکابر کے لیے استعمال کر کے دل آزاری کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں، فاضل جج تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ہمارا وظیفہ یہ نہیں کہ ہم اس امر کا فیصلہ کریں کہ آیا یہ نام صحیح طور پر استعمال کیے گئے یا نہیں لیکن ان اصطلاحات کے استعمال سے مسلمانوں کے احساسات پر جو اثر ہوتا ہے

---

[1] رپورٹ انگریزی ص ۱۹۶

اس کے متعلق ہمیں ذرہ بھر شک نہیں۔ یہ اصطلاحات اپنے مخصوص اور محدود استعمال کی وجہ سے مقدس بن چکی ہیں اور تاریخ اسلام کی بعض اعلیٰ ہستیوں کی یاد سے مختص ہو چکی ہیں۔ اس طرح احمدیوں کے لٹریچر میں حضرت رسول اکرم ﷺ کے خاندان (اہل بیت) کی بعض خواتین کے متعلق جو ذکر ہوا ہے اس کے بارے میں بھی ہماری رائے یہی ہے اگرچہ اس شکایت کی ایک مثال غالباً زیادہ بیہودہ صورت "قلائد الجواہر" میں بھی موجود ہے بلاشبہ حضرت رسول اکرم ﷺ اور کسی اور زندہ یا مردہ شخص کے درمیان کسی قسم کا موازنہ ہر مومن کے لیے دل آزاری کا موجب ہے۔"[1]

پاکستان کی مخالفت

عدالت تحقیقات نے اس امر پر بھی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے کہ قادیانی نہ صرف دیگر اسلامی مملکتوں پر برطانیہ کے راج کو ترجیح دیتے تھے بل کہ تقسیم ملکی سے پہلے وہ پاکستان کی اسلامی مملکت کے قیام کے بھی مخالف تھے اور اب بھی اس امر کے خواہاں ہیں کہ ہندوستان پھر سے متحد ہو کر اکھنڈ بھارت بن جائے۔ فاضل جج صاحبان نے اس نکتہ پر حسب ذیل رائے ظاہر کی ہے:

"جب تقسیم ملکی کے ذریعے سے مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ وطن کے امکانات اُفق پر نمودار ہونے لگے تو آنے والے واقعات کا سایہ احمدیوں کو فکر مند بنانے لگا۔ ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۴۷ء کے آغاز تک احمدیوں کی بعض تحریرات منکشف ہیں کہ وہ برطانیہ کا جانشین بننے کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن جب پاکستان کا دُھندلا سا رؤیا ایک آنے والی حقیقت کی شکل اختیار کرتا نظر آنے لگا تو وہ محسوس کرنے لگے کہ ان کے لیے اپنے آپ کو ایک نئی مملکت کے تصور پر راضی کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ وہ ضرور اپنے آپ کو ایک عجیب مخمصے میں مبتلا محسوس کرتے ہوں گے کیوں کہ وہ نہ تو

---

[1] رپورٹ انگریزی ص ۱۹۷

ایک ہندو دینوی حکومت یعنی ہندوستان کو اپنے لیے پسند کر سکتے تھے، نہ پاکستان کو منتخب کر سکتے تھے جہاں اس امر کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ اعتزال وتفریق کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ان کی بعض تحریرات ظاہر کرتی ہیں کہ وہ تقسیم ملکی کے خلاف تھے لیکن اگر تقسیم معرض عمل میں آ جائے تو وہ ملک کو از سر نو متحد کرنے کے لیے کوشاں رہیں گے۔" (رپورٹ انگریزی ص ۱۹۶)

مسلمانوں سے علیحدگی

عدالت نے اس امر کو بھی تسلیم کرلیا کہ احمدی سرکاری افسر اور ملازم دوسروں کا مذہب تبدیل کراتے رہے ہیں۔(رپورٹ انگریزی ص ۱۹۷)

اور اپنی جداگانہ جماعتی تنظیم رکھتے ہیں۔اس تنظیم کے دفاتر میں اُمور خارجہ کا محکمہ بھی ہے اور اُمور داخلہ، اُمور عامہ اور نشر وتبلیغ کے محکمے بھی قائم ہیں،ان کے ہاں رضا کاروں کا ایک جیش بھی ہے جس کا نام خدام الاحمدیہ ہے جو فرقان بٹالین یعنی کشمیر میں کام کرنے والے مخصوص احمدی بٹالین پر مشتمل ہے۔وہ مسلمانوں سے رشتے ناطے کا تعلق بھی نہیں رکھتے اور نہ مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔(رپورٹ انگریزی ص ۱۹۸)

وہ کسی مسلمان کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھتے،اس سلسلے میں قادیانی فریق نے عدالت کے سامنے اپنے طرز عمل کی جو تصریح پیش کی اور نئی پوزیشن بیان کی،اس بارے میں عدالت کا فیصلہ یہ ہے کہ:

"یہ توجیہہ صورت حال کو بہتر نہیں بناتی کیوں کہ اس خیال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایسے متوفی کی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے جو مرزا غلام احمد پر ایمان نہیں رکھتا،اس طرح یہ نئی توجیہہ درحقیقت ان کے موجودہ طرز عمل کی تصدیق کرتی ہے۔"[1]

---

[1] رپورٹ انگریزی ص ۱۹۹

تکفیر مسلمین

تکفیر مسلمین کے بارے میں قادیانی فریق کی طرف سے جونئی توجیہات عدالت کے سامنے پیش کی گئیں ان کے بارے میں فاضل جج صاحبان کی رائے یہ ہے کہ:

''ہم نے اس موضوع پر احمدیوں کے سابقہ اعلانات دیکھے ہیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ہمارے نزدیک یہ اعلانات اس کے سوا...... اور کسی تشریح کے حامل نہیں کہ جولوگ مرزا غلام احمد پر ایمان نہیں رکھتے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔اب یہ بیان کیا گیا ہے کہ جومسلمان حضرت رسول اقدس واطہر ﷺ کے بعد کسی ''مامورمن اللہ'' کے دعویٰ کو قبول نہ کرے وہ اللہ اور رسول کا منکر نہیں لہٰذا وہ امت میں داخل ہے۔یہ توجیہہ ان کے سابقہ اعلانات سے مختلف نہیں کہ دوسرے مسلمان کافر ہیں۔ حقیقتاً یہ الفاظ ان کے سابقہ اعتقاد کی بالواسطہ از سر نو تصدیق کرتے ہیں کہ ایسے لوگ صرف اس معنی میں مسلمان ہیں کہ وہ حضرت رسول اکرم ﷺ کی امت میں سے ہیں اور اس لحاظ سے ایسے سلوک کے مستحق ہیں جو مسلمانوں کے معاشرہ کے افراد سے ہونا چاہیے،یہ بات یہ کہنے سے بہت مختلف ہے کہ وہ مسلمان ہیں کافر نہیں۔''[1]

اشتعال انگیزیاں

عدالت نے قادیانی اکابر کی تحریروں اور تقریروں کے اشتعال انگیز ہونے کا نوٹس بھی لیا ہے۔''خونی ملا کے آخری دن'' کے عنوان والے مضمون کے بارے میں فاضل جج صاحبان نے لکھا ہے کہ:

''یہ مضمون قطعی طور پر اشتعال انگیز ہے،اس مضمون میں مولانا احتشام الحق اور مولانا محمد شفیع ایسے علماء کے بارے میں جو''مجلس دستور ساز'' سے ملحقہ''تعلیمات اسلامیہ بورڈ'' کے رکن

---

[1] رپورٹ انگریزی ص۱۹۹

ہیں نیز مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں جن کے وسیع مبلغ علم دین سے کسی کو مجال انکار نہیں جو استہزاء آمیز کلمات درج ہیں۔ ان سے نہ صرف ان علماء کی جن کے نام اس مضمون میں لیے گئے ہیں بل کہ سارے علماء کی دل آزاری ہوئی ہوگی۔"[1]

اسی سلسلے میں فاضل جج صاحبان نے مرزا بشیر الدین محمود کی تقریر کوئٹہ (مطبوعہ الفضل مورخہ ۱۳راگست ۱۹۴۸ء) جس میں بلوچستان کو "خالص مرزائی صوبہ" بنا کر تبلیغ احمدیت کا بیس (base) بنانے کے عزائم کا اظہار کیا گیا، ان کے خطبہ جلسہ ربوہ (مطبوعہ الفضل مورخہ ۳رجنوری ۱۹۵۲ء) جس میں مخالفین احمدیت کو دھمکی دی گئی ہے کہ عن قریب مرزا قادیانی یا ان کے کسی جانشین کے سامنے مجرموں کی طرح پیش ہوں گے اور ان کے خطبہ جمعہ (مطبوعہ الفضل مورخہ ۱۱رجنوری ۱۹۵۲ء) جس میں احمدیوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ فوجی محکمہ کی طرح گورنمنٹ کے دوسرے محکموں میں بھی بھرتی ہونے کی کوشش کریں تاکہ تبلیغی پروگرام کو تقویت پہنچے اور اعلان (مطبوعہ الفضل مورخہ ۱۶رجنوری ۱۹۵۲ء) جس میں احمدیوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ ایسے حالات پیدا کر دو کہ ۱۹۵۲ء کے گزرنے سے پہلے پہلے دشمن احمدیت کے آغوش میں گرنے پر مجبور ہو جائے اور بعض دوسری تحریرات کی اشتعال انگیزانہ ماہیت کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

"احمدیوں کی جارحانہ تبلیغ نہ صرف پاکستان میں بل کہ دوسرے ملکوں میں بھی ہنگاموں اور حملوں کی وجہ بنتی رہی ہے۔" (رپورٹ انگریزی ص ۱۹۹، ۲۰۰)

فاضل جج صاحبان نے قادیانیوں کی اشتعال انگیزیوں کے سلسلے میں چوہدری ظفر اللہ خان وزیر خارجہ پاکستان کی اس تقریر کا تذکرہ اس موقع پر تو نہیں کیا جو انہوں نے جہانگیر پارک کراچی کے ایک جلسہ عام میں مورخہ ۱۸رمئی ۱۹۵۲ء کو کی تھی اور جس کی وجہ سے ملک بھر میں غصہ و اشتعال کی ایک زبردست لہر پیدا ہوگئی تھی البتہ رپورٹ کے ابتدائی حصے میں جہاں

---

[1] رپورٹ انگریزی صفحہ: ۱۹۷، ۱۹۸

واقعات کی رفتار کو سلسلہ وار درج کیا گیا ہے۔ اس تقریر کا اور اس سے پیدا ہونے والے ہیجان اور ہنگاموں کا جامع تذکرہ فاضل جج صاحبان کی طرف سے کسی قسم کے تبصرے کے بغیر موجود ہے۔ (رپورٹ انگریزی صفحہ:۷۵ تا ۷۷)

قادیانیوں کی ذمہ داری

رپورٹ کے حصہ بہ عنوان ''ذمہ داری'' میں فاضل جج صاحبان نے احمدیوں کے متعلق حسب ذیل شذرہ سپرد قلم کیا ہے:

''احمدی براہ راست یا بلا واسطہ فسادات کے ذمہ دار نہیں کیوں کہ فسادات حکومت کے اس اقدام کا نتیجہ تھے جو اس پروگرام کے خلاف اختیار کیا جس پر چلنے کا فیصلہ آل مسلم پارٹیز کنونشن نے قرار داد راست اقدام کے ماتحت کیا تھا لیکن مطالبات احمدیوں کے متعلق تھے اور وہ احمدیوں کے عجیب وغریب مخصوص عقائد اور ان کی سرگرمیوں نیز ان کی طرف سے دوسرے مسلمانوں پر اپنے ممتاز ہونے پر زور دیے جانے کی وجہ سے وضع ہوئے از بس کہ یہ عقائد اور سرگرمیاں بلا شبہ مطالبات کے وقوع میں آنے کا سبب تھیں۔ اس لیے اس بات کا فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ آیا احمدی فسادات کا محرک ہونے میں حصہ دار ہیں یا نہیں۔ مسلمانوں کے سواد اعظم سے ان کے اختلافات نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے چلے آرہے تھے اور تقسیم ملکی سے پہلے احمدی کسی قسم کی رکاوٹ یا بندش کے بغیر اپنا پروپیگنڈا کیا کرتے تھے اور لوگوں کو مرتد بنانے کی سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ پاکستان کے قیام کی بدولت کیفیت حال تمام وکمال بدل گئی۔ اگر احمدیوں نے یہ خیال کیا کہ اس بارے میں حکومت کی طرف سے کسی قسم کی پالیسی کے اعلان کا نہ ہونا کہ پاکستان کے اندر اسلام کے سوا دیگر مذہب یا دائرہ اسلام کے فرقہ وارانہ عقائد کی تبلیغ واشاعت کی اجازت کس حد تک دی جاسکتی ہے۔ یہ معنی رکھتا ہے کہ اس نئی مملکت میں ان کی سرگرمیاں خفگی پیدا نہیں کریں گی اور نوٹس میں آئے

بغیر جاری رکھی جاسکیں گی تو وہ اپنے آپ کو بیوقوف بنا رہے تھے۔ تبدیل شدہ حالات نے ان کی سرگرمیوں میں کسی قسم کی جوابی تبدیلی پیدا نہ کی۔ ان کی جارحانہ تبلیغ اور غیر احمدی مسلمانوں کے متعلق ان کے دل آزارانہ اظہارات جاری رہے۔ مرزا بشیر الدین محمود کی کوئٹہ والی تقریر جس میں اس نے اس صوبے کی ساری آبادی کو احمدی بنا لینے اور اسے مزید کارروائیوں کے لئے بیس (مرکز) بنانے کی کھلم کھلا تلقین کی نہ صرف بداندیشہ نہ تھی بل کہ اس کے علاوہ نادانش مندانہ اور اشتعال انگیز بھی تھی۔ اسی طرح اپنے متبعین کو اس کی یہ ہدایت کہ وہ احمدیت کی تبلیغ کے لیے اپنے پروپیگنڈا کو اس قدر تیز کر دیں کہ ساری مسلمان آبادی ۱۹۵۲ء کے اختتام سے پہلے پہلے احمدیت کی آغوش میں آ گرے۔ مسلمانوں کے لیے ان کی ارتداد آفرین سرگرمیوں کا ایک کھلا نوٹس تھی اور ان لوگوں کو جو مرزا غلام احمد پر ایمان نہیں رکھتے، دشمن یا مجرم یا صرف مسلمان کے الفاظ سے یاد کرنا ایسے اشخاص کو اشتعال دلائے بغیر نہیں رہ سکتا جن کی توجہ ان الفاظ کی جانب مبذول کرائی جاتی۔ احمدی افسر سمجھتے تھے کہ ارتداد پھیلانے کے معرکے میں پوری تن دہی اور دل جمعی کے ساتھ حصہ لینا ان کا مذہبی فرض ہے۔

احمدی افسروں کی اس روش نے احمدیوں کے حوصلے اور بھی بڑھا دیے اور وہ ایسی جگہوں پر جہاں انہیں افسروں کی تائید حاصل تھی یا وہ اس کی توقع رکھتے تھے۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے زیادہ قوت کے ساتھ کام کرنے لگے۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ اگر منٹگمری کا انتظامی افسر اعلیٰ احمدی نہ ہوتا تو احمدی کبھی غیر احمدیوں کے ایک مجموعہ دیہات کی طرف تبلیغی مشن پر جانے کی جرأت نہ کرتے جب کوئی سرکاری افسر اپنے فرقہ وارانہ خیالات کا اظہار کھلے بندوں کرنے لگے جیسا کہ بعض احمدی افسروں نے کیا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایسے جھگڑوں میں جہاں اس کی اپنی جماعت کا کوئی فرد شامل ہو اس کی غیر جانب داری اور بے طرفی پر سے اعتماد یکسر اٹھ جائے اس کا فیصلہ خواہ کتنا ہی صحیح اور دیانت دارانہ ہو لیکن اگر وہ فیصلہ کسی ایسے شخص

کے خلاف ہے جو اس کی جماعت سے تعلق نہیں رکھتا تو وہ یہ اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسے فرقہ وارانہ وجوہ کی بناء پر بے انصافی کا شکار بنایا گیا ہے لہٰذا ان افسروں کا طرز عمل بہت ہی افسوس ناک اور بدبختانہ تھا اور ظاہر کرتا تھا کہ یہ افسر اس اُصول کو سمجھنے اور اخذ کرنے سے قاصر ہیں جسے ہر سرکاری افسر کو اپنی روش پر حکم فرما بنانا چاہیے بنابریں ہم مطمئن ہیں کہ اگرچہ احمدی فسادات کے براہ راست ذمہ دار نہیں لیکن ان کی اپنی روش نے ان کے خلاف ایک عام شورش کو اُبھرنے کا موقع بہم پہنچایا اگر (عوام کے) احساسات ان کے خلاف اس قدر تیز نہ ہوتے تو ہمارا خیال ہے کہ احرار بھی اپنے اردگرد مختلف العقائد مذہبی جماعتوں کو جمع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے۔"[1]

فاضل جج صاحبان نے اگرچہ قادیانیوں کو فسادات کا براہ راست ذمہ دار قرار نہیں دیا تاہم اس سلسلے میں مجلس عمل کے پیش کردہ نکات کو من وعن صحیح تسلیم کرتے ہوئے تحریر فرمادیا ہے کہ فسادات کی بالواسطہ ذمہ داری قادیانیوں کے عجیب وغریب عقائد، ان کی جارحانہ اور اشتعال انگیزانہ سرگرمیوں اور قادیانی سرکاری افسروں کے ناروا شوق تبلیغ پر عاید ہوتی ہے جو پاکستان میں مذہبی تفوق حاصل کرنے کی غرض سے اختیار کیا گیا۔

علمی دینی اور نظریاتی حیثیت کے مسائل

فاضل جج صاحبان نے اس رپورٹ میں ان علمی، دینی اور نظریاتی حیثیت کے مسائل ونکات پر بھی تبصرہ آرائی اور خامہ فرسائی کی ہے جو تحقیقات کے دوران میں زیر تدقیق آئے۔ راقم الحروف کے خیال میں عدالت مذکور کا ایوان ان علمی اور نظریاتی مسائل کی تحقیق وتدقیق کے لیے موزوں مقام نہ تھا۔ اس کے بجائے اگر یہ مسائل کسی جداگانہ علمی مجلس یا دیوان عالی کے سامنے زیر بحث لائے جاتے تو مفید تر نتائج حاصل ومترتب کیے جاسکتے تھے۔ فاضل جج صاحبان نے چند ایک علمائے دین اور دیگر گواہوں کے ان بیانات کی بناء پر جو ان سے عدالت کے

[1] رپورٹ انگریزی ص ۲۶۰، ۲۶۱

اندر بر سبیل تعجیل وارتجال حاصل کیے گئے، ان اہم ترین مسائل کا تذکرہ رپورٹ میں کر دیا ہے جو بہت کچھ غور وفکر اور تحقیق وتعدیل کے محتاج ہیں۔ان مسائل کے متعلق صحیح نتائج حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اس مقصد کے لیے مخصوص دیوان عالی مقرر کیا جاتا اور اس میں تنقیحات معین کر کے ارباب علم کو اظہار فکر ورائے کی دعوت دی جاتی۔عدالت مذکور کے لیے افراد واجماعات کے اعمال کا جائزہ لینا تحقیقات کی معینہ تنقیحات کے پیش نظر ضروری تھا لیکن عدالت نے علمی نظریات وتصورات کو بھی کٹہرے میں لا کر کھڑا کر لیا اور ان ''ملزمان'' کو موقع نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی صفائی میں اپنے حسب منشاء گواہ یا وکیل پیش کر سکیں۔ایسے ملزمان جو فاضل جج صاحبان کے ریمارکس کا تختہ مشق بنے، حسب ذیل ہیں:

۱۔ آل مسلم پارٹیز کنونشن کے مطالبات۔
۲۔ مسلم ومومن کی تعریف۔
۳۔ مسئلہ قتل مرتد۔
۴۔ مسئلہ جہاد۔
۵۔ مسئلہ مال غنیمت وخمس۔
۶۔ اسلامی ریاست۔
۷۔ جمہوریت۔
۸۔ نمائندہ حکومت اور نفاذ قانون واستحفاظ آئین۔
۹۔ لہو ولعب اور اسلام۔
۱۰۔ آرٹ اور اسلام۔
۱۱۔ بین الاقوامی قوانین ومجالس اور اسلام۔
۱۲۔ حدیث وسنت۔

ا۔ مجلس عمل کے مطالبات

فاضل جج صاحبان نے آل مسلم پارٹیز کنونشن کے سہ گانہ مطالبات کو ''فسادات کی براہ راست علت'' قرار دیا ہے۔ (رپورٹ انگریزی ص ۱۸۴، ۱۸۵) لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ مقصد جس کے لیے تحریک اُٹھائی گئی۔ خالصتاً دینی تھا۔ [1]

عدالت نے اپنی رپورٹ میں کسی مقام پر بھی مطالبات کو فضول اور بیہودہ قرار نہیں دیا جیسا کہ بعض سرکاری افسروں نے اپنے بیانات میں اور اپنی رپورٹوں میں جو عدالت کے سامنے پیش کی گئیں ظاہر کیا تھا بلکہ یہ لکھا ہے کہ:

> ''مطالبات ایسے خوش نما انداز میں پیش کیے گئے کہ اس زور تاکید کے پیش نظر جو اسلامی یا اسلامی ریاست سے دُور کا تعلق رکھنے والی کسی بات پر دیا جانا ضروری تھا کسی شخص کو ان کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہوئی حتیٰ کہ مرکزی حکومت کو جرأت نہ ہوئی کہ ان چند مہینوں میں جب کہ تحریک اپنی جملہ پیچیدگیوں کے ساتھ عروج اظہار پر تھی۔ اس موضوع پر کوئی ایک آدھ اعلان عام ہی شائع کر دیتی۔'' [2]

فاضل جج صاحبان نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ:

علمائے اسلام کے یہ مطالبات مان لیے جاتے تو فساد برپا نہ ہوتا، اس صورت میں ''چوہدری ظفر اللہ خان کے عزل وطرد پر بین الاقوامی حلقوں میں کچھ ہلچل مچتی لیکن پاکستان کی آبادی (حکومت کے) اس اقدام پر نعرہ ہائے تحسین بلند کرتی۔'' (رپورٹ انگریزی ص ۲۸۲)

فاضل جج صاحبان نے کیفیت حالات کا تجزیہ کر کے ان اسباب وعلل کو ڈھونڈ نکالنے کی سعی کی ہے جن کی بناء پر خواجہ ناظم الدین اور ان کی حکومت نے اپنے ہاں کے عوام کے یہ سادہ سے مطالبات منظور کرنے کی بجائے ملک کو ایسے خطرات میں ڈالنا گوارا کر لیا جو مارشل لاء

---

[1] رپورٹ انگریزی ص ۲۵۹

[2] رپورٹ انگریزی ص ۲۳۵

کے نفاذ پر منتج ہوئے اگر خدانخواستہ مارشل لاء بھی امن وآئین کے قیام وتحفظ کے مقصد میں ناکام رہ جاتا تو نہ معلوم پاکستان کا حشر کیا ہوتا!!!

فاضل جج صاحبان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ خواجہ ناظم الدین نے کسی ملکی مفاد کے پیش نظر ایسا نہیں کیا بلکہ انہیں باہر کے ان ملکوں کی رائے کا خوف لاحق تھا جہاں چوہدری ظفر اللہ خان کو بہت کچھ عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ بقول عدالت انہیں خوف تھا تو یہ کہ:

"چوہدری ظفر اللہ خان بین الاقوامی دنیا میں بہت شہرت رکھتے ہیں اور احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی برطرفی کی خبر بڑے وسیع پیمانے پر نشر ہوگی اور بین الاقوامی تنقیدات کا مورد بنے گی۔ اس برطرفی کی کوئی ایسی تشریح جو بین الاقوامی ضمیر کو مطمئن کر سکتی۔ تلاش کرنا مشکل ہوگا..... لہٰذا مطالبات کی منظوری بین الاقوامی دنیا میں چہ میگوئیوں کے دروازے کھول دیتی اور بین الاقوامی دنیا کی توجہ نفیاً یا اثباتاً پاکستان کے واقعات کی رفتار کی طرف جلب ہونے لگتی۔"[1]

فاضل جج صاحبان نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"خواجہ ناظم الدین کو یہ خیال بھی تھا کہ ہندوستان بھی اس صورت میں پاکستان کو بدنام کرنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔"[2]

قصہ مختصر فاضل جج صاحبان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

"اگر مطالبات منظور کر لئے جاتے تو پاکستان کو بین الاقوامی سوسائٹی سے خارج کر دیا جاتا۔" (رپورٹ انگریزی ص ۲۸۲)

فاضل جج صاحبان نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ خواجہ ناظم الدین محض باہر کی دنیا کی نظروں میں پاکستان کو نکو بنانے کے خوف سے پہلے تو مطالبات کے بارے میں علماء سے گفت وشنید کرتے رہے تاکہ وہ اپنے اصرار سے باز آ جائیں اور آخر کار انہوں نے مطالبات کو مسترد

---

[1] رپورٹ انگریزی ص ۲۳۳

[2] رپورٹ انگریزی ص ۲۳۳، ۲۳۴

کر دیا اور اس بچے کو قتل کر کے اسے ختم کر دینے کے در پے ہو گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے باوجود فاضل جج صاحبان کی رائے میں مطالبات کا یہ بچہ جسے احرار نے پیدا کیا اور علمائے اسلام نے اپنایا اور دولتانہ نے کراچی کی جانب نہر کھدوائی اور اس بچے کو صندوق میں ڈال کر اس نہر میں مرکزی حکومت کی طرف بہا دیا۔

''ابھی زندہ ہے اور انتظار کر رہا ہے کہ کوئی آئے اور اسے اٹھالے۔ پاکستان کی دولت خداداد میں سیاسی زہرنوں طالع آزماؤں اور مجہول الکیفیت لوگوں سب کے لئے پنپنے کا موقع ہے اور کوئی بھی اس بچے کو اپنی گود میں لے کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ ہمارے سامنے جن دو شخصوں نے ایسے کیریر (career) سے انکار کیا ہے، ان میں سے ایک تو خان سردار بہادر خان وزیر مواصلات پاکستان ہیں اور دوسرے مسٹر حمید نظامی ایڈیٹر ''نوائے وقت'' ان دونوں نے اس بچے سے بیزاری کا اظہار کیا خواہ اس کے نتائج کچھ بھی کیوں نہ ہوں۔'' (رپورٹ انگریزی ص۲۸۶)

فاضل جج صاحبان کے ان ریمارکس سے واضح طور پر کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ آیا عدالت نے اس بچے کو جسے باشندگان ملک کی بھاری اکثریت کی سرپرستی حاصل ہے، عصر حاضر کی بین الاقوامی دنیا کی چہ میگوئیوں کے خوف سے گشتنی اور گردن زدنی قرار دے دیا ہے یا اس کے زندہ رہنے کا حق تسلیم کیا ہے لیکن یہ چاہا ہے کہ سیاسی رہزن، طالع آزما اور مجہول الکیفیت اشخاص اس کے سرپرست نہ بننے پائیں اور اسے اپنی دنیوی اغراض کے لیے استعمال نہ کریں۔

۲۔ مسلم کی تعریف

عدالت تحقیقات کے فاضل جج صاحبان نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

''ہم نے بعض سرکردہ علماء سے مسلم کی معین تعریف کرنے کے متعلق سوالات کیے لیکن تحقیقات کے اس حصے کے نتائج اور کچھ بھی کیوں نہ ہوں لیکن تسلی بخش نہ تھے۔ اگر ایسے

آسان سے مسئلے پر علماء کے دماغوں میں کافی حد تک الجھاؤ موجود ہے تو خیال کیا جاسکتا ہے کہ پیچیدہ تر امور میں ان کے باہمی اختلافات کی حالت کیا ہوگی۔"[1]

اس کے بعد رپورٹ میں بعض علمائے کرام کے وہ جوابات درج کیے گئے ہیں جو انہوں نے عدالت کے سوالات پر بیان کیے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ:

"(مسلم کی) ان متعدد تعریفات کو جو علماء نے کیں۔ پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اس کے سوا اور کیا تبصرہ کرسکتے ہیں کہ کوئی سے دو عالم دین اس بنیادی مسئلے پر متفق نہیں۔ اب اگر ہم ان علماء کی طرح اپنی طرف سے مسلم کی تعریف لکھیں اور وہ تعریف ان سب علماء کی پیش کردہ تعریف سے مختلف ہو تو ہم ان سب کے اتفاق سے دائرہ اسلام سے خارج کردیے جائیں گے اور اگر ہم ان میں سے کسی ایک عالم کی پیش کردہ تعریف کو اختیار کریں تو ہم اس عالم دین کی رائے کے مطابق تو مسلمان رہیں گے لیکن دوسرے علماء کی پیش کردہ تعریف کے مطابق "کافر" بن جائیں گے۔"[2]

مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ فاضل جج صاحبان کا استنباط صحیح نہیں۔ علمائے دین نے عدالت کے اس سوال کے جواب میں جو بیانات دیے وہ الفاظ و عبارت کے لحاظ سے تو بلاشبہ ایک نہیں لیکن معنی اور مفہوم کے اعتبار سے ان میں کسی قسم کا اختلاف نظر نہیں آتا۔ جن علمائے دین سے یہ سوال کیا گیا ان سب نے توحید باری تعالیٰ اور رسالت محمدیہ پر ایمان لانے اور ضروریات دین کا اقرار کرنے کو "مسلم" کہلانے کے لیے ضروری قرار دیا۔ اگر وہ علمائے دین جن سے یہ سوال کیا گیا عدالت کے سامنے "مسلم" کی جامع ومانع تعریف پیش کرنے سے قاصر رہ گئے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں اچانک اس سوال کا سامنا کرنا پڑا اور انہیں معلوم نہ ہوسکا کہ عدالت ان سے مسلم کی ایسی جامع ومانع تعریف حاصل کرنا چاہتی ہے جسے اسلامی مملکت کے دستور اساسی میں شامل کیا جاسکے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے صحیح طریق کار یہ ہے کہ یہ سوال

---

[1] رپورٹ انگریزی ص ۲۱۵

[2] رپورٹ انگریزی ص ۲۱۸

علمائے دین کی ایک مجلس کے سامنے پیش کر کے مسلم کی جامع تعریف معین کرالی جائے۔

۳۔ارتداد

فاضل جج صاحبان نے ارتداد اور کفر و تکفیر کے بارے میں علمائے دین کے باہمی اختلافات کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ تکفیر کے ان فتووں کی موجودگی میں جو مختلف فرقوں کے علماء نے ایک دوسرے کے بارے میں دے رکھے ہیں۔ارتداد کے جرم کے اطلاق کا دائرہ بہت وسیع ہو جائے گا اور وہابیوں، دیوبندیوں، بریلویوں، شیعوں اثنا عشریوں وغیرہ میں سے ایک فرقہ کو چھوڑ کر دوسرے فرقے کے عقائد قبول کرنے والے شخص کو مرتد سمجھنا پڑے گا۔ فاضل جج صاحبان نے کفر و ارتداد کی بحث کے دوران میں جن مشکلات کا نوٹس لیا ہے وہ بلاشبہ غور طلب ہیں اور ایک اسلامی مملکت کے علمائے دین کو ان مسائل کے بارے میں معین اُصول وقواعد ضبط تحریر میں لانے پڑیں گے جن کو دستور اساسی اور قوانین ملکی کے لئے مشعل راہ بنایا جاسکے۔فاضل جج صاحبان رپورٹ کے اس مقام پر اگر تکفیر کی وہ تصریح درج کر دیتے جو مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری نے عدالت کے سامنے پیش کی تھی اور بتایا تھا کہ ان کے نزدیک کفر کی دو قسمیں ہیں: ایک کفر قطعی اور ایک کفر فقہی، کفر قطعی کی صورت میں اس کا مرتکب دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور کفر فقہی کی صورت میں دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا تو رپورٹ کے پڑھنے والوں کو اس اشکال کی ماہیت سمجھنے میں بہت مدد ملتی جس کی طرف فاضل جج صاحبان نے ملک کے ارباب دانش و بینش کو توجہ دلائی ہے۔

۴۔مسئلہ جہاد اسلامی

فاضل جج صاحبان نے شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریرات، ان کے بیانات نیز بعض علماء کے جوابات سے فریضۂ جہاد بالسیف اور اس کے متعلقہ نکات مثلاً غنیمت، خمس، اسیران جنگ، دارالحرب، دارالسلام، ہجرت، غازی اور شہید وغیرہ پر بھی

مجمل سا تبصرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ جہاد اور اس کے متعلقہ مسائل کے بارے میں جو آراء عدالت کے سامنے پیش کی گئیں وہ ان خیالات وافکار سے لگاؤ نہیں کھاتیں جو عصر حاضر کے فکر نے جارحیت، نسل کشی، بین الاقوامی جرائم کی عدالتی گیرائی اور بین الاقوامی قوانین کے مسلمات وقواعد وغیرہ کے متعلق قائم کر لیے ہیں۔ اسی فصل میں فاضل جج صاحبان نے قرآن پاک کی آیات کے ناسخ ومنسوخ ہونے کی بحث کا ذکر بھی کیا ہے جو قادیانی فریق کی طرف سے پیش کی گئی۔

مجھے یہ کہنے میں، تامل نہیں ہونا چاہیے کہ ان مسائل کے بارے میں فاضل جج صاحبان کے افکار جس التباس کا شکار ہوئے ہیں وہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ جہاد اور اس کے متعلقہ مسائل کے اسلامی تصورات نامکمل صورت میں عدالت کے سامنے آئے۔ اگر عدالت ان مسائل کے بارے میں پوری تحقیقات کرنے کی زحمت گوارا کرتی تو جج صاحبان کے ضمائر پر یہ بات روشن ہو جاتی کہ جنگ اور اس کے متعلقہ کوائف کے بارے میں اسلام کے تصورات ان تصورات سے کہیں افضل اور نوع انسانی کے لیے آیۂ رحمت وموجب خیر وبرکت ہیں جو عصر حاضر کے مفکرین نے صدہا سال کے تجربوں پر غور وفکر کرنے کے بعد قائم کیے۔ قوانین جنگ کے بارے میں اسلام کے صحیح تصورات اگر بین الاقوامی محافل کے سامنے پیش کیے جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ عصر حاضر کا دماغ جو نوع انسانی کی مشکلات کا حل تلاش کرنے کی جستجو میں ہے، انہیں قبول نہ کرے۔ اسلام کے جہاد کا بنیادی نکتہ دین اسلام اور مسلمانوں کے جان ومال، عزت وآبرو اور شئون ملی کے دفاع کی خاطر لڑنا یعنی اسلحہ کے ساتھ جنگ کرنا ہے اور جب تک اسلام اور مسلمانوں کے شئون ملی سے برسر پیکار رہنے والی قومیں موجود ہیں، مسلمانوں کے لیے شمشیر بکف رہنا اور قرآن پاک کے بتائے ہوئے قواعد واصول کے مطابق دفاعی جنگ جاری رکھنا ضروری ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار نے یا مودودی صاحب نے جہاد کا مقصد جو یہ بیان کیا ہے کہ تلوار کی طاقت کے بل پر دین اسلام کی اشاعت کی جائے وہ صحیح نہیں۔ اس بنیادی نکتہ کو سمجھ لینے کے بعد دار الحرب، دار السلام، عام کیفیت میں جہاد کے فرض کفایہ ہونے اور خاص حالات میں فرض لازم بننے کے مسائل بہ خوبی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ مال غنیمت، اسیران

جنگ اور دشمن سے بحالت جنگ اور بعد از جنگ سلوک کرنے کے بارے میں اسلام کے احکام ان قواعد وضوابط سے کہیں زیادہ افضل ہیں جن پر عصر حاضر کی متمدن دنیا عمل پیرا ہے۔ اسلام کو جارحیت اور نسل کشی کا حامی قرار دینا دشمنان اسلام کا پروپیگنڈا ہے۔ مسلمانوں نے عملاً جارحیت اور نسل کشی سے اجتناب کیا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں نسل کشی کی کوئی مثال دکھائی نہیں جاسکتی۔ حالانکہ اسلام سے پہلے اور بعد عصر حاضر تک بعض اقوام دشمن کی نسل کشی کو جائز سمجھتی چلی آئی ہیں اور اس پر عمل پیرا ہوتی رہی ہیں۔ ایک صحیح اسلامی مملکت کو اس امر کا خوف لاحق نہیں ہوسکتا کہ عصر حاضر کے بین الاقوامی قوانین کے ساتھ اسلام کے قوانین منطبق نہیں ہوتے بلکہ صحیح اسلامی مملکت اگر بین الاقوامی محافل کے سامنے اسلام کے قوانین پیش کرے تو دنیا کے مذاق سلیم کو اپنا ہمنوا بنا سکتی ہے۔

۵۔مال غنیمت اور خمس

مال غنیمت اور خمس کے بارے میں اسلام کے قانون کے متعلق فاضل جج صاحبان نے اس اندیشے کا اظہار کیا ہے:

''البتہ اگر غنیمت اور خمس کو جہاد کے لوازم خیال کیا جائے تو بین الاقوامی سوسائٹی اسے خالصۃً لوٹ مار کے اقدام سے تعبیر کرے گی۔''(رپورٹ انگریزی ص ۲۲۷)

اس معاملے میں بھی فاضل جج صاحبان کو اس وجہ سے التباس ہوا کہ ان کے سامنے مسئلے کی ماہیت جامع صورت میں پیش نہیں ہوئی۔ اسلام کے نزدیک جہاد ایک مذہبی فریضہ ہے۔ جو خالصۃً فی سبیل اللہ ادا کیا جاتا ہے۔ جہاد کی نیت کو اگر کسی قسم کے دنیوی لالچ سے آلودہ کرلیا جائے تو وہ جہاد نہیں رہتا لیکن جنگ میں مال غنیمت کا ہاتھ آنا ایک لازمی امر ہے۔ عصر حاضر کی جنگوں میں بھی فاتح فریق مال غنیمت پر قبضہ جمالیتا ہے اور وہ مال فاتح فریق کا حق متصور ہوتا ہے، یہی قانون اسلام کا ہے۔ اسلام کے رو سے اُصولاً مال غنیمت بیت المال کا حق متصور ہوتا ہے۔ ''یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ''(الانفال:۱) کی آیہ کریمہ اس

پر دال ہے۔

اس کے بعد خمس یعنی پانچویں حصے کو بیت المال میں رکھنے اور باقی مال کو مجاہدین پر بحصہ رسدی تقسیم کر دینے کا جو حکم قرآن پاک میں مذکور ہے وہ مخصوص حالات سے متعلق ہے۔ یہ مال صرف ان مجاہدین پر بانٹا جاتا ہے جو محض اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کی نیت خالص کے ساتھ اپنے خرچ پر اور اپنا ساز و سامان لے کر میدان جنگ میں حاضر ہوں۔ اسلام نے عربوں کے رواج کو کہ وہ فتح کی حالت میں مدمقابل کے اموال کو لوٹنا اپنا حق سمجھتے تھے بکلیتہً محو کرنے کے احکام صادر کیے ہیں اور انفرادی حیثیت سے دشمن کا مال لوٹ کر اپنے قبضے میں لینا قطعاً ممنوع قرار دیا ہے۔ خمس و تقسیم کا حکم صرف اس مال کے لئے ہے جو جنگ کے نتیجے میں خود بہ خود ہاتھ لگ جائے اور اس کی تقسیم بھی امیر کی مرضی پر موقوف ہے۔ امیر چاہے تو سارے مال غنیمت کو بیت المال میں داخل کر کے مجاہدین کے وظائف مقرر کر سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت فاروق اعظم نے فتح ایران کے بعد کیا اگر مال غنیمت اور اسیران جنگ کے بارے میں دنیا کی اقوام باہمی مشورے سے ایسا قانون بنائیں جس پر عمل کرنا سب کے لیے ضروری ہو تو اسلام مسلمانوں کو ایسے بین الاقوامی معاہدات طے کرنے سے نہیں روکتا جس کا فائدہ متحارب فریقوں کو یکساں طور پر پہنچتا ہو۔ ایسے متبادل معاہدات کرنے میں مسلمانوں کو کسی قسم کی دقت پیش نہیں آ سکتا البتہ جہاں اسیران جنگ کا تبادلہ ممکن نہ ہو وہاں اسلام نے ہزیمت خوردہ دشمن کے ساتھ انسانیت کا سلوک کرنے کے لئے انہیں اجتماعی طور پر یا انفرادی طور پر غلام بنا لینے کی اجازت دی ہے اور دنیا جانتی ہے کہ اسلام کے ہاں جس کیفیت کو غلامی کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ کس قدر رحم دلانہ سلوک کی حامل ہے۔ دنیا کی مہذب ترین قومیں عصر حاضر میں اسیران جنگ کو موت کے گھاٹ اُتارنے، انہیں بدترین صورتوں میں غلام بنا کر رکھنے کی مرتکب ہو رہی ہیں اور بدنام اسلام کو کیا جا رہا ہے کہ اس نے اسیران جنگ کو مخصوص حالات میں غلام بنا کر رکھنے کی اجازت دے دی۔ اس بات کو کوئی نہیں دیکھتا کہ اسلام کے ہاں غلام کے حقوق کیا ہیں؟ اس کا درجہ کیا ہے؟ عصر حاضر کا دماغ اسیران جنگ کے متعلق کوئی ایسا قاعدہ وضع نہیں کر سکا جو اسلام

کے بنائے ہوئے قاعدے سے بہتر ہو اور جس کی رُو سے جنگی اسیر امن وعافیت کی زندگی بسر کرنے کے قابل بن سکتا ہو۔

۶۔اسلامی ریاست

ریاست اور حکومتی نظام کے متعلق اسلام کے تصورات کیا ہیں؟ اس موضوع پر فاضل جج صاحبان نے بعض گواہوں کے بیانات کی روشنی میں مسئلے کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ اسلامی ریاست وامر کے بارے میں علمائے کرام نے جو تصورات پیش کیے ہیں وہ جمہوری ریاست کے ان تصورات سے بہت مختلف اور متصادم ہیں جو عصر حاضر کے سیاسی فکر نے وضع کر رکھے ہیں۔ اس سلسلے میں فاضل جج صاحبان نے افکار کے اس اُلجھاؤ کا بھی ذکر کیا ہے جو پاکستان کی اسلامی مملکت کا تصور پیدا کرنے والے زعمائے فکر وعمل کے دماغوں میں پایا جاتا ہے اور لکھا ہے کہ "قرارداد مقاصد" جس پر پاکستان کے دستور اساسی کی بنیاد رکھی گئی ہے خود اسلامی ریاست کے اس تصور سے لگاؤ نہیں کھاتی جو بعض علماء نے عدالت کے سامنے پیش کیا۔ فاضل جج صاحبان نے اس بارے میں فکر وتخیل کے غیر واضح ہونے کے متعلق جو تجزیہ کیا ہے اس کی صحت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی سٹیٹ کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں افکار کا اُلجھاؤ ان متصادم ومتخالف نظریات کا نتیجہ ہے جو دنیا میں آج سے نہیں بل کہ بہت پہلے سے موجود ہیں اور سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ علمائے اسلام نے کسی دور میں بھی سٹیٹ کے متعلق خالص اسلامی تصورات کو پوری طرح مدون کرنے کے لیے اس توجہ تدقیق اور محنت سے کام نہیں لیا جس سے کہ انہوں نے فقہ، حدیث، اخلاقیات اور دیگر دینی اور دنیوی علوم کی تدوین کی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر دنیا کے کسی خطے میں اسلامی نظام سیاست قائم کیا گیا تو اس کے خدوخال ان نظام ہائے سیاسی سے مختلف ہوں گے جو جمہوری نظریات کے نام پر دنیا کے مختلف ملکوں میں قائم ہیں اور چہرے مُہرے کے اعتبار سے خود اپنے درمیان بہت کچھ مختلف انداز رکھتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان مفکرین تحقیق وتدقیق اور بحث وتمحیص سے کام

لے کر اسلامی ریاست کا ایک جامع نظام نامہ مرتب کریں تاکہ افکار کے اس اُلجھاؤ کو دور کیا جاسکے جو اس سلسلے میں دماغوں کے اندر پایا جاتا ہے۔

۷۔ لہو ولعب اور آرٹ

فاضل جج صاحبان نے بعض علماء سے فنون لطیفہ اور لہو ولعب کے متعلق بھی سوالات کیے اور ان کے جوابات کی بناء پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے بعد مجسمہ سازی، مصوری، فوٹوگرافی، موسیقی، ناچ، مخلوط اداکاری، سینما، تھیٹر اور تاش، شطرنج وغیرہ کو بند کرنا پڑے گا۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام مخرب اخلاق آرٹ اور تضیع اوقات کرنے والے کھیل تماشوں کی اجازت نہیں دیتا اور ایک معاشرہ جو اسلامی تصورات کو زندگی بسر کرنے کے لیے راہ عمل بنائے گا، ہر اس بات کو معیوب سمجھے گا جو اسلام کے معیار اخلاق پر پوری نہیں اُترتی لیکن اس کا معنی یہ نہیں کہ اسلام فنون لطیفہ اور ایجادات عصری کے صحیح استعمال کا بھی مخالف ہے۔ فنون لطیفہ ایجادات کے متعلق جواز وعدم جواز کا بنیادی معیار اسلام کے نزدیک یہ ہے کہ اگر وہ لہو ولعب کے لیے ہیں تو ان کا یہ استعمال ناجائز ہے اور اگر ضرورت وافادیت کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں تو ان پر شرعی حیثیت سے کسی قسم کا اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔ بنابریں اسلامی ریاست کو فنون لطیفہ اور کھیل تماشوں کے بارے میں امتناع وعدم امتناع کا فیصلہ ان کی افادی حیثیت کے پیش نظر کرنا پڑے گا خواہ یہ بات تہذیب عصری کے دل دادگان کے طبائع پر گراں گزرے۔

۸۔ جمہوریت، قیادت اور نمائندہ حکومت

عدالت تحقیقات کو ان ذرائع کے مکتفی یا نامکتفی ہونے کا جائزہ لینا تھا جو حکومت پنجاب نے فسادات کو دبانے کے لیے اختیار کیے۔ اس سلسلے میں فاضل جج صاحبان نے جمہوریت، قیادت اور نمائندہ حکومت کے موضوعات پر بھی ضمناً تبصرہ کیا ہے اور لکھا ہے:

''فریق ہائے مقدمہ کے فاضل وکلاء نے ہمارے سامنے جمہوری اُصولوں کی بناء پر اپیل کی اور بڑی شدومد کے ساتھ اس بات پر زور دیا کہ مطالبات متفقہ تھے اور ایک

جمہوری ملک میں جب کسی مطالبے کو اتنی طاقت ور اور ہمہ گیر تائید حاصل ہو تو حکومت اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے مجبور ہے خواہ اسے منظور کرنے کے نتائج کچھ بھی کیوں نہ ہوں۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہمارے سیاسی لیڈر جنہیں عوام اپنے ووٹ سے منتخب کرتے ہیں، اقتدار کی گدیوں پر متمکن ہونے کی پوزیشن محض اس لیے پاتے ہیں کہ عوام انہیں اس جگہ پر بٹھاتے ہیں، اس لیے وہ اپنے ووٹروں کی خواہشات کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہیں۔ وزارت اور مسلم لیگ کی جانب سے بھی ہمارے سامنے اسی اُصول کا اعادہ کیا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ نمائندہ طرز کی حکومت میں سیاسی لیڈر کو اسی صورت میں عوام کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ وہ عوام کے احساسات، معتقدات اور خواہشات کا احترام کرے اور انہیں جامۂ عمل پہنائے لیکن ایک ایسے ملک میں جس کے عوام کا حصہ غالب جاہل ہو اور نہایت معمولی شرح فیصد تعلیم یافتہ اشخاص کی ہو۔ اس موقف کا اعتراف اس اضطراب آفرین نتیجہ پر لے جائے گا کہ ہمارے لیڈر بلند خیالات کی طرف سے کورے رہتے ہوئے عوام کی جہالت وعصبیت کے پیکر بنے رہیں جن ملکوں کے انتخاب کنندگان اپنے ووٹ کی قدر و قیمت سے واقف ہوں اور اپنے ہاں کے مخصوص مسائل اور دنیا کے عمومی واقعات و رجحانات کو سمجھنے کے لئے فہم و ذکاوت کا کافی سرمایہ رکھتے ہوں اور قومی اہمیت کے جملہ اُمور پر صحیح فیصلہ کرنے کے لیے کافی حد تک ترقی یافتہ فکر کے مالک ہوں وہاں لیڈروں کو عوام کے فیصلے کے مطابق عمل کرنا چاہیے یا اقتدار کی کرسیوں کو چھوڑ دینا چاہیے لیکن ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہمارا ملک ہے ہم ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہو کر کہتے ہیں کہ لیڈروں کا حقیقی وظیفہ عوام کی رہنمائی کرنا ہے نہ کہ ہر بات میں ان کی خواہشات کے سامنے چلنا۔"[1]

انہی تفکرات کی بناء پر فاضل جج صاحبان نے اپنی رپورٹ کو حسب ذیل فقرہ پر ختم کیا ہے:

---

[1] رپورٹ انگریزی ص ۲۷۵، ۲۷۶

''بال آخر ایک شے جسے ''انسانی ضمیر'' کہا جاتا ہے ہمیں یہ سوال کرنے پر مجبور کر رہی ہے کہ آیا ہمارے سیاسی ارتقاء کی موجودہ حالت میں آئین وقانون کے انتظامی مسئلے کو اس کے ''جمہوری ہم بستر'' یعنی وزارتی حکومت سے الگ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ جس کے سینے پر سیاسیات کا کابوس سوار رہتا ہے۔ اگر ''جمہوریت'' کے معنی یہ ہیں کہ قانون وآئین کو سیاسی اغراض کا تابع بنادیا جائے تو واللہ اعلم بالصواب اور ہم اپنی رپورٹ کو ختم کرتے ہیں۔''[1]

عدالت کے یہ ریمارکس بہت غور طلب ہیں۔ حکومت خواہ کسی شکل کی ہو یعنی جمہور کی نمائندہ حکومت ہو یا کسی مطلق العنان حکمران کی استبدادی حکومت یا غیر ملکی غلبہ واستعماری حکومت، اس کا اولین وظیفہ بلاشبہ ضبط ونظم اور امن وآئین کو قائم رکھنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہر قسم کی حکومت کے فرائض میں یہ بات بھی داخل ہے کہ عوام کے مطالبے کی طرف مناسب توجہ دے۔ نمائندہ حکومتیں تو اس کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتیں البتہ استبدادی حکومتیں طاقت وقوت کے بل پر عوام کی خواہشات کو عارضی طور پر کچلنے اور دبائے رکھنے میں کامیاب ہوسکتی ہیں۔

عدالت تحقیقات کی اس دریافت کے بعد کہ ہمارے عوام تعلیم یافتہ اور عصری افکار سے باخبر نہیں، اس لیے یہاں نمائندہ جمہوری حکومتیں قانون وآئین کے احترام کو ملحوظ خاطر نہیں رکھ سکتیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ وظیفہ کس کے سپرد کیا جائے؟ تاکہ عوام کو ایسے مطالبات وضع کرنے سے روکا جاسکے جن پر ارباب حکومت کسی نہ کسی وجہ سے توجہ نہیں دے سکتے یا جن کو وہ اپنی سمجھ کے مطابق لغو اور بیہودہ یا ناقابل عمل خیال کرتے ہیں اور نہ اس بات کی جرات رکھتے ہیں کہ عوام پر ان کی ''لغویت'' ظاہر کرنے کے لیے سامنے آسکیں۔ انہی مطالبات کو لیجیے جو خود عدالت کی رائے میں مذہبی احساسات پر مبنی اور اشتعال انگیزی کا نتیجہ ہیں جو ایک قلیل التعداد مذہبی گروہ نے ملک کی ساری آبادی کے احساسات کے علی الرغم شدومد کے ساتھ جاری تھی، ان مطالبات کو ارباب حکومت نے شروع ہی سے درخور اعتنا خیال نہ کیا اور سیاسی

---

[1] رپورٹ انگریزی ص ۳۸۷

جماعتوں کے لیڈر جن میں مسلم لیگ کی بااقتدار ہستیاں بھی شامل ہیں ان کے بارے میں آج تک کوئی رائے قائم نہیں کر سکے چہ جائیکہ وہ عوام کی رائے کو ہم نوا بنانے کے لیے ساعی ہوتے، کیا یہ کیفیت ان مطالبات کے وزن پر شاہد و دال نہیں؟ اور اگر ارباب حکومت وقیادت کی کم نگاہی، بزدلی اور بے بصیرتی کی وجہ سے عوام کا اضطراب ترقی پذیر ہو کر ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ آئین وقانون کے مسائل کھڑے کر دے تو اس کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے؟

۹۔ مغرب زدہ فکر کی خوف زدگی

اس رپورٹ میں من جملہ دیگر اُمور کے یہ بات نہایت واضح طور پر اور عام اشجار کے مقابلے میں شمشاد وصنوبر کی بلند قامتی کے ساتھ نمایاں طور پر ظاہر ہو رہی ہے کہ ہمارے ملک کا وہ طبقہ جو برسر اقتدار ہے اور جس کے اذہان نے مغربی افکار اور صرف مغربی افکار کی گود میں پرورش پائی ہے۔ بے طرح ذہنی غلامی کا شکار ہو رہا ہے اور اپنے ہاں کی ہر چیز کو حتیٰ کہ دینی معتقدات وشعائر کو بھی قدروں کے اسی معیار پر پرکھنے کا عادی ہے جو اہل مغرب کے فکر نے عصر حاضر میں مقرر کر لیا ہے اور جس میں مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ دوسری جانب ہمارا وہ طبقہ جس نے علوم دینیہ کے مطالعہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ عصری افکار سے ناآگاہ ہونے کے باعث اسلام کی تعلیمات کو ایسے انداز میں پیش کرنے سے قاصر ہے جو عصر حاضر کے دماغوں کے لئے قابل فہم ہو۔ رپورٹ میں جابجا اس امر کے اعترافات واظہارات موجود ہیں کہ ہمارے ارباب اقتدار کو جن ملحوظات ومفکورات نے عامۃ المسلمین کے سہ گانہ مطالبات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے سے روکے رکھا۔ وہ یہی تھے کہ باہر کی دنیا ہمیں کیا کہے گی؟ چنانچہ فاضل صاحبان لکھتے ہیں کہ:

> ”بلاشبہ وہ (خواجہ ناظم الدین) مطالبات کو منظور کر سکتے تھے یا ذاتی طور پر وعدہ کر سکتے تھے کہ وہ مطالبات کی حمایت کریں گے۔ اس صورت میں کوئی گڑبڑ نہ ہوتی اور اگر کچھ ہوتی تو شاید اس وقت جب کہ یہ معاملہ دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش ہوتا۔ احمدی

ایک قلیل التعداد قوم میں وہ غالباً مزاحمت نہ کر سکتے اور بدامنی پھیلانے کے قابل نہ ہوتے۔ چوہدری ظفراللہ خان کے الگ کیے جانے پر بین الاقوامی حلقوں میں کچھ چہ میگوئیاں ہوتیں لیکن پاکستان کی آبادی (خواجہ صاحب کے) اس اقدام پر تحسین وآفرین کے پھول نچھاور کرتی، پھر خواجہ ناظم الدین نے یہ پیش پا اُفتادہ اقدام کیوں نہ کیا؟ صرف اس لیے نہیں جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ اس قسم کا اعلان دوسرے اسلامی ملکوں میں مؤثر نہ ہوتا بلکہ انہوں نے ان دُوررَس نتائج کے خوف سے ایسا نہ کیا جن کا ذکر اس رپورٹ کے دوسرے مقام پر کر دیا گیا ہے، اگر مطالبات منظور کر لیے جاتے تو پاکستان کو بین الاقوامی سوسائٹی سے خارج کر دیا جاتا۔"[1]

"وہ (خواجہ ناظم الدین) مطالبات کو منظور نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ ایسا کرنا پاکستان کو مضحکہ خیز پوزیشن میں ڈال دیتا اور بین الاقوامی دنیا کی آنکھیں کھل جاتیں کہ مشرقی، متصادم اور جمہوری ریاست ہونے کے بارے میں پاکستان کے دعاوی کی حقیقت کیا ہے؟"[2]

فاضل جج صاحبان نے خواجہ ناظم الدین کے فکری اُلجھاؤ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ انہیں یہ فکر تھا کہ:

"چوہدری ظفراللہ خان بین الاقوامی دنیا میں بہت شہرت رکھتے ہیں اور احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ان کی برطرفی کی خبر بڑے وسیع پیمانے پر نشر ہوگی اور بین الاقوامی تنقیدات کا مورد بنے گی۔ اس برطرفی کی کوئی ایسی تشریح جو بین الاقوامی ضمیر کو مطمئن کر سکے۔ تلاش کرنا مشکل ہوگا...... لہٰذا مطالبات کی منظوری بین الاقوامی حلقوں میں چہ میگوئیوں کے دروازے کھول دیتی اور بین الاقوامی دنیا کی توجہ نفیاً یا اثباتاً پاکستان کے واقعات کی رفتار کی طرف جلب ہونے لگتی۔"[3]

---

[1] رپورٹ انگریزی ص ۲۸۲

[2] رپورٹ انگریزی ص ۲۶۵،۲۶۴

[3] رپورٹ انگریزی ص ۲۳۳

۱۰۔ تجدید اسلام اور احیائے دین

اور ان مذکورات کی بناء پر فاضل جج صاحبان نے یہ نتیجہ اخذ کیا:

"(بحالات موجودہ) اسلام کو عالمگیر تخیل کی حیثیت سے محفوظ رکھنے کی اور مسلمان کو اس دقیانوسی ناموزونیت سے نکال کر جس میں وہ مبتلا ہے۔ عالم حاضر و دنیائے مستقبل کا شہری بنانے کی صورت یہ ہے کہ جرأت سے کام لیتے ہوئے اسلام کی تجدید کر کے اس کی زندہ و عامل خصوصیات کو بے جان خصوصیات سے الگ کر دیا جائے۔"[1]

یہ ہے مغرب زدہ طبقہ کی پکار جو مغرب کے افکار، اہل مغرب کی معاشرت اور ان کے طرز بود و باش سے اس حد تک مسحور ہو چکا ہے کہ زندگی کے متعلق اسلام کے تصورات کی عظمت و ماہیت کا اخذ کرنا بھی اس کے دماغ کے لیے بڑا مشکل اور کٹھن کام بن رہا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ سیاسیات و معاشرت میں بین الاقوامی فکر ابھی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے اور ان تلخ تجربوں کی روشنی میں جو نوع انسان کو ہر شعبۂ حیات میں آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ کسی مستقل اور پائیدار حل کو تلاش کرنے میں سرگرداں ہے۔ اسلام اب سے کوئی چودہ سو سال پہلے ان جملہ مشکلات کا حل نوع انسان کے سامنے پیش کر چکا ہے اگر نوع انسان کا فکر اس چراغ کی روشنی سے استفادہ کرتے ہوئے جو اسلام نے روشن کر رکھا ہے۔ راستہ تلاش کرے تو انسانیت صراط مستقیم پر سرعت رفتار کے ساتھ گامزن ہو سکتی ہے اور ان منازل مقصود تک جلد پہنچ سکتی ہے جن تک پہنچنے کے لیے اس کے شعوری اور لاشعوری تقاضے اسے بے قرار رکھتے ہیں۔ نوع انسانی کو یہ روشنی دینا اور یہ صراط مستقیم دکھانا مسلمانوں سے مخلوج ہو کر رہ گئی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے اور اقوام عالم کے سامنے ان مسائل کا صحیح حل پیش کرنے کے لیے اسلام کی تعلیمات یعنی قرآن و سنت سے رہنمائی حاصل کرنے کی سعی کی جائے اور اس بارے میں پوری تحقیق اور کاوش سے کام لیا جائے۔ تجدید اسلام یا احیائے دین

---

[1] رپورٹ انگریزی ص ۲۳۲

اسی سعی وکوشش کا نام ہے اور یہ سعی وکوشش ایسے ادوار میں ضروری ہوجاتی ہے جب مسلمانوں میں بیرونی اثرات کی وجہ سے فکروعمل کی گمراہیاں ترقی پذیر ہوجاتی ہیں۔ اگر تجدید اسلام کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر یا تاویلات وتحریفات کے بل پر عصری افکار کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جائے تو یہ تجدید اسلام کی نہیں بل کہ تخریب اسلام کی کوشش ہوگی۔ اس قسم کی سعی پر وقت اور طاقت ضائع کرنے سے یہی بہتر ہے کہ مغرب زدہ لوگ اسلام کو اپنے حال پر چھوڑ دیں اور سیاسی، معاشرتی، معاشی اور قانونی اُمور میں عصر حاضر کے ترکوں کی طرح افکار مغرب کا پورا تتبع کرتے ہوئے پاکستان کو ایسی مملکت بنالیں جسے عصر حاضر کی اصطلاح میں متجدد، مترقی، متقادم اور جمہوری کہا جاتا ہے اور اجتماعی اور انفرادی زندگی کے تصورات کے اسی میدان میں ناچنے اور دوڑنے لگیں جس میں کہ اقوام مغرب دوڑ رہی لگا رہی ہیں اور صحیح تجدید اسلام اور احیائے دین کا کام کسی اور قوم کے لئے یا آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ رہنے دیں جس کارعظیم سے عہدہ برآ ہونے کے ہم اہل نہیں، اسے کرنے کی حامی بھرنے یا اس پر ہاتھ ڈالنے سے یہی بہتر ہے کہ ہم اس کا خیال ہی ترک کردیں لیکن ایسا کرنے کے باوجود مسائل بہ دستور حل طلب رہیں گے جن کو حل کرنے سے گریز کی راہ اختیار کر کے ہمارے ارباب سیاست وقیادت نے ملک کو ۱۹۵۳ء کے فسادات سے دوچار کر دکھایا۔ جب تک ہم اس ذہنیت کے ساتھ چلنے پر مجبور ہیں کہ اگر ہم نے یہ کام کیا یا وہ کام کیا تو "دنیا ہمیں کیا کہے گی" اس وقت تک ہم اپنے داخلی اور خارجی اُمور کو اپنے حسب منشاء اور اپنے لوگوں کے آرام وآسائش کے لئے سرانجام نہیں دے سکیں گے۔ اس مفروضہ یعنی "دنیا ہمیں کیا کہے گی" کے ماتحت عدالت تحقیقات کے فاضل جج صاحبان نے مغرب زدہ طبقہ کی جن دماغی اُلجھنوں کا اور جن مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ ان پر اگر ٹھنڈے دل ودماغ سے غور کیا جائے اور ان کے حل کی مناسب تدابیر اپنے لوگوں کے محسوسات کے پیش نظر سوچی جائیں تو یہ عقدے اتنے لاینحل نہیں جس قدر کہ سمجھے جارہے ہیں۔ مصیبت صرف یہ ہے کہ ہمارے ارباب حل وعقد کی فکری صلاحیتیں محض اس خوف سے کہ "دنیا ہمیں کیا کہے گی" شل ہوکر رہ جاتی ہیں اور

ان کیفیات ومسائل کوحل کرنے سے جوملک کے اندر رونما ہوتے ہیں گریز کی راہ اختیار کرلیتی ہیں اور یہ بات عدالت تحقیقات کے سامنے اظہر من الشمس اور بیّن من الامس ہو کر ظاہر ہو چکی ہے۔ ہمارے ارباب قیادت نے متفق اللسان ہو کر یہ کہا کہ ہمارے دماغوں نے ابھی تک مطالبات کے حسن وقبح یا ان کی صحت وعدم صحت کے بارے میں کوئی فیصلہ ہی نہیں کیا، ایسی حالت میں وہ عوام کی رہنمائی کیا کریں گے۔

۱۱۔ارباب سیاست وقیادت کی کوتاہیاں

بہرکیف جہاں تک مطالبات کا تعلق ہے، تحقیقات نے یہ بات ایک دفعہ پھر ثابت کردی ہے کہ عوامی مطالبہ کی طرف سے ارباب سیاست وقیادت کا آنکھیں موند لینا ہمیشہ ناگوار کیفیات پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔ ان کو دیکھنا چاہیے کہ اگر عوامی مطالبات میں وزن ہے اور وہ معقولیت پر مبنی ہیں تو انہیں کسی اندرونی یا بیرونی خوف سے متاثر ہوئے بغیر عوام کو ان مطالبات کے بارے میں مطمئن کرنے کی تدابیر اختیار کرنے میں، اَمل سے کام نہ لینا چاہیے اور گر مطالبات لغو اور بیہودہ ہوں جیسا کہ بعض پولیس افسروں نے سیاستین کا لبادہ پہن کر اپنی رپورٹوں میں مجلس عمل کے مطالبات کو قرار دینا شروع کردیا۔[۱]

تو ارباب سیاست کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ عوام پر ان کے مطالبات کی لغویت واضح کرنے کے لئے آگے بڑھیں اور اپنے ہم خیالوں کی جمعیت کو تقویت دیں۔ فاضل جج صاحبان نے بھی اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ:

''ہمارے عوام اتنے بیہودہ نہیں کہ وہ معقول بات پر کان نہ دھریں اور اگر ان کو سمجھایا جائے تو نہ سمجھیں۔'' (رپورٹ انگریزی ص ۲۷۵)

ظاہر ہے کہ اگر مدعیان قیادت یہ طرز عمل اختیار کرتے تو مطالبات کی منظوری یا نامنظوری کا معاملہ جمہوری سیاسی اختلاف کی نوعیت اختیار کر لیتا اور ان معاملات کو طے کرنے کی آئینی

---

[۱] رپورٹ انگریزی ص ۱۴۴،۸۰

جمہوری صورتیں پیدا ہو جاتیں۔ مطالبات کے حامیوں کو ڈائرکٹ ایکشن کی راہ اختیار کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی جس کو عدالت نے من جملہ اسباب فسادات کے ایک سبب قرار دیا ہے۔

۱۲۔ علمائے دین

طبقہ علمائے دین کے بارے میں عدالت نے اس رائے کا اظہار کیا ہے:

''علماء فاضل طبقہ کے لوگ ہیں لہٰذا جملہ پرستاران علم کی طرح واجب الاحترام ہیں لیکن ان فاضلین کی طرح جو اپنی قوتوں کو کسی خاص موضوع کے لیے وقف کر دیتے ہیں، ان کے اذہان کا ارتقاء ایک ہی راستے پر ہوا ہے اور ایک راہ ذہن خطرناک امکانات کا حامل ہوتا ہے تاہم آپ متخصصین کے بغیر گزارا بھی نہیں کر سکتے لیکن اس کے لیے ایک عمومی پیشہ ذریعنی ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو ان تمام مضامین پر جو کسی متخصص کے خصوصی دائرہ علم وفکر سے تعلق رکھتے ہیں- حاوی ہو، اپنے مضمون کے سوا دیگر مضامین کے متعلق متخصص کے زاویہ نگاہ کا تنگ ہونا ایک لازمی امر ہے۔ ہم ''ملائیت'' اور ''مذہبی دیوانگی'' ایسی ارزاں اور عمومی اصطلاحات کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ایک عام گریجویٹ جو اپنے مضامین کے سطحی علم سے زیادہ اور کچھ مبلغ علم نہیں رکھتا۔ ایسے جملوں کے استعمال میں خوشی محسوس کرتا ہے گویا کہ وہ برتر شخصیت کا مالک ہے۔ کیا اسی طرح آپ ایک ماہر علم النبات کو نباتیات کا ایک ماہر علاج امراض پا کر معالجہ کا طعنہ دے سکتے ہیں۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہتے کہ علماء کا زاویہ نگاہ اس لیے تنگ ہے کہ وہ علماء ہیں کہ علماء زندگی کے ایک ہی شعبہ کے متخصصین ہیں۔''[1]

علمائے دین پر مخالف فریق کی طرف سے ان کے تشدد پسند ہونے کے بارے میں جو اعتراضات وارد کیے گئے ان کا ذکر کرتے ہوئے فاضل جج صاحبان نے لکھا ہے کہ:

''یہ دلیل کہ وزیر اعظم نے علماء سے متصادم ہونے کی جو ممانعت کر رکھی تھی وہ صوبائی دائرہ میں ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنے پر منتج ہوئی، اس مفروضہ کی حامل ہے کہ

---

[1] رپورٹ انگریزی ص ۲۹۸، ۲۹۹

''علماء شورشی اور بدزبان مذہبی دیوانوں کاایک گروہ ہیں جوتشدد کی تلقین کرتے ہیں اورخون نظاروں سے خوش ہوتے ہیں''۔علماء کو''مذہبی دیوانے''پکارا جائے تو غالباً انہیں اس سے انکار نہ ہوگا لیکن ان سے ایک بھی ہمارے سامنے اس امر کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ تشدد کی مذمت نہیں کرتا۔ مولانا میکش نے جنہوں نے علماء کے مقدمہ کی وکالت نمایاں سرگرمی کے ساتھ کی احمدیوں کے خلاف دیوانہ وار جوش کا حامل ہونے کے باوجود چھوٹے چھوٹے لیڈروں کی بدزبانی اور تیز کلامی کی مذمت کی۔ ایسی تیز کلامیوں کے مرتکب جو حوالہ جات میں پائی جائیں گی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا محمد علی جالندھری، سید مظفر علی شاہ شمسی، ماسٹر تاج الدین انصاری اور چند دیگر اشخاص ہمیں اس سلسلہ میں مولانا اختر علی خان کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے لیکن یہ حضرات علم دین کی گہرائیوں سے آگاہ ہونے کے مدعی بھی نہیں اور نہ اپنے آپ کو علماء کی جماعت میں سے خیال کرتے ہیں۔''[1]

خاتمہ کلام:

فاضل جج صاحبان نے ان اہم کوائف ومسائل کو بے نقاب کرنے میں جو ہمارے ملک کو درپیش ہیں پاکستانی معاشرے کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ اب پاکستانی معاشرے کے مختلف عناصر کا کام یہ ہے کہ عدالت تحقیقات کی اس رپورٹ کے آئینے میں اپنے اپنے چہرے دیکھیں اور ایسا طرز عمل اختیار کریں جو ملک میں امن وسکون کی فضاء کو تقویت دینے کا موجب ہو۔ واخردعوانا ان الحمدللہ رب العلمین

احقرالعباد مرتضیٰ احمد خان میکش درانی

۲۱راگست ۱۹۵۴ء

☆

[1] رپورٹ انگریزی ص ۲۹۷

عرض حال

یہ تبصرہ جو کتابچہ کی صورت میں ہدیہ قارئین کرام ہے پہلے پہل روزنامہ "نوائے پاکستان" کے "خاص رپورٹ نمبر" مورخہ ۲۹/اگست ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس تبصرہ کی تحریر و اشاعت کے لیے جو محرکات محرک ہوئے وہ اخبار مذکور کے اداریہ میں مشرح طور پر بیان کر دیے گئے تھے- یہ اداریہ بھی توضیح مطالب کے پیش نظر کتابچہ میں شامل کیا جاتا ہے: وھوہذا

"آج کی اشاعت عدالت تحقیقات فسادات کی رپورٹ پر سیر حاصل تبصرے کی نذر کی جارہی ہے۔ یہ تبصرہ کتابچہ کی صورت میں شائع کرنے کی نیت سے لکھا گیا تھا لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ معروضات زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچ جائیں- اسے اخبار کی ایک ہی اشاعت میں درج کیا جارہا ہے۔

اس تبصرہ کی اشاعت کا ابتدائی مقصد جیسا کہ "پیش لفظ" میں ظاہر کر دیا گیا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان لوگوں کو جنہیں ضخیم رپورٹ پڑھنے کی فرصت نہیں- ایک مرتب اور اجمالی صورت میں ملک کے اہم کوائف و مسائل پر فاضل جج صاحبان کی تنقیدات سے روشناس کرا دیا جائے جنہوں نے دس (۱۰) ماہ کی محنت شاقہ سے کام لینے کے بعد اس رپورٹ کی صورت میں نہایت ہی قیمتی دستاویز تیار کر کے ملک کے سامنے پیش کر دی ہے۔

اس تبصرہ کی اشاعت کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی سعی کی جائے جو اس رپورٹ کے مندرجات پر پوری توجہ نہ دینے کی وجہ سے عامتہ الناس میں بل کہ پڑھے لکھے حلقوں میں پھل پھول رہی ہیں۔

تیسرا مقصد یہ ہے کہ مملکت عزیز پاکستان کے جملہ عناصر کو توجہ دلائی جائے، وہ اس کے مندرجات کی روشنی میں اپنے فکر و عمل کے رجحانات کا جائزہ لیں اور آیندہ کے لیے ان رجحانات سے نکلنے کی کوشش کریں جو مارچ ۱۹۵۳ء کے افسوسناک حادثات کی تخلیق کا موجب بنے۔

جان لینا چاہیے کہ ہمارے ملک کو اس سلسلے میں اہم فکری اور حسیاتی مسائل درپیش ہیں جن کو خوش اُسلوبی کے ساتھ اور وطن خواہی کی سپرٹ (spirit) میں حل کیے بغیر ہم امن و سکون کی وہ فضاء پیدا نہیں کر سکتے جو کسی ملک کو یا کسی معاشرے کو ترقی و بلندی کی شاہراہ پر گامزن کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ایسے اہم مسائل کی طرف سے آنکھیں بند کر لینے یا ان کو حل کرنے کی سعی سے گریز کرنے کی روش معاملات کو مزید اُلجھاؤ ہی میں ڈالنے پر منتج ہو سکتی ہے، سلجھاؤ پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ مسائل جن کی نشاندہی فاضل جج صاحبان نے اپنی رپورٹ میں کی ہے۔ ایسے ہیں جو کسی نہ کسی لحاظ سے پاکستان کے ہر فرد کے دل و دماغ کو متاثر کر رہے ہیں۔ طبائع عمومی کا یہ اضطراب و انتشار اس وقت تک دُور نہ ہوگا جب تک کہ ارباب حکومت سیاسی پارٹیاں اور ارباب قیادت اور ملک کے دیگر عناصر ان مسائل کا خوش گوار حل تلاش کرنے کے لیے کمر ہمت باندھ کر آگے نہیں بڑھیں گے اور باہمی مشورت اور افہام و تفہیم سے ایسے نتائج پر پہنچنے کی کوشش نہیں کریں گے جو تصادموں کو روکنے

والے اور فسادات کے سرچشموں کو بند کردینے والے ہوں۔

ان گذارشات کے ساتھ قارئین کرام کی خدمت میں یہ ”رپورٹ نمبر“ پیش کیا جارہا ہے۔ اُمید ہے کہ ارباب فہم وبصیرت اسے اسی توجہ کے ساتھ پڑھیں گے جس کی اُمید میں نویسندہ عاجز نے یہ تبصرہ سپرد قلم کیا ہے۔

مرتضیٰ احمد خان میکش درانی

☆

سہ ماہی ''اَلْمُنْتَهٰی'' کا ''تحفظ ختم نبوت اور بابو پیر بخش لاہوری نمبر'' کی اشاعت ایک اہم کارنامہ [1]

اثر خامہ: سید صابر حسین شاہ بخاری قادری

بسم اللہ الرحمن الرحیم، نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ النبی الامین
خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین

ہمارے پیارے نبی کریم رؤف رحیم حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کی خاتمیت، جامعیت اور اکملیت اظہر من الشمس ہے، اس پر قرآنی آیات اور نبوی احادیث شاہد و ناطق ہیں۔ لیکن حق و باطل کی جنگ روز ازل سے جاری و ساری ہے اور روز ابد تک رہے گی۔ جھوٹے مدعیان نبوت اپنے مکر و فریب کے ساتھ جب بھی اور کہیں بھی نمودار ہوئے تو محافظین ختم نبوت ان کے سامنے نہایت جرأت و استقامت کے ساتھ سامنے آئے اور ان کذابوں کے لئے سد سکندری ثابت ہوئے۔ محافظین ختم نبوت نے ہر دور کے کذابوں کا ہر محاذ پر نہایت ڈٹ کر ان کے ہر قسم کے مکر و فریب کا پردہ چاک کر کے ان کے مذموم عزائم کو خاک میں ملایا اور امت مسلمہ کے ایمان کو محفوظ و مامون بنایا۔ 1839ء میں ہندوستان میں مشرقی پنجاب کے خطہ گورداس پور کے قصبہ قادیان میں مرزا غلام احمد قادیانی پیدا ہوا جس نے آگے چل کر گرگٹ کی طرح کئی رنگ بدلے اور بالآخر وہ اپنے آپ کو ''نبی'' سمجھ بیٹھا اور یوں وہ ''مسیلمۂ پنجاب'' اور ''فتنۂ قادیانیت'' کا بانی ثابت ہوا۔

---

[1] شاہ جی کا یہ تبصرہ عالمی شہرت یافتہ اردو ویب پورٹل و میگزین ''ہماری آواز'' اور ماہنامہ ''اشرفیہ'' مبارک پور (انڈیا) اگست 2022ء میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

برصغیر میں جن محافظین ختم نبوت نے فتنۂ قادیانیت کا تعاقب کیا ان میں حضرت بابو پیر بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ (پ:1852ء، م:1927ء) کا نام نہایت روشن اور نمایاں ہے۔ ان کا پورا نام محمد پیر بخش لاہوری، والد گرامی کا نام میاں امام بخش اور دادا کا نام خدا یار رحمۃ اللہ علیہم ہے۔ آپ نے اگرچہ عصری تعلیم مڈل تک حاصل کی لیکن آپ نے قرآن وحدیث اور فقہی علوم میں بھی مہارت تامہ حاصل کی تھی اس پر آپ کی تصنیفات وتالیفات شاہد وناطق ہیں۔

آپ آرائیں برادری کے ذیلدار خاندان کے ایک فرد فرید تھے۔ اس خاندان کا روحانی تعلق سلسلہ عالیہ نقشبندیہ سے ہے۔ اور اس خانوادے کی دینی خدمات بھی اظہر من الشمس ہیں۔ آپ محکمۂ ڈاک میں ہیڈ کلرک کے عہدے پر فائز رہے۔ اس وقت سکول کے پڑھے لکھے سرکاری ملازم کو "بابو" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یوں "بابو" آپ کے نام کا جزو لاینفک بن کر رہ گیا۔ آپ بھاٹی دروازہ لاہور کے رہنے والے تھے اور لاہور شہر کی نسبت ہی سے آپ کو لاہوری کہا جاتا تھا۔ لاہور کے مشہور قبرستان میانی صاحب میں آپ محوِ خواب ہیں۔

اگرچہ آپ کے اسم گرامی "پیر بخش" سے آپ اور آپ کے خانوادے کا عقیدہ و مسلک ظاہر و باہر ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ آپ بھی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قادری برکاتی بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کو "چودھویں صدی کا مجدد" تسلیم کرتے تھے۔ 1912ء میں آپ اپنی عمر عزیز کے ساٹھ سال مکمل ہونے کے بعد اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہوئے اور پھر اپنے دم آخر تک فتنۂ قادیانیت کے تعاقب میں مصروف رہے۔ بابو پیر بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے ملازمت سے فراغت کے بعد اپنے ایک دوست بابو چراغ دین رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مل کر "انجمن حمایت اسلام" کی بنیاد رکھی اور اس کے سیکرٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ پھر آپ نے "انجمن تائید الاسلام" کا قیام عمل میں لایا اور اس کے زیر اہتمام ماہنامہ "تائید الاسلام" لاہور کا اجراء عمل میں لایا اور نہایت کامیابی سے اسے چلایا۔

1927ء میں آپ کی وفات کے بعد 1932ء تک میاں قمر الدین رحمۃ اللہ علیہ (پ:1862ء،

م:1952ء) ماہ نامہ "تائید الاسلام" لاہور کے مدیر رہے۔ بابو پیر بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ ملازمت سے فراغت کے بعد فتنۂ قادیانیت کے تعاقب میں ایسے منہمک ہوئے کہ آپ کے شب و روز اس فتنۂ عظیمہ کی سرکوبی میں بسر ہوئے۔ آپ جہاد بالقلم کے محاذ پر آگے بڑھ بڑھ کر وار کرتے تھے اور اس فتنہ کے سرغنہ مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی کے ہر مکر و فریب کو طشت از بام فرماتے ہوئے اسے شکست سے دوچار کرتے رہے۔ آپ نہ صرف اپنی کتب و رسائل اور مضامین و مقالات بلکہ اہل سنت کے مشاہیر اہل علم و فضل کی تصنیفات و تالیفات کے ذریعے بھی اس فتنۂ عظیمہ سے اہل ایمان کو آگاہ فرماتے رہے۔ مرزا آنجہانی اور اس کی ذریت کی جانب سے جاری ہونے والے ہر اشتہار، پمفلٹ، ٹریکٹ اور ہینڈ بل کا آپ عقلی و نقلی دلائل سے رد فرما کر فتنۂ قادیانیت کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیتے تھے۔ جہاد بالقلم کے محاذ پر میاں قمر الدین رحمۃ اللہ علیہ کی مالی معاونت سے آپ کی کتب و رسائل کی طباعت ہوتی تھی۔

ختم نبوت کے تحفظ اور رفتنۂ قادیانیت کے رد میں بابو پیر بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات جلیلہ کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ ضرورت تھی کہ کوئی مرد مجاہد یا مجاہدہ آگے بڑھے اور ان کی حیات و خدمات کے حوالے سے ایک مقالہ لکھ کر سامنے لے آئے۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ختم نبوت کی اس نابغۂ روزگار شخصیت کی حیات و خدمات پر کام کرنے کے لئے اس بار قرعہ فال ایک نیک سیرت خاتون محققہ عزیزہ سدرہ عبد الخالق صاحبہ کے نام نکلا۔ انھوں نے اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی و علوم اسلامیہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کی نگرانی و سرپرستی میں ایم اے کی سند کے حصول کے لیے محنت شاقہ سے مقالہ "دفاع ختم نبوت میں بابو پیر بخش کی خدمات" لکھا اور پھر وہ ساحل مراد تک پہنچیں، الحمد للہ۔

عصر حاضر میں عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ اور رفتنۂ قادیانیت کے رد میں ایک ممتاز و نمایاں نام مولانا خواجہ غلام دستگیر فاروقی زید مجدہ کا ہے۔ آپ ایک عرصے سے عقیدۂ ختم نبوت کے حوالے سے ایک نہایت علمی و تحقیقی مجلہ سہ ماہی "اَلْمُنْتَھٰی" لاہور نہایت کامیابی سے نکال رہے ہیں۔ یہ مجلہ اپنے موضوع پر اسم با مسمی ثابت ہوا ہے اس پر اس کا ہر شمارہ ہی شاہد و ناطق

ہے۔آپ ختم نبوت کے تحفظ اور فتنۂ قادیانیت کے رد کے حوالے سے نئے نئے زاویوں سے سوچتے ہیں اور پھر انہیں عملی جامہ بھی پہناتے ہیں۔آپ نے حضرت بابو پیر بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی حیات و خدمات کے حوالے سے جب محققہ سدرہ عبدالخالق صاحبہ کے تحقیقی مقالے کی تکمیل کا مژدہ جانفزا سنا تو آپ کی خوشی دیدنی تھی ،آپ نے فوراً فیصلہ کیا کہ اس تحقیقی مقالہ کو سہ ماہی "اَلْمُنْتَھٰی" لاہور کی خصوصی اشاعت کے طور پر شائع کرنے کی سعادت ضرور حاصل کی جائے۔ چنانچہ آپ نے اس تحقیقی مقالہ کو معمولی ترمیم و اضافہ کے ساتھ"تحفظ ختم نبوت اور بابو پیر بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ" کے عنوان سے سہ ماہی "اَلْمُنْتَھٰی" لاہور کے شمارہ نمبر 19،18 کو "اشاعت خاص" کے طور پر شائع فرما کر عام کیا۔ یہ شمارہ جنوری تا جون 2022ء پر مشتمل ہے۔

اس اشاعت خاص کا سرورق نہایت جاذب نظر اور دل کش ہے۔سرورق "مہر نبوت صلی اللہ علیہ وسلم" اور مسجد نبوی کے مینار کے نقش سے مزین ہے۔آغاز میں حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے "حمد باری تعالیٰ" ہے۔اس کا مطلع کچھ یوں ہے:

دوسرا کون ہے، جہاں تو ہے کون جانے تجھے، کہاں تو ہے

مقطع اس طرح ہے:

محرم راز تو بہت ہیں امیر جس کو کہتے ہیں راز داں تو ہے

اس کے بعد علامہ محمد شہزاد مجددی کے قلم سے "ترانۂ ختم نبوت" ہے۔اس کا مطلع ملاحظہ فرمائیں:

اس نظریے پر ہی قائم پاکستان ہمارا ہے
صدق دل سے ختم نبوت پر ایمان ہمارا ہے

مقطع دیکھیں:

آؤ اے شہزاد فدا ہو جائیں ان کی عظمت پر
ہر میدان میں حامی و ناصر خود رحمٰن ہمارا ہے

فاضل مدیر اعلیٰ مولانا خواجہ غلام دستگیر فاروقی نے "چراغ راہ" کے عنوان سے اس خصوصی اشاعت کا اداریہ لکھا جس میں نہایت ہی اختصار سے اس خصوصی نمبر کی نہ صرف غرض و غایت سے پردہ اٹھایا بلکہ اس کی اہمیت و افادیت اور پس منظر کو بھی احاطۂ تحریر میں لایا۔

اداریہ کے بعد مقالہ نگار محترمہ سدرہ عبدالخالق صاحبہ کی جانب سے من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ کے تحت "اظہار تشکر" کے زیر عنوان ان تمام معاونین کا نام لے کر شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے اس مقالہ کی تکمیل میں ان کے ساتھ بھرپور علمی و عملی تعاون کیا ہے۔ ان معاونین میں ان کی والدہ ماجدہ، ان کے چھوٹے بھائی سفیان عبدالخالق، ڈاکٹر حافظ خورشید احمد قادری، محمد ثاقب رضا قادری (ایڈووکیٹ)، توفیق احمد جونا گڑھی، مولانا کاشف اقبال مدنی، میاں محمد عفان، ڈاکٹر ضیاء الحق قمر کے اسمائے گرامی نہایت نمایاں ہیں۔

اس کے بعد "مقالہ کی ترتیب کے بارے میں چند گزارشات" پیش کی ہیں۔ جن میں مقالہ کا پس منظر بھی پیش کیا گیا ہے۔ پیش نظر مقالہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان "مصنف کے احوال و آثار اور تصانیف" ہے۔ یہ باب تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی فصل میں بابو پیر بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی مختصر مگر انتہائی جامع انداز میں احاطۂ تحریر میں لائے گئے ہیں۔

دوسری فصل میں ختم نبوت کے تحفظ اور فتنۂ قادیانیت کے رد میں آپ کی لکھی گئی اٹھارہ تصانیف کے نام ترتیب زمانی کے تحت دیئے گئے ہیں اور ان کی دستیاب شدہ چودہ تصانیف کا مختصر مگر جامع تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اسی فصل میں آپ کی ادارت میں ختم نبوت کے تحفظ میں جاری ہونے والا ماہ نامہ "تائید الاسلام" لاہور کی سات خصوصی اشاعتوں کا تعارف و تبصرہ بھی شامل ہے۔ ماہ نامہ "تائید الاسلام" لاہور اپنے عہد میں نہایت مقبول عام رسالہ تھا۔ اسے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند افغانستان، افریقہ، مصر، شام اور برما وغیرہ کے بھی شہرت عام حاصل تھی۔

فصل سوم میں "چند نئے گوشے" شامل ہیں۔ جن میں بابو پیر بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی تابناک حیات کے چند نہایت اہم گوشے دیئے گئے ہیں۔ ان گوشوں میں ذیلدار خاندان، جامعہ فتحیہ اچھرہ، اور میاں قمر الدین رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۶۲ء / ۱۹۵۲ء) کا تعارف بھی شامل ہے۔ فتنۂ قادیانیت کی سرکوبی میں میاں قمر الدین رحمۃ اللہ علیہ اور جامعہ فتحیہ اچھرہ کا کردار بھی نہایت نمایاں رہا ہے۔

مقالے کے دوسرے باب کا عنوان "عقیدۂ ختم نبوت اور قادیانیت" ہے۔ اس کی پہلی فصل میں عقیدۂ ختم نبوت کی ضرورت و اہمیت دی گئی ہے اور قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں ختم نبوت کے دلائل دیئے گئے ہیں۔ دوسری فصل میں فتنۂ قادیانیت کی مختصر سی تاریخ قارئین کے سامنے رکھی گئی ہے۔

مقالے کے آخری باب سوم بھی تین فصلوں پر مشتمل ہے جن میں دفاع ختم نبوت میں بابو پیر بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات جلیلہ کا نہایت محققانہ اور مؤرخانہ انداز میں نہایت اختصار سے جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے کے اختتام پر مقالہ نگار محققہ سدرہ عبدالخالق صاحبہ نے "خلاصۂ تحقیق" کچھ اس انداز میں پیش فرمایا ہے گویا دریا کو کوزے میں سمو دیا گیا ہے۔ بابو پیر بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی حیات و خدمات کے حوالے سے فاضلہ مقالہ نگار نے چھ سفارشات پیش فرمائی ہیں جن کے تحت آپ کی حیات و خدمات پر دائرۂ تحقیق کو مزید بڑھایا جاسکتا ہے۔ آخر مصادر و مراجع کی فہرست بھی دے دی گئی ہے جس سے مقالہ کی تحقیقی و علمی حیثیت ظاہر و باہر ہے۔

سہ ماہی مجلہ "اَلْمُنْتَهٰی" لاہور کے مدیر اعلیٰ کی جانب سے اس خصوصی اشاعت کے آخر میں سالانہ ختم نبوت کانفرنس شکر گڑھ منعقدہ 19 / نومبر 2021ء کی رپورٹ بھی شامل کی گئی ہے نیز وفائے ختم نبوت تربیتی نشست کے تحت چوبیس جانثاران ختم نبوت کے اسمائے گرامی بھی اس نمبر کی زینت بنائے گئے ہیں۔ تحفظ ختم نبوت تربیتی ورکشاپ کی مختصر سی کارروائی بھی شامل

ہے۔ یوں سہ ماہی "اَلْمُنْتَھٰی" لاہور کی یہ خصوصی اشاعت ختم نبوت کے تحفظ کے حوالے سے ایک تاریخی دستاویز کی صورت اختیار کرگئی ہے۔اور پھر یہ اسلاف شناسی کی ایک نہایت عمدہ مثال بھی ہے۔

ناچیز ہیچ مدان مقالہ نگار محققہ سدرہ عبدالخالق صاحبہ،اس کے تمام معاونین اور ناشر مولانا خواجہ غلام دستگیر فاروقی زید مجدہ کی خدمت میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد اور ہدیہ تبریک پیش کرتا ہے۔ماشاءاللہ، ماشاءاللہ، ماشاءاللہ بہت خوب اللھم زد فزد۔امید واثق ہے کہ حضرت بابو پیر بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے سہ ماہی "اَلْمُنْتَھٰی" کی اس خصوصی اشاعت سے اہل ذوق کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور محققین تاریخ ختم نبوت کے لئے بھی یہ مشعل راہ سے کم نہیں ہے۔

فتح باب نبوت پہ حد درود
ختم دور رسالت پہ لاکھوں سلام

اللہ تعالیٰ اپنے محبوب حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کے طفیل اسے شرف قبولیت سے نوازے،شہرت عام اور بقائے دوام بخشے اور ہم سب کا خاتمہ بالخیر فرمائے۔

آمین ثم آمین یا رب العالمین بجاہ سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وازواجہ وذریتہ واولیاء امتہ وعلماء ملتہ اجمعین

دعاگو و دعاجو
گدائے کوئے مدینہ شریف
احقر سید صابر حسین شاہ بخاری قادری غفرلہ
برھان شریف ضلع اٹک پنجاب پاکستان
(9/ذوالحجہ 1443ھ/9/جولائی 2022ء، بروز ہفتہ بوقت 02:11 رات)

***

”سُنّی پیغام“ (رَدِّ قادیانیت نمبر) پر ایک نظر

زیرِ نظر اور زیرِ قلم سہ ماہی ”سُنّی پیغام“ (ملک نیپال میں سوادِ اہلِ سُنّت اعلیٰ حضرت کا بے باک ترجمان) کا ”رَدِّ قادیانیت نمبر“ جنوری تا جون 2022ء ممتاز محقق ادیب اور مفکرِ ختمِ نبوت مفتی محمد عطاء النبی حسینی مصباحی ابو العلائی کی حسین کاوشوں اور سعی کا مظہر و آئینہ دار ہے۔

سہ ماہی ”سُنّی پیغام“ کا مبارک اجراء و پہلا شمارہ اکتوبر تا دسمبر 2017ء، 58 صفحات پر مشتمل اہلِ علم و فکر بالخصوص امیرِ شریعت، فخرِ نیپال علامہ مفتی محمد اسرائیل رضوی کی بھرپور تحریک سے عمل اور منظرِ شہود پر آیا۔ کمال حُسنِ اتفاق کہ عقیدہ ختمِ نبوت و رَدِّ قادیانیت پر خاص وطنِ عزیز پاکستان میں ہمارا سہ ماہی ”اَلْمُنْتَھٰی“ کا اجراء بھی 2017ء میں ہوا۔ مندرجہ بالا دو رسائل کے باہمی اشتراک کی دوسری کڑی یہ کہ ”سُنّی پیغام“ کے مدیرِ اعلیٰ سلسلہ ابو العلائیہ سے نسبت و تعلق خاطر رکھتے ہیں اور فقیر پُر تقصیر کو بھی میدانِ تصوف میں پہلی نسبت اسی سلسلہ عالیہ سے رکھنے کا شرف ہے۔

”سُنّی پیغام“ اپنے چھ سالہ علمی و تحقیقی سفر میں ”نیپال مسلم مسائل نمبر“ ”فروغِ رضویات اور علمائے نیپال نمبر“ ”حکیمِ ملت نمبر“ ”کرونا وائرس نمبر“ ”حضور قاضی القضاۃ نمبر“ اور ”رَدِّ قادیانیت نمبر“ جیسی عظیم فتوحات سَر کر چکا ہے جو مجلہ کی پوری ٹیم و مدیرِ اعلیٰ کے خلوص محنت اور محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مزید برآں فخرِ ملت فاؤنڈیشن سے منسلک ہر فرد اس عظیم کامیابی کا حصہ ہے۔

”سُنّی پیغام“ کے مدیرِ اعلیٰ مخلص فی اللہ و قدر شناس مفتی محمد عطاء النبی حسینی زیدہ شرفہ مذکورہ تحریری خدمات کے علاوہ ختمِ نبوت و رَدِّ قادیانیت پر مختلف علمی و اچھوتی کتب ”رَدِّ قادیانیت

میں اعلیٰ حضرت کا کردار“ ”قادیانیوں کے کفریہ عقائد“ ”فتاویٰ علمائے ربانی در حیات قادیانی“ کتابیات ختم نبوت ایک اشاریہ“ تصنیف فرما کر جہاں وقیع و دقیق کام کر چکے ساتھ ہمارے قلب وروح میں بھی گھر چکے ہیں مذکورہ کتب کا مفصل تعارف فقیر کی زیر طبع کتاب ”کتابیات ختم نبوت“ جلد دوم میں شامل ہے۔

”سنّی پیغام“ (رَدِّ قادیانیت نمبر) کا مفصل تعارف فہرست میں شامل عنوانات کا جائزہ ہمارے کرم فرما مشفق ومہربان ماہر رضویات ختم نبوت کے بزرگ قلمی وفکری مجاہد سید صابر حسین شاہ بخاری زید اقبالہ پیش فرما چکے بعد ازاں انہیں چیزوں کو دہرانے کی چنداں حاجت نہیں سوائے بھرتی کے۔”رَدِّ قادیانیت نمبر منزل بہ منزل“ اداریہ میں خود مدیر اعلیٰ بھی عنوانات کا اجمالی خاکہ پیش کر چکے ہیں فہرست کے عنوان چودہ ”کتابیات ردِ قادیانیت ایک اشاریہ“ کے تحت جو فہرست دی گئی اس میں ہماری ادنیٰ کاوش ”کتابیات ختم نبوت“ جلد اول اور محقق ختم نبوت صادق علی زاہد زید علمہ کی فہرست سے استفادہ کیا گیا اور فراخدلی سے حوالہ دیا گیا اس پر مدیر اعلیٰ اور انکی ٹیم کا بے حد شکریہ۔

سہ ماہی ”سنّی پیغام“ نیپال کا ”رَدِّ قادیانیت نمبر“ اپنے موضوع پر گراں قدر اضافہ مجاہدین ختم نبوت کیلئے عظیم علمی تحفہ اور ملت اسلامیہ کیلئے فخریہ پیش کش اور بالفاظ مدیر اعلیٰ ”رَدِّ قادیانیت نمبر“ کے گلشن کی صرف ایک جھلک ہے اس گلشن کے رنگا رنگ پھولوں سے اذہان وقلوب کو سکون پہنچانے اور اس کے متنوع خوشبوؤں سے اپنے مشام جان کو معطر کرنے کیلئے اس گلشن کی سیر کیجئے۔مذکورہ نمبر اپنی نوعیت کا منفرد نمبر ہے۔پی۔ڈی۔ایف حاصل کر کے حارڈ کاپی ضرور نکلوائیے لائبریری کی زینت بنائیں اور عام کریں۔تعارف تو قبلہ شاہ جی کروا چکے یہ چیند سطور فقیر کا محبت نامہ وقدر نامہ ہے فقط امید واثق ہے ٹوٹے بکھرے الفاظ مدیر اعلیٰ کے حضور قبولیت کا شرف پائیں گیں۔

اللہ کریم ”فخر ملت فاؤنڈیشن“ کی پوری ٹیم،مدیر اعلیٰ،مدیر محترم سب کی خدمات جلیلہ میں

برکات وافرہ اور توفیقات خیر میں اضافہ فرمائے۔ اللہ کریم ان علمی بزموں کو آراستہ وآباد رکھے۔ آخر میں واٹس ایپ کے ذریعے مدیر اعلیٰ کی محبت واخلاص بھری دردمندانہ سنی جانے والی آواز کو ماہر لسانیات وعروض نامور اردو شاعر احسان دانش (1982ء، 1403ھ) کے منتخب اشعار پیش کرتے ہوئے انبساط محسوس کر رہا ہوں۔

امید فتح رکھو علم اُٹھائے چلو — عمل کے ساتھ مقدر کو آزمائے چلو
بجا بجا کہ اندھیرا ہے شاہراؤں میں — چراغِ فکر جہاں تک جلے جلائے چلو
جو برق رو ہیں اُنہیں دو اصول ہمسفری — جو تیز گام نہیں اُن کا دِل بڑھائے چلو
نہیں ہے شاخ تراشی ہی شامل دانش — رَوِش رَوِش بھی نئے پھول بھی کھلائے چلو

غلام دستگیر فاروقی
بانی ومدیر سہ ماہی "اَلْمُنْتَهٰى"
ناظم: جامعہ رحمت ٹاؤن شپ لاہور
بتاریخ 21 جولائی 2022ء بوقت صبح 22:11

***